غزلستانِ برار
مُرتّب
ضمیر ساجد
Sajid Digital,Akola-937069160

ڈاکٹر سیّد یحییٰ نشیطؔ

• مرتب •

ضمیر ساجدؔ

معاونین

فصیح اللہ نقیبؔ

شکیل اعجاز

شعرائے برار کی پچھلے سواسو سال کی غزلیات

یہ کتاب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے۔

نام کتاب	:	غزلستانِ برار (غزلیاتِ شعرائے برار)
سنِ اشاعت	:	فروری ۲۰۱۵ء
تعداد	:	پانچ سو
قیمت	:	۱۶۳/روپے
صفحات	:	۴۳۵
کتاب کی سائز	:	23x36/16
سرورق ڈیزائننگ	:	نظام الدین
کمپوزنگ	:	ضمیر ساجد
طباعت	:	ساجد اردو پریس، اکولہ
مرتب	:	ضمیر ساجد
معاونین	:	فصیح اللہ نقیب ، شکیل اعجاز

• ملنے کا پتہ •

ضمیر ساجد، الفاظ کمپیوٹر، نزد مومن پورہ مسجد، اکولہ

ZAMEER SAJID

Alfaz Computer,
Near Mominpura Masjid,
Akola-444 001(M.S.)
Mob. : 9923453010
zameersajid55@gmail.com

انتساب

اُن شعرائے کرام کے نام

جن کی شمولیت اس کتاب کی زینت ہے،

اُن شعرائے کرام کے نام

جن کی عدم شمولیت کا ہمیں افسوس ہے۔

خصوصی شکریہ........

- حفیظ مومنؔ (امراوتی)
- سبحان انجمؔ (کھام گاؤں)
- سیّد محمد طلحہ نقشبندی (بالاپور)
- سید مجیب الرحمٰن (سابق مدرس، اکولہ)
- یٰسینؔ براری (شے گاؤں)
- قاضی سیّد احفاظ الدین محی شجیعؔ (اچلپور)
- کرشنا شرما (اکولہ)
- محمد یعقوب الرحمٰن (ایوت محل)
- ریاض انورؔ (بلڈانہ)
- محترمہ دخترِ شفق اکوٹوی (چھندواڑہ)

.......کہ ان کا تعاون ہمارے دلوں پر نقش ہے۔

فہرست

● حمد ن برار اور غزل کا ادبی محاورہ — ڈاکٹر سید یحییٰ نشیطؔ

● عرضِ حال — مرتب

نمبر	نام	صفحہ
۱	عبدالکریم شائقؔ، کھامگاؤں	۲۲
۲	منشی محمد حیات خاں مظہرؔ، مرتضیٰ پور	۲۴
۳	خواجہ لطیف احمد جرحؔ، امراوتی	۲۶
۴	محمد عبدالصمد قیصرؔ، بدنیرہ	۲۸
۵	حبیب الرحمٰن صدیقی، امراوتی	۳۰
۶	شمس الدین عاجزؔ، امراوتی	۳۲
۷	پروفیسر منظور حسین شورؔ، امراوتی	۳۴
۸	سردار خاں اخترؔ، بالاپور	۳۶
۹	حکیم انوار محمد خاں کاملؔ...	۳۸
۱۰	عبدالحکیم ذاکرؔ، کھامگاؤں	۴۰
۱۱	عبدالمجید کارکرے، (کھامگاؤں)	۴۱
۱۲	مرزا احمد بیگ مصورؔ، کارنجہ	۴۲
۱۳	عبدالمجید منظرؔ، مرتضیٰ پور	۴۴
۱۴	حفیظ اللہ خاں بدرؔ، ملکاپور، کھامگاؤں	۴۶
۱۵	شیخ احمد ارمانی نقشبندی، بالاپور	۴۸
۱۶	محبوب خاں رونقؔ، اکولہ	۵۰
۱۷	عبدالرشید خاں کیفیؔ، مہکر	۵۲
۱۸	محمد اسحٰق افسرؔ، کھامگاؤں	۵۴
۱۹	بشیر احمد شہیدؔ، اکولہ	۵۶
۲۰	محمد ابراہیم خلیلؔ، ملکاپور	۵۸
۲۱	نزاکت اللہ خاں فیضیؔ، ملکاپور	۶۰
۲۲	شیخ حسن مشکلؔ افکاری، گونڈھنا پور	۶۲
۲۳	خلیل الہدیٰ خاں شارقؔ، امراوتی	۶۴
۲۴	قاضی سید خورشید الدین خورشیدؔ، اچل پور	۶۶
۲۵	محمد اسمٰعیل خاں طالبؔ، اکولہ	۶۸
۲۶	عبدالرؤف شاہدؔ انصاری	۷۰
۲۷	عبدالصمد جاویدؔ، اکولہ	۷۲
۲۸	نیاز علی نیازؔ قیصری، آکوٹ	۷۴
۲۹	غلام دستگیر شررؔ، بلڈانہ	۷۶
۳۰	غلام حسین رازؔ، بالاپور	۷۸
۳۱	محمد سعد اللہ خاں اُفقؔ براری	۸۰
۳۲	ڈاکٹر محمد منشاء الرحمٰن خاں منشاءؔ، بلڈانہ	۸۲
۳۳	عبدالکریم مجروحؔ صدیقی، امراوتی	۸۴
۳۴	قاضی سید مشتاق محی الدین نقوی، اچل پور	۸۶
۳۵	قاضی مستقیم الدین سحرؔ، دیول گھاٹ	۸۸
۳۶	احمد مرزا قادری صابرؔ براری، اچل پور	۹۰
۳۷	ایڈوکیٹ مردان علی خاں نشاطؔ، اکولہ	۹۲
۳۸	شفیع اللہ خاں جانبازؔ، چکھلی	۹۴
۳۹	شفاعت اللہ خاں سحرؔ، ملکاپور	۹۶
۴۰	عبدالغنی اعجازؔ، اکولہ	۹۸
۴۱	محمد قمر الزماں قمرؔ، انجن گاؤں سورجی	۱۰۰
۴۲	سید علی محسن شہیدیؔ، اکولہ	۱۰۲
۴۳	سید بسم اللہ ناصرؔ، اکولہ	۱۰۴
۴۴	شمس الدین اعجازؔ، بالاپور	۱۰۵
۴۵	سید شفقت علی شفقؔ سردیشکھ، اکوٹ	۱۰۶
۴۶	ڈاکٹر اختر جمیل نقشیؔ گوالیاری، اکوٹ	۱۰۸
۴۷	پروفیسر سید یونس، امراپور	۱۱۰
۴۸	خان منظور الحسن منظورؔ، اکولہ	۱۱۲
۴۹	محمد محسن ساحرؔ انصاری، اکولہ	۱۱۴
۵۰	ڈاکٹر مناف خاں مضطرؔ، بالاپور	۱۱۶

۵۱ سید انیس الدین انورؔ، اکولہ ۱۱۸
۵۲ محمد علی خاں شاداںؔ، اچل پور ۱۲۰
۵۳ سعد اللہ خاں اخترؔ، ملکاپور ۱۲۲
۵۴ عبدالستار اخترؔ انصاری، اکولہ ۱۲۴
۵۵ امین الدین امینؔ، اکولہ ۱۲۶
۵۶ عبدالعظیم خاں انجمؔ، شے گاؤں ۱۲۸
۵۷ داؤد خاں رازؔ، اکولہ ۱۳۰
۵۸ جہانگیر خاں جوہرؔ، پاتور ۱۳۲
۵۹ محمد خلیل فرحتؔ، کارنجہ ۱۳۴
۶۰ سید متین الرحمن متینؔ، اکولہ ۱۳۶
۶۱ سید غیاث الدین سلیمؔ، اچل پور ۱۳۸
۶۲ عبدالحفیظ خلش تمکینی، اچل پور ۱۴۰
۶۳ عبداللہ خاں منظرؔ، اکولہ ۱۴۲
۶۴ عبدالحمید خاں اخترؔ، اکولہ ۱۴۴
۶۵ قاضی عبدالرؤف خاں انجمؔ، باری ٹاکلی ۱۴۶
۶۶ محمد یٰسین براری، شے گاؤں ۱۴۸
۶۷ غلام مصطفےٰ بیگ صابرؔ براری، ایوت محل ۱۵۰
۶۸ ڈاکٹر محمد ذکاء الرحمن صدیقی، امراؤتی ۱۵۲
۶۹ سید مشتاق حسین جوشؔ ادیب، باری ٹاکلی ۱۵۴
۷۰ عبدالرؤف مخفی، اکولہ ۱۵۶
۷۱ محمد طالب الرحمن انعامدار طالبؔ، بیودہ ۱۵۸
۷۲ ڈاکٹر محبوب خاں راہیؔ، باری ٹاکلی ۱۶۰
۷۳ انوار احمد نشترؔ قریشی، اکولہ ۱۶۲
۷۴ ممتاز احمد ممتازؔ، اچل پور ۱۶۴
۷۵ قاضی سید سعید الدین افسرؔ، اچل پور ۱۶۶
۷۶ حسین خاں دانشؔ، اکولہ ۱۶۸
۷۷ ظہیر احمد ظہیرؔ، بالاپور ۱۷۰
۷۸ محمد اسدؔ، اکولہ ۱۷۲
۷۹ راشد اللہ خاں جوہرؔ، جھنجلی گاؤں راجہ ۱۷۴
۸۰ غلام مصطفےٰ جمیلؔ، بالاپور ۱۷۶
۸۱ افسر سلیم افسرؔ، اچل پور ۱۷۸
۸۲ مرزا رفیق شاکرؔ، کھامگاؤں ۱۸۰
۸۳ عبدالرزاق ولیؔ، کھولاپور ۱۸۲
۸۴ شیخ مستان کاشفؔ، ایوت محل ۱۸۴
۸۵ آفتاب احمد خاں نسیمؔ، اکولہ ۱۸۶
۸۶ عظیم اللہ خاں وقارؔ، آکوٹ ۱۸۸
۸۷ عبدالصمد خاں قیصرؔ، (گھاٹن جی) ایوت محل ۱۹۰
۸۸ عزیز خاں عزیزؔ، شے گاؤں ۱۹۲
۸۹ عبدالرشید رضاؔ، اکولہ ۱۹۴
۹۰ خواجہ معین الدین قلقؔ مصوری، پوسد ۱۹۶
۹۱ ضیاء اللہ شاہ زخمی، کھامگاؤں ۱۹۸
۹۲ سید سبحان انجمؔ، شے گاؤں ۲۰۰
۹۳ انور خاں انورؔ، اکولہ ۲۰۲
۹۴ خواجہ رفعت حسین تیرؔ ہاشمی، اکولہ ۲۰۴
۹۵ ڈاکٹر شیخ زینت اللہ جاویدؔ، ہترون ۲۰۶
۹۶ ڈاکٹر ایم۔ آئی۔ ساجدؔ، کھامگاؤں ۲۰۸
۹۷ ڈاکٹر سید صفدرؔ، اچل پور ۲۱۰
۹۸ عبدالصمد رضاؔ، امراؤتی ۲۱۲
۹۹ سید نیاز علی نیازؔ، بالاپور ۲۱۴
۱۰۰ رضوان اللہ ناظمؔ، اچل پور ۲۱۶
۱۰۱ محمد افسر رونقیؔ، اکولہ ۲۱۸
۱۰۲ جمیل احمد خاں جمیلؔ، اکولہ ۲۲۰
۱۰۳ عزیز الرحمن ظفر عزیزؔ، اچل پور ۲۲۲
۱۰۴ جمیل احمد رازؔ، بالاپور ۲۲۴
۱۰۵ عنایت اللہ خاں سوزؔ، ایوت محل ۲۲۶
۱۰۶ دلنواز خاں دلنوازؔ، ملکاپور ۲۲۸

نمبر	شاعر	صفحہ
۱۰۷	سرفراز خاں وقارؔ، ملکاپور	۲۳۰
۱۰۸	تمکین الرحمٰن تمکینؔ، اکولہ	۲۳۲
۱۰۹	محمد اکبر شاروؔ، ایوت محل	۲۳۴
۱۱۰	منّے خاں عازمؔ، امڑاپور (بلڈانہ)	۲۳۶
۱۱۱	سید اختر علی، اکولہ	۲۳۸
۱۱۲	فصیح اللہ خاں نقیبؔ، اکولہ	۲۴۰
۱۱۳	حفیظ اللہ خاں مومنؔ، امراوتی	۲۴۲
۱۱۴	پرکاش پروہت، اکولہ	۲۴۴
۱۱۵	شیخ گلاب زخمیؔ، اکولہ	۲۴۶
۱۱۶	نور احمد نورؔ، پاتور	۲۴۸
۱۱۷	حسین خاں جھنجھٹؔ، اکولہ	۲۵۰
۱۱۸	محمد متین احمد متینؔ، اچل پور	۲۵۲
۱۱۹	محمد اقبال حسین خاں خلشؔ، آکوٹ	۲۵۴
۱۲۰	ڈاکٹر لطیف احمد سبحانیؔ، بدنیرہ	۲۵۶
۱۲۱	وقار فاروقیؔ، اچل پور	۲۵۸
۱۲۲	منصور اعجازؔ، ایوت محل	۲۶۰
۱۲۳	جانی شیداؔ، اچل پور	۲۶۲
۱۲۴	قدرت خاں ناظمؔ، ناندورہ	۲۶۴
۱۲۵	محمد عبدالکبیر حقیؔ، اچل پور	۲۶۶
۱۲۶	عبدالقدیر ایازؔ، اکولہ	۲۶۸
۱۲۷	کیلاش سینگرؔ، اکولہ	۲۷۰
۱۲۸	لطیف احمد ثاقبؔ، شے گاؤں	۲۷۲
۱۲۹	محمد سلیم نشترؔ، کھامگاؤں	۲۷۴
۱۳۰	غلام ربانی نعیمؔ، بالاپور	۲۷۶
۱۳۱	محمد سکندر عرفانؔ، اچل پور	۲۷۸
۱۳۲	سید الیاس فاتیؔ، اکولہ	۲۸۰
۱۳۳	شریف احمد ساجدؔ، شے گاؤں	۲۸۲
۱۳۴	منظور حسین ندیمؔ، بالاپور	۲۸۴
۱۳۵	وشا ساغرؔ، کھامگاؤں	۲۸۶
۱۳۶	عبدالستار دانشؔ، اچل پور	۲۸۸
۱۳۷	عارج میرؔ، ورود	۲۹۰
۱۳۸	ارشاد احمد ارشدؔ، بدنیرہ	۲۹۲
۱۳۹	محمد صابر دانشؔ، باسم	۲۹۴
۱۴۰	عبدالرحمٰن خاں گلشنؔ بیابانی، اچل پور	۲۹۶
۱۴۱	عبدالرؤف انجمؔ، اکولہ	۲۹۸
۱۴۲	محمد تنویر ساجدؔ، باسم	۳۰۰
۱۴۳	ضمیر الدین ساجدؔ، اکولہ	۳۰۲
۱۴۴	رفیق خاں سراجیؔ، آکوٹ	۳۰۴
۱۴۵	ڈاکٹر محمد کلیم ضیاءؔ، ملکاپور	۳۰۶
۱۴۶	ڈاکٹر خواجہ غلام السیدین ربانیؔ، اکولہ	۳۰۸
۱۴۷	محمد رفیق عثمانیؔ، اکولہ	۳۱۰
۱۴۸	مہیش شکلاؔ، اکولہ	۳۱۲
۱۴۹	محمد خاں ساجدؔ، اکولہ	۳۱۴
۱۵۰	ڈاکٹر ندیم الرحمٰن خاں ندیمؔ، بلڈانہ	۳۱۶
۱۵۱	سید احمد امامؔ، بالاپور	۳۱۸
۱۵۲	سرفراز خاں ندیمؔ، ایوت محل	۳۲۰
۱۵۳	محمد مستقیم ارشدؔ، گوندھنا پور (بلڈانہ)	۳۲۲
۱۵۴	ڈاکٹر امین الرحمٰن امینؔ، انجادار پورہ	۳۲۴
۱۵۵	قاضی ریاض الدین انورؔ، بلڈانہ	۳۲۶
۱۵۶	مجیب الرحمٰن پروازؔ انجادار، بیودہ	۳۲۸
۱۵۷	کرشن کمار شرماؔ، اکولہ	۳۳۰
۱۵۸	عبداللہ بہارؔ، اکولہ	۳۳۲
۱۵۹	ڈاکٹر عمران علی خاں عمرانؔ، اکولہ	۳۳۴
۱۶۰	احتشام حسین شمسؔ، اکولہ	۳۳۶
۱۶۱	حسین احمد واصفؔ، آکوٹ	۳۳۸
۱۶۲	سید معین الدین مخفیؔ، اچل پور	۳۴۰

۱۶۳ صابر کمال، اکولہ ۳۴۲
۱۶۴ قاضی سید احفاظ محی شجیع، اچل پور ۳۴۴
۱۶۵ محب الرحمٰن وفا، بیودہ ۳۴۶
۱۶۶ احمد نثار، بلڈانہ ۳۴۸
۱۶۷ عظیم نواز خاں راہی، بلڈانہ ۳۵۰
۱۶۸ سید قاسم عمران، بالاپور ۳۵۲
۱۶۹ محمد نسیم نواز، انجن گاؤں سورجی ۳۵۴
۱۷۰ عارف زمان، بالاپور ۳۵۶
۱۷۱ محمد رفیق ندوی شاد، اکولہ ۳۵۸
۱۷۲ عبدالرشید قمر، بیودہ ۳۶۰
۱۷۳ ضمیر احمد خاں ضمیر، رہٹھ پور (امراؤتی) ۳۶۲
۱۷۴ محمد اقبال سیفی، اکولہ ۳۶۴
۱۷۵ عبدالکریم درویش، باسم ۳۶۶
۱۷۶ محمد حسین اسرار، دریاپور ۳۶۸
۱۷۷ ابرار احمد کاشف، بالاپور ۳۷۰
۱۷۸ ضمیر احمد ضمیر، اکولہ ۳۷۲
۱۷۹ ساجد اختر انصاری محشر، اکولہ ۳۷۴
۱۸۰ محمد فاروق زمن، باسم ۳۷۶
۱۸۱ ڈاکٹر گنیش گائیکواڑ (آغاز) بلڈانہ ۳۷۸
۱۸۲ حسنین عاقب، اکولہ ۳۸۰
۱۸۳ صابر شاہ صابر، ساکرکھیرڈا (بلڈانہ) ۳۸۲
۱۸۴ سید طاہر حسین طاہر، کھامگاؤں ۳۸۴
۱۸۵ شمیم فرحت، کارنجہ ۳۸۶
۱۸۶ محمد اعجاز پروانہ، ناندورہ ۳۸۸
۱۸۷ محمد واثق ندیم، آکوٹ ۳۹۰
۱۸۸ عمران ثنائی، چکھلی (بلڈانہ) ۳۹۲
۱۸۹ ڈاکٹر محمد یحییٰ جمیل، امراؤتی ۳۹۴
۱۹۰ شیخ سلیم سحر، اکولہ ۳۹۶
۱۹۱ اکرام اللہ خاں اظہر، جھرکھیڑ ۳۹۸
۱۹۲ جلیل ارشد خاں راشد، کھام گاؤں ۴۰۰
۱۹۳ سید کلیم رہبر، امڑاپور ۴۰۲
۱۹۴ ڈاکٹر شعیب احمد خاں شعیب، بالاپور ۴۰۴
۱۵ خواجہ سعید الدین نواب، اکولہ ۴۰۶
۱۹۶ محمد عرفان الرحمٰن انجم، اکولہ ۴۰۸
۱۹۷ جمیل ارشد خاں ارشد، کھام گاؤں ۴۱۰
۱۹۸ تنویر غازی، امراؤتی ۴۱۲
۱۹۹ شہزاد انور، اکولہ ۴۱۴
۲۰۰ مجیب خاں تابش، کھامگاؤں ۴۱۶
۲۰۱ ڈاکٹر خالد احمد خاں نیر، امراؤتی ۴۱۸
۲۰۲ محمد نعیم فراز، اکولہ ۴۲۰
۲۰۳ نعیم خاں واقف، اچل پور ۴۲۲
۲۰۴ میر سید مظفر علی ظفر، اکوٹ ۴۲۴
۲۰۵ شیخ الطاف تنویر، مالے گاؤں ۴۲۶
۲۰۶ حافظ محمد جاوید اشاعتی، امراؤتی ۴۲۸
۲۰۷ وسیم فرحت، کارنجہ ۴۳۰
۲۰۸ انس نبیل، کھام گاؤں ۴۳۲
۲۰۹ محمد نوید اطہر، کھام گاؤں ۴۳۴

تمدنِ برار اور غزل کا ادبی محاورہ

وسط ہند میں آباد خطۂ برار کی تمدنی تاریخ کے آثار لگ بھگ ایک ہزار قبل مسیح تک پھیلے ہوئے ہیں۔ معلوم تاریخ کے مطابق حکومتِ کندن پور کے زمانے میں برار کی تہذیب و معاشرت کو بڑا فروغ حاصل ہوا تھا اور تجارت و صنعت کے ساتھ فن و ادب کی بھی خوب ترقی ہو رہی تھی۔ یہاں اسلامی معاشرت نے عہدِ سلاطین میں قدم جما لیے تھے۔ سیاسی اعتبار سے بھارت کے شمال و جنوب کو انتظامیہ کی بنیاد پر جوڑنے میں برار کی اہمیت قدیم زمانے سے مسلّم رہی۔ لال قلعے سے گولکنڈہ تک کی فوجی شاہراہیں برار ہی سے ہو کر گزرتی تھیں اور شمال و جنوب کے سیاسی مراکز کے درمیان برار بَین وسط میں واقع ہونے کی وجہ سے فوجی چھاونیوں کے لیے نہایت مناسب علاقہ قرار دیا گیا تھا۔ اس لیے گاول گڑھ، ماہور، چندر پور اور دولت آباد کے سرحدی قلعوں کے درمیان برار میں، نرنالہ، ایلچ پور، بالاپور اور دیول گھاٹ میں فوجیوں کے لیے قلعہ نما چھوٹی چھوٹی چھاونیاں بنائی گئی تھیں۔ انتظامیہ کی عدم توجہی کی وجہ سے اب ان کے کھنڈرات ہی دکھائی دیتے ہیں یا انھیں سرکاری دفاتر میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔

برار مسلم سلاطین ہی کے زمانے میں علمی و ادبی مرکز بن گیا تھا، چنانچہ ایران و افغانستان اور مصر و عرب سے آئے ہوئے علماء کرام اور صوفیاء عظام نے اس علاقہ میں دینی علوم کی شمعیں روشن کیں اور عوام الناس کے نفوسِ باطنہ کی اصلاح کرتے رہے۔ ازمنۂ وسطیٰ میں چونکہ ایران۔ عراق اور مصر و عرب میں شعر و شاعری کا چرچا عام تھا بلکہ دنیا کے دیگر علاقوں کے مقابلے میں ترقی کی اعلیٰ سطح پر پہنچ گیا تھا۔ اس لیے علاقۂ برار میں وارد ہوئے ان ملکوں کے مہاجرین اپنے ساتھ وہاں کی ادبی تہذیب اور معاشرتی تمدن لے آئے۔ اسی کے اثرات یہاں کے ادبی کلچر پر مرتب ہوئے۔ ادبی نقوش کا یہ عملِ ارتسام تا دیر جاری رہا اور رفتہ رفتہ ظاہر ہوتا گیا۔ چنانچہ اس کے اوّلین نقوش برار میں وارد ہوئے دہدار فانی کے یہاں دکھائی دیتے ہیں۔ ان کا انتقال سورت میں ۱۶۰۷ء میں ہوا۔ برار کی غزل کے

اوّلین نمونے بھی قاؔنی ہی کے کلام میں دکھائی دیتے ہیں۔ قصیدے کی تشبیب اور غزل کا رنگ اگرچہ وہاں سے آیا تھا مگر اس میں یہاں کے مذہبی رومان اور سنتوں کے روحانی اثرات کے غازے نے کچھ ایسا جادو کیا کہ غزل کا رنگ چوکھا ہوگیا۔ وہدار قاؔنی کی غزل میں آپ کو یہ دونوں رنگ دکھائی دیں گے۔

دل میں مرے سو میں مرادلدار   جیو میں مرے سو مینچ پیا میرا

دوئی کا تخم ہرگز بو نکو توں   ارے اس یک پنے کے باغ میں آ

جس کا گزک جگر ہے تس کوں شراپ کیا ہے   جے مست ہیں دَرَس کے ان کو شراب کیا ہے

براری غزل کے یہ اوّلین نقوش ہیں۔ قاؔنی کے بعد آقا محمد امین وفاؔ کی غزلوں میں بھی یہی رنگ ملتا ہے۔

عُجب میں تجھ طرف اے دلربا عاشق کے پھیرے ہیں
دل و جاں، چشم و گوش و ہوش سب نت محو تیرے ہیں

خال وخط نے پیو کی مجھ دل سیں نکالا ہے دھواں   تخمِ ریحاں کا کرو شربت دوا کے واسطے
کے علاوہ یہ درج ذیل اشعار۔

التجائے ساغرِ سرشارِ ساقی میں رساؔ   ہر نگاہِ مست اس کی مدبھرا اک جام ہے (رساؔ)

گرچہ ہے بازار کثرت کا بھرا چاروں طرف
پھر ترے دیدار بن اور کام مجھ کو کیا رہا
(باقرؔ)

تجھ غم کی آگ دل میں رکھا ہوں چھپا کے مَیں
ڈرتا ہوں تا فلک نہ اُڑے یہ شرر کہیں
(عاصیؔ)

سے پتہ چلتا ہے کہ شعرائے متقدمینِ برار نے غزل میں تصوف اور بھگتی کی آمیزش کچھ اس ڈھنگ سے کی ہے کہ دونوں یکجان دو دو قالب نہیں بلکہ یکجان و یک قالب دکھائی دینے لگتے ہیں۔ بعض جگہ تو بھگتی کا رنگ غالب نظر آتا ہے۔ برار کے قدیم شعراء کا یہ وصفِ خاص برار و دکن میں مقبول رہا۔ ان کے

معاصرین شمال کے شعراء میں یہ انداز ولیؔ کے بعد آیا۔
برار کی غزلیہ شاعری کا اصل لب ولہجہ تو متصوفانہ رہا جس پر بھگتی تحریک کے اثرات بھی مرتب ہوئے۔ ولیؔ کے بعد بھی یہاں کی غزلوں نے شمال کی بہ نسبت دکنی صوفیائے کرام کے اثرات ہی کو قبول کیا چنانچہ دورِ سراج میں جب سراجؔ کا طوطی بول رہا تھا برار کے شعراء بھی اس کے ہم نوا ہو گئے تھے۔ سراجؔ کی زمین میں غلام حسین ایلچپوری کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

عشق میں جو دیا، دیا سو دیا — مر کے میں پھر جیا، جیا سو جیا
تھا پیاسا، پیا کے وصل کا میں — پھر پیالہ پیا، پیا سو پیا

سراجؔ کے رنگ میں شعر کہنے والے اور بھی بعض شعراء مل جائیں گے، جن کے دکنی لب ولہجے میں نورِ سراجؔ نمایاں ہے۔
شمال میں حاتمؔ، یکرنگؔ اور آبروؔ کے دور میں ایہام گوئی غزل کا امتیاز مانی جاتی تھی، لیکن زبان پر پوری قدرت کے بغیر یہ ممکن نہیں تھی۔ ایک لفظ سے دو بلکہ ان سے زیادہ معنی پیدا کرنا اس فن کا خاصہ تھا۔ برار کے شعراء نے 'ایہام گوئی' کے لیے شمال کے اساتذہ کی پیروی کی۔ گویا دبستانِ دہلی ولکھنؤ سے استفادے کا یہ پہلا موقع تھا۔ عبدالوہاب جانیؔ کا یہ ایک شعر بطور مثال پیش ہے۔

کوئل مچا رہی ہے یہی شور جانیا
کس کو نہیں تھا آنبہٗ نازک بدن لذیذ

خط کشیدہ لفظ آنبہ (آم) دو معنوں میں یہاں مستعمل ہے۔
مرزا مظہر جانِ جاناں نے جب اصلاحِ زبان کے ساتھ اصلاحِ سخن پر بھی توجہ دی تو اس تحریک کے اثرات بھی برار کی غزلیہ شاعری نے قبول کیے اور 'ایہام گوئی' کو ترک کر کے حقیقت پسندی کے رُجحان کو فوقیت دی جانے لگی تو اس اصلاحِ زبان کی تحریک کا اثر اس زمانے کے شعراء نے قبول کیا چنانچہ محسوس وغیر محسوس طریقے سے برار کی غزلیہ شاعری، مثنوی نگاری، قصائد وغیرہ پر تحریک کے اثرات مرتب ہونے لگے۔ باقر شاہ باقرؔ حسین، رنگینؔ نورالدین حسین خاں، خواجم قلی خاں موزوںؔ، خواجہ لقوبؔ مبارک خاں مبارکؔ، میر عبدالحئی خاں صارمؔ، سیّد موسیٰ مہدوی موسویؔ اور نواب محمد نامدار خاں بنی جرنیلؔ کے علاوہ اور بھی دیگر شعراء کا غزلیہ کلام اصلاحِ زبان کی تحریک کے اثر سے مجلّٰی دکھائی دیتا ہے۔
محمد نامدار خاں بنی جرنیلؔ کے دور تک پہنچتے پہنچتے برار کے اردو ادب پر انگریزی حکومت کے اثرات

مرتب ہونا شروع ہو گئے تھے، نامدار خاں پئی کے تخلص 'جرنیل' سے اس امر کی تصدیق ہو جاتی ہے۔
البتہ خانقاہی فضا اس سمِ تاکی سے محفوظ تھی۔ کم و بیش اسی زمانے میں فورٹ ولیم کالج نے اردو زبان و ادب میں انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کی تو سرسید کی تحریک بھی زور پکڑنے لگی۔ غلامی کے احساس نے ہر کس و ناکس کو بے چین کر دیا تھا۔ یہ بے چینی غدر کی صورت میں رونما ہوئی۔ انگریزوں نے اس یورش کو دبا تو دیا مگر خوف و خطرے کا دھڑکا انھیں لگا رہتا تھا۔ عوام کی بھلائی کے کاموں پر اب وہ اور زیادہ توجہ دینے لگے۔ نجی اصلاحی اور فلاحی اداروں کو مراعات دی جانے لگیں تو قوم کی تعلیمی پس ماندگی کے انسداد کے دَرْوا ہونے لگے۔ سرسید نے امت کی تعلیمی پس ماندگی کو دور کرنے کے لیے علیگڈھ کالج قائم کیا۔ اس تحریک میں ملک بھر کے نامور لوگ شامل رہے۔ برار بھی اس معاملے میں پیچھے نہیں رہا۔ یہاں کے ذی حیثیت لوگ خود یا اپنے اخلاف و اسباط کو علیگڈھ تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجنے لگے، جس کی وجہ سے یہاں کی ایک بڑی 'کھیپ' (نسل) تعلیم سے متمتع ہوئی۔ برار کے بعض غزل گو شعراء بھی وہاں کے فارغین میں رہے ہیں۔ چنانچہ منظور حسین شورؔ وغیرہ کی شاعری میں علی گڑھ تحریک کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔

انگریز افسرِ تعلیم کی ایماء پر محمد حسین آزادؔ اور حالیؔ نے لاہور میں ایک انجمن کی بنا ڈالی اور غزل کی اصلاح کے ساتھ نظم نگاری کو رواج دیا۔ خلافت تحریک کے زور پکڑنے کی وجہ سے ایک طرف علیگڈھ مسلم یونیورسٹی کو انگریز نواز سمجھا جانے لگا تو دوسری طرف خلافت تحریک نے دہلی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام کو بھی ہوا دی۔ برار میں عبدالرؤف شاہ پانڈھرکوڑوی جامعہ کی تحریک میں پیش پیش رہے۔ جامعہ جب علیگڈھ سے دہلی میں منتقل ہوا تو انھوں نے علی برادران کی سرپرستی و صدارت میں ہوئے جلسے میں 'جامعہ سے خطاب' کے عنوان سے ایک مسدس پڑھی تھی۔ وہ عاصیؔ تخلص کرتے تھے ان کی اور ان کے معاصرین کی غزلوں میں علی گڑھی اور جامعہ ملّیاتی فکر نمایاں ہے۔ اب چونکہ اردو نکھر سنور گئی تھی اور شمالی تحریکات سے اس میں نمایاں تبدیلیاں آگئی تھیں اس لیے برار کی شاعری میں بھی ان تبدیلیوں کو بآسانی محسوس کیا جاسکتا ہے۔

نہ اپنی سرگذشت لکھی نہ اپنی شاعری لکھی　　وہی پڑھتا رہا لکھا جو تھا اپنے مقدر میں
(اسیرؔ ملکاپوری)

جینے کی ادا بھول چلا ہے کیفیؔ　　مرنے کے اسے طور سکھا دے کوئی
(کیفیؔ مہکروی)

عشق سے حاصل ہوا یہ فائدہ مرنے جینے کا سلیقہ آگیا
(ناطق نیروی)

جنونِ عشق مجھے اس مقام پر لے چل ترس رہی ہے جہاں موت زندگی کے لئے
(اخترؔ بالاپوری)

دلِ معصوم نے ہر چیز کو عریاں سمجھا پھول کو پھول گلستاں کو گلستاں سمجھا
(قیصرؔ امراوتی)

حقیقت پسندی، ایہام پسندی کی عین ضد ہے۔ان اشعار میں زندگی کے تلخ حقائق کو غزل کے اشعار میں پیش کیا گیا ہے۔ان شعراء کے یہاں حقیقت کو برملا پیش کرنے کی شدت اس قدر ہے کہ اصلیت برہنہ ہو کر سامنے آجاتی ہے۔اس بیانیہ میں نہ تشبیہ ہے نہ استعارہ، علامت ہے نہ ایہام وابہام۔حالی غزل کو جس انداز میں دیکھنا چاہتے تھے، اس خواب کو شعراء برار نے شرمندۂ تعبیر کر دیا۔

حقیقت پسندی کی اس تحریک نے جہاں رومانیت کے خوابوں کو چکنا چور کر دیا وہاں اس نے بڑھ کر ترقی پسندی کا ہاتھ بھی تھام لیا۔ ۱۹۳۶ء میں جب ہندوستان میں ترقی پسندی کا پہلا اجلاس ہوا اور اس میں پریم چند جیسے Idealistic Realism کے علمبردار بلکہ خالق کی صدارت میں ترقی پسندی کے فروغ پر راہ عمل طے ہوا تو اس کے بعد بمبئی، بھیونڈی، سورت، کانپور وغیرہ شہروں میں اس تحریک نے اپنے اثرات ڈالنے شروع کئے۔نتیجہ یہ ہوا کہ فلمی صنعت اور کارخانوں میں کام کرنے والے لوگ (شعراء وادباء) اس تحریک سے جڑے، سرمایہ داری کے خلاف آواز اٹھی، مزدوروں کے مسائل پر لکھا جانے لگا۔گویا غمِ جاناں کو بھلا کر روزی روٹی کی فکر میں غمِ دوراں کی باتیں ہونے لگیں۔برار میں شورؔ اور ان کے معاصرین نے جاگیردارانہ نظام پر اپنی نظموں اور غزلوں میں چوٹیں کیں۔غزل کا نازک بدن گو اس قابل نہ تھا مگر اس میں بھی قوت عود کر آئی اور غزلوں میں بھی سرمایہ داری کے خلاف اشعار اپنا سُرخ چہرہ دکھلانے لگے۔

حسرتیں بھی اک تہمت، آرزو بھی اک الزام گفتگو مری رسوا، خامشی مری بدنام
(شورؔ)

ہجومِ غم ہے پھر بھی شوق سامانی نہیں جاتی فغاں سنجی نہیں آتی، غزل خوانی نہیں جاتی
(شارقؔ نیازی)

کتابِ زندگی پر لکھ دیا انسانیت کس نے
پڑھی تو جاتی ہے لیکن کہیں دیکھی نہیں جاتی
(فیضی ملکاپوری)

تخت بدلیں گے تاج بدلیں گے
راج والوں کے راج بدلیں گے
دیکھ کر انقلاب دنیا کے
سارے رسم و رواج بدلیں گے
(شرر بلڈانوی)

سُرخ پرچم کے سرنگوں ہونے سے پہلے ہی ادب نے کروٹ لی اور جدیدیت نے آنکھیں کھولیں۔ شروع میں ''شب خون'' مار مار کر جدیدیت کو جگایا گیا، جب ہوش آگیا تو پھر اس کے لکھنے والے دوڑ دھوپ کرنے لگے۔ شروع میں تو ترقی پسندوں ہی کی صف تھی پھر دیگر کہنہ و نو سیکھیوں نے اپنے ڈیرے جمائے۔ برار میں شب خون مارنے والے مطلق نہ تھے اس لیے انھوں نے 'خبر نامہ' پڑھ کر بھی جدیدیت کا رنگ اختیار نہ کیا اور نہ ہی فی زمانہ جاری مابعد جدیدیت کے غیر مرئی اثر کو قبول کیا۔ یہی وجہ ہے کہ برار کی غزل میں ان دونوں جنوں کی روح نہیں سما سکی۔ البتہ ڈاکٹر سیّد صفدر، حفیظ مومن، ڈاکٹر زینت اللہ جاوید، فصیح اللہ نقیب، ضمیر ساجد آکولوی، عارج میر، اقبال خلش، منظور ندیم بالاپوری، ڈاکٹر محمد یحییٰ جمیل اور اسی قبیل کے دو ایک اور نام ہیں جن کی غزلیہ شاعری میں جدیدیت کا شمسی نور ضرور دکھائی دیتا ہے مگر آنکھیں چوندھیا نہیں جاتیں۔ ڈاکٹر محبوب راہی کی زود گوئی کی وجہ سے ان کی کیا غزلیہ شاعری اور کیا منظومات اور کیا بچوں کی نظمیں سب میں تمام 'ازم' اس طرح گڈمڈ ہو گئے ہیں کہ ان کی اپنی علاحدہ شناخت 'زود گوئی' ہو کر رہ گئی جو کسی اِزم سے تعلق نہیں رکھتی، البتہ شاعری بالخصوص غزلیہ شاعری میں انھوں نے روایتوں کو سنبھالنے کے جتن ضرور کیے ہیں۔ برار کے متوفی اور مقیدِ حیات معمر شعراء بھی غزلوں میں فاروقی کے روادار نہیں حالی کے پیروکار ہیں۔ ان میں سب سے اہم نام مرحوم غنی اعجاز کا ہے جو روایتوں سے جڑے بھی رہے اور خیالات کی تجدید بھی کرتے رہے۔

غزل کی یہ تاریخ ایک سرسری خاکہ ہے جس میں احوالِ برار کے حوالے سے غزل پر بات کہی گئی ہے۔ اس کتاب کے باقی ماندہ غزل گو شعراء کی غزلوں کو پڑھ کر آپ خود ایک مثبت نتیجہ نکال سکتے ہیں۔ اب میں شعرائے برار کی غزلوں اور ان کے قارئین کے درمیان حائل ہونا نہیں چاہتا۔

وما علینا الا البلاغ

مورخہ یکم جنوری ۲۰۱۵ء

ڈاکٹر سیّد یحییٰ نشیط

عرضِ حال

بچپن سے سُنتے آئے ہیں کی ماضی میں چھاپے کی سہولیات نہ ہونے کے سبب علاقۂ برار میں شعر و ادب کے نمونے پکّی سیاہی میں خال خال ہی ملتے ہیں۔ ہر چند کہ یہاں ادب کے آثار تقریباً (پچھلی) پانچ صدیوں کو محیط ہیں۔ انفرادی طور پر چند لوگ تحقیق میں لگے ہیں۔ کچھ کتابیں بھی نظر آنے لگی ہیں۔ شعری مجموعوں کی تعداد زیادہ ہے نثری کم کم۔ صلاحیتوں کی کمی نہیں۔ وسائل بھی اب ماشااللہ بہتر ہو گئے۔ تاہم ایک طرح کا تساہل، ایک طرح کا آلکس کام کے لئے رفتار شکن ہے۔ پھر فی زمانہ پیڑ لگا کر پھل کو آئندہ آنے والوں کے لئے چھوڑنے کے مزاج کا فقدان! بزرگوں کی باقیات کو یکجا کر کے ہمیں کیا ملے گا؟ یا ہمیں اپنی تخلیقات کو مفت تقسیم کروانے سے کیا حاصل؟ کتنے فی صد لوگ ہیں جو ادبی کتب کی اہمیت کو سمجھتے ہیں۔

بہر حال اس منفی صورتِ حال کے باوجود کبھی کبھی دیوانگی جو کھم اُٹھانے کو تیار ہو ہی جاتی ہے۔ بیٹھے بٹھائے کیا جی میں آئی کہ ہم لوگ یہ فیصلہ کر اُٹھے کہ 'برار کی غزل' کو یکجا کریں۔ اردو اخباروں میں اپیل شائع کی گئی، مراٹھی اخباروں کا سہارا لیا گیا۔ شعراء سے درخواست کی گئی کہ اپنی اپنی چار چار غزلیں، مع تصویر و کوائف روانہ کریں۔ مرحومین کے سلسلے میں ورثاء سے درخواست کی گئی۔ جن کے پتے ملتے گئے انھیں خطوط لکھ کر، جو ملتے گئے ان سے بالمشافہ، کسی سے فون پر، گفتگو کر کے، کسی کے در دولت پر حاضری دے کر کلام یکجا کرنا شروع کیا۔ ۲۰۱۲ء سے ۲۰۱۵ء کو پہنچ گئے۔ بہر حال الحمدللہ کم و بیش دو سو شعراء کا کلام یکجا کر پائے۔

۲۰۱۵ء سے پیچھے چلیے تو اوّلین شاعر کی پیدائش ۱۸۷۰ء کی ہے، جو اس مجموعہ میں شامل ہے۔ گویا یہ مجموعہ تقریباً سوا سو سال کو محیط ہے۔ (دیباچہ میں ڈاکٹر سیّد یحییٰ نشیط نے ساڑھے چار صدی کا ادبی منظر نامہ پیش کیا ہے گویا ہم پچھلی سوا تین صدیوں کو پہنچ نہیں پائے) ترتیب کے سلسلے میں کئی آراء

تھیں جن میں سے اس رائے کو پسند کیا گیا کہ پیدائش تاریخ کو ملحوظِ خاطر رکھ کر ترتیب دی جائے تا کہ سوا سو برس میں غزل کے مزاج نیز لفظیات میں تدریجی فرق کا مشاہدہ و موازنہ کیا جاسکے اور تقدیم و تاخیر کا قضیہ بھی نہ رہے۔ بہت کوشش کے باوجود چند شعراء کی پیدائش تاریخ مل نہ سکی۔ ان کے سلسلے میں ان کے ہم چشموں پر قیاس کیا گیا۔ چار غزلوں کی شرط کا مقصد تھا کہ ہر شاعر کا مزاج شعر سمجھ میں آسکے۔ زیادہ غزلیں لیتے تو ضخامت کو جھیل نہ پاتے، کم کرتے تو شاعر کا شعری رجحان سمجھنا کارے دارد۔ کوائف کی مختصر ترین صورت رکھی گئی۔ تصویریں جن کی مل سکیں، شامل کی گئیں۔

ہم شکر گزار ہیں ان احباب کے جنھوں نے ہمیں برار کی غزل یکجا کرنے میں تعاون دیا اور اعتراف کرتے ہیں اپنی کوتاہ دستی کا کہ ہم بیش از بیش شعراء کو نہ تو یکجا کر سکے اور نہ تو برار کی غزل کے منظر کو مکمل کر سکے (امید ہے کہ باقیماندہ کام کے لئے بھی کوئی نہ کوئی اللہ کا بندہ کھڑا ہوگا) کچھ لوگوں نے تو بار بار یاددہانی کے باوجود اس کام کو قابلِ اعتناء ہی نہ سمجھا تاہم ان کی عدم شمولیت پر ہم دل گرفتہ ہیں۔ کچھ احباب کا مسئلہ یہ کہ کبرسنی کے باعث ایفائے عہد میں دشواری رہی علی الخصوص مرحومین کے ورثاء سے کلام کا حاصل کرنا، لانا ہے جوئے شیر کا۔ کچھ احباب نے سرِ راہے گاہے گاہے کہا بھی کہ مرحومین کے کلام کو شامل کرنے پر اس قدر زور کیوں دیا جا رہا ہے۔ حاضر سو وزیر۔ اب انھیں کون سمجھائے کہ جن کے نقوشِ پا ہمارے لئے مشعلِ راہ ہیں۔ جنھوں نے ہمارے لئے ادبی راہ ہموار کی اور رہنمائی بھی کی ان کے بغیر ہم کیا ہماری بساط کیا۔

ڈاکٹر سید یحییٰ نشیطؔ کا شکریہ کن لفظوں میں ادا کیا جائے کہ ان کی تحریر ہماری کاوش کے لئے وقار و اعتبار کی علامت ہے۔ برار کے اتنے شعرائے کرام کے کلام کو بیک نظر دیکھنے کے بعد یک گونہ طمانیت کا احساس ہوتا ہے کہ الحمدللہ ہمارا علاقہ ہر لحہ بہر طور غزل گوئی میں اردو دنیا کے شانہ بہ شانہ، قدم بہ قدم رہا ہے۔ یہ غزلیں ''برار کی غزل'' کا ایسا منظر نامہ پیش کرتی ہیں جس پر ہر صاحب نظر اور ہر صاحب دل کی طرف سے پذیرائی ملے گی، داد کی مستحق قرار پائیں گی۔

کتاب کی ترتیب و تدوین کے سلسلہ میں حتی الوسع احتیاط برتنے کی کوشش کی گئی ہے تاہم بقول راشد اللہ جوہرؔ مرحوم ؎

''عیبوں سے پاک صرف خدا کا کلام ہے''

لہٰذا ہم اپنی اس کاوش کے سلسلہ میں کسی خوش فہمی میں بھی مبتلا نہیں ہیں اور نہ ہی کسی احساسِ کمتری کے

شکار۔ صاحبانِ ذوق کی تسکین کا سامان فراہم کرنے اور اربابِ نقد و نظر کا اعتبار پانے میں یہ کتاب کتنی کامیاب ہو پاتی ہے اس کا علم تو صرف قادرِ مطلق کو ہے۔ ہم نے تو اخلاص کے ساتھ ایک کام کا بیڑہ اُٹھایا اور اللہ تعالیٰ نے محض اپنے کرم سے ہمارا بیڑہ پار لگا دیا۔

خصوصی طور پر شکریہ کے مستحق ہیں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اربابِ حل و عقد (اور اس سلسلہ میں تعاون کرنے والے حضرات، جزاکم اللہ خیر) کہ کونسل کی مالی اعانت کے بغیر یہ کام آسان نہ تھا۔

اعتذار: (بہت کوشش کے باوجود چند شعراء کی چار چار غزلیں دستیاب نہ ہو سکیں۔ لیکن اُن اہم ناموں کو چھوڑا نہیں جا سکتا تھا لہٰذا جتنی غزلیں مل سکیں انھیں کو غنیمت سمجھ کر شاملِ کتاب کیا گیا۔)

ضمیر ساجدؔ

معاونین : فصیح اللہ نقیبؔ ، شکیل اعجاز

تصاویرِ شعرائے برار

تصاویر شعرائے برار

تصاویر شعرائے برار

تصاویر شعرائے برار

غزلیات شعرائے برار

عبدالکریم شائق

عبدالکریم شائق، کھامگاؤں ضلع بلڈانہ　　تاریخ پیدائش ۱۸۷۰ء

جس گلستاں میں بسوں میں وہی ویرانہ بنے　　برق ٹوٹے وہیں جس جا مرا کاشانہ بنے

تجھ سے کام اتنا تو اے ہمتِ مردانہ بنے　　برق ٹوٹی ہے جہاں، پھر وہیں کاشانہ بنے

ہم تو مٹ کر بھی نہ خشتِ خُمِ مے خانہ بنے　　ہم سے خاک اچھی ہے جس خاک سے پیمانہ بنے

آشنا ہو وہ ترا سب سے جو بیگانہ بنے　　ہوش اسی کے ہیں بجا جو ترا دیوانہ بنے

تیرے ہاتھوں سے اگر شمعِ لحد ہو روشن　　اُڑ کے ہر ذرہ مری قبر کا پروانہ بنے

شعلۂ حسن کی یوں سیر کہاں سب کو نصیب　　قسمت اس خاک کی جس خاک سے پروانہ بنے

دل شکستوں کو بھی ہے، محفلِ ساقی میں جگہ　　ٹوٹ بھی جائے اگر شیشہ تو پیمانہ بنے

اے تصور ہے نہاں شانِ سلیماں تجھ میں　　تو اگر چاہے تو گھر میرا پری خانہ بنے

شائق اس بزم میں ہم صورتِ تصویر ہیں چپ　　کیا کریں بات جہاں بات کا افسانہ بنے

دل وہیں کھو کے کوئی یاس کی دنیا نہ بنے　　نہ بنے، بت یہ خدا بھی ہوں تو بندا نہ بنے

درد ہو اس دلِ سنگیں میں تو ہیرا نہ بنے　　پارس آہن کو جو چھو جائے تو سونا نہ بنے

رہ گیا کھنچ کے ترا ایک ہی نقشہ ظالم　　قدرت اب چاہے بنانا بھی تو تجھ سا نہ بنے

خود ہی پیغام ہم اپنا انھیں پہنچائیں گے　　کام مشکل ہے یہ قاصد سے بنے یا نہ بنے

جان دینا ہے محبت میں، وہ دیتا ہوں　　قبر میری ترے کوچے میں بنے یا نہ بنے

خاک کر دے نہ کہیں برقِ جمال اے شائق　　میری ہستی سے کہو بیچ میں پردا نہ بنے

گھر سے نکلے ہیں کسی ظالم کے خواہاں ہو کے ہم
پھر رہے ہیں آپ اپنے دشمنِ جاں ہو کے ہم
دیکھ کر سُنبل کو یاد آئی جو زُلفِ عنبریں
مثلِ بو گلشن سے نکلے ہیں پریشاں ہو کے ہم
چشمِ تر نے دامنِ صحرا میں موتی بھر دیے
جوشِ وحشت میں اُٹھے تھے ابرِ نیساں ہو کے ہم
چونک پڑتے ہیں وہ رؤیا میں بھی ہم کو دیکھ کر
شاید آتے ہیں نظر خوابِ پریشاں ہو کے ہم
حوصلے پرواز کے نکلے ہیں مر مٹنے کے بعد
اُڑتے پھرتے ہیں غبارِ کوئے جاناں ہو کے ہم
انتہائے لاغری نے کر دیا قصہ دراز
جی رہے ہیں موت کی نظروں سے پنہاں ہو کے ہم
دیکھ کر دل ٹوٹتا ہے شائق انجامِ حباب
کیا کریں گے بحرِ عالم میں نمایاں ہو کے ہم

سو مزے اک نفس میں ملتے ہیں
سانس لینے سے زخم چھلتے ہیں
تیرے ملنے کی جستجو میں ہم
اس سے ملتے ہیں اس سے ملتے ہیں
زخم ہوتے ہیں آہ سے تازہ
اس ہوا سے یہ پھول کھلتے ہیں
کر دیا غم نے کاہ شائق کو
اب تو حضرت ہوا سے ہلتے ہیں
سب سے ملتے ہیں وہ کہاں شائق
جس سے ملتے ہیں اس سے ملتے ہیں

منشی محمد حیات خاں مظہرؔ

منشی محمد حیات خاں مظہرؔ ابن محمد عباس، مرتضیٰ پور (اکولہ)　تاریخ وفات: ۱۵؍ جولائی ۱۹۳۶ء

مدرّس: محمڈن ہائی اسکول، امراوتی

"افکارِ مظہرؔ" (شعری مجموعہ)

بہارِ معنیِ رنگیں ہے اندازِ رقم میرا　بنا ہے مطلعِ حمدِ خدا باغِ ارم میرا

اجل کے ہاتھ سے آخر نکل آیا بھرم میرا　نہاں تھا اندرونِ پردۂ ہستی عدم میرا

نہیں موسیٰ کہ غش کھا کر گرونگا اس تجلّی سے　ازل سے شغل ہے نظارۂ حُسنِ صنم میرا

یہ وہ آتش ہے نکل دَم میں نکالے برقِ سوزاں کا　پڑی ہے سرد دوزخ دیکھ کر سوزِ الم میرا

نہ گرتا چاہ میں اُن کی تو کیا کنویں جھکاتے وہ　تباہی کا مری باعث ہُوا ہے خود ستم میرا

نیامِ تیغ سے تیری جو یہ بجلی نکلتی ہے　تو دو دو ہاتھ اچھلتا ہے ادھر سینہ میں دَم میرا

فلک کی دیکھ کر رفتارِ پیچیدہ کو حیراں ہوں　کہاں جا کر پہنچ کرتا ہے مظہرؔ پیچ و خم میرا

دل میں مرے خیالِ رُخِ مہ جبیں رہا　سایہ پری کا شیشہ میں صورت گزیں رہا

اللہ رے میرے بخت کی شوخی کہ وصل میں　پردے ہی میں حجاب کے وہ نازنیں رہا

اُس بت کی بندگی سے نہ باز آیا بُت پرست　کم بخت دل مخالفِ شرعِ متیں رہا

محصورِ غم ہوں نقطۂ پرکار کی طرح　میں مرکزِ مظالمِ اربابِ کیں رہا

خونِ جگر سے زیست کی اُمید تھی مگر　وہ بھی بحکمِ شرعِ محبت نہیں رہا

حاصل ہُوا نہ بحرِ تصور میں دُرِّ وصل　ہر چند دل مثال صدف تہ نشیں رہا

مظہرؔ حریصِ لذّتِ غم ان کے عشق میں　پابند تجھ سا اے مگسِ انگبیں رہا

دل میرا صید سینہ میں ہے زلفِ یار کا ہے بوالعجب حرم میں طریقہ شکار کا
ایسی شرر فشاں ہے مری آہ پُر شرر جس طرح چھوٹنے میں ہو عالم انار کا
ظلِ کرم میں تیرے تمازت کا ذکر کیا ہے مہر پر گمان شجرِ سایہ دار کا
لہرا رہی ہے رُخ پہ ترے موج خطِ سبز طوطی کو آئینہ میں ہے جلوہ بہار کا
داغِ جگر کیا ہے عطا مجھ کو عشق نے سکہ ہی کچھ الگ ہے مرے شہریار کا
رُخ پر تمھارے خال جو دیکھا قریب زُلف مجھ کو گمان اُس پہ ہُوا چشمِ مار کا
وہ آئیں میرے گھر تو میں آنکھوں میں دوں جگہ دیکھیں وہ لطف آنکھ سے ابرِ بہار کا
نظارۂ صنم کا ان آنکھوں کو شوق ہے کرتی ہیں کام قبر میں بھی ہوشیار کا
بلبل نہ کیوں اسیرِ محبت چمن میں ہو دام اُسکے پاؤں میں ہے رگِ گُل کے تار کا
سودے میں زُلفِ یار کے جاری ہیں طفلِ اشک گویا رواں ہے قافلہ چین و تتار کا
وہ مست جامِ عشق ہوں مظہرؔ کہ حشر تک ممکن نہیں کہ دخل ہو اس میں خمار کا

ہے برق خرمنِ جاں سوزِ نہاں ہمارا سرگرم جلوۂ غم حُسنِ بیاں ہمارا
رنگِ بہار آگیں مضمون سے ہے پیدا یہ شعر کی زمیں ہے یا بوستاں ہمارا
ہو نقش آرزو بھی اک صورتِ نگاریں گر ہو مصوّرِ چیں دورِ زماں ہمارا
کیا حرفِ مدعا ہے اک نشترِ رگِ جاں کیوں صرفِ غم ہے نقدِ عمرِ رواں ہمارا
آغوشِ ظلم ہی میں پروردہ ہو چکے ہیں کیا امتحاں کرے گا یہ آسماں ہمارا
صبر و قرار دل میں کس طرح راہ پائیں یہ نالۂ شبِ غم ہے پاسباں ہمارا
دل دادگانِ غم کو عشرت سے کیا تعلق ؟ ہے کوچۂ مصیبت دارالجناں ہمارا
خمیازۂ تمنا ہے موجب تباہی ہے کون جو اُٹھائے بارِ گراں ہمارا
اے بخت واژگوں ہم تجھ سے یہ پوچھتے ہیں کیا ہم کو کچھ نہ دے گا روزی رساں ہمارا
جورِ فلک کا مظہرؔ پردہ اُٹھا ہی دیتے ہے سدِّ راہ لیکن ضبطِ فغاں ہمارا

خواجہ لطیف احمد جریحؔ

خواجہ لطیف احمد جریحؔ ابن خواجہ حافظ علی محمد، (پانی پت یو۔پی) ثمہ امراؤتی

تاریخ پیدائش : ۱۸۸۵ء وفات : ۱۹۳۱ء

بی۔اے (علیگ) "نغمۂ زندگی" (منظوم رسالہ)

"صدر مدرس محمڈن ہائی اسکول، امراؤتی

تابہ کے تیر پہ او تیر لگانے والے — دیکھ مرجائیں نہ یہ ناز اُٹھانے والے

جان دے دوں گا کہا مَیں نے تو وہ کہتے ہیں — ایسے دیکھے ہیں بہت جان سے جانے والے

جس طرح اپنی بسر ہوتی ہے ہوجاتی ہے — خوش رہیں شاد رہیں دل کے جلانے والے

جذبِ دل چاہے ہے الفت میں اثر ہو صاحب — بن بلائے ہی چلے آتے ہیں آنے والے

شکر کرتے ہیں شکایت کی جگہ ہم ہر بار — ہم سے کم ہونگے ترے جور اُٹھانے والے

درد و غم، رنج و الم حیرت و یاس و حرماں — یہی مہمان تو ہیں آکے نہ جانے والے

آزما لیجئے اغیار سے، کس لیجے ہمیں — ہم ہزاروں میں نہیں آنکھ پھرانے والے

ان کے کوچے سے میں گذرا تو کہا شوخی سے — کیوں ادھر آتے ہیں، سنتے بھی ہو جانے والے

جان دینے کو ہیں تیار جریحؔ مضطر — تم نے دیکھے نہیں کیا ناز اُٹھانے والے

کس بیوفا سے حال کہا اضطراب کا — خانہ خراب اس دلِ خانہ خراب کا

قاصد کی لاش آئی ہے خط کے جواب میں — منشا یہ ہے جواب نہ آئے جواب کا

مُن لوگے کوئی دن کہ کمھلا گیا یہ پھول — مکھڑا تھا چاند سا جو عروسِ شباب کا

قاصد کے دل میں تھا کہ زبانی بھی کچھ کہے — حاضر مگر مزاج نہ پایا جناب کا

تقصیر بھی گناہ بھی کوئی خطا بھی ہو — کہنا نہیں ہے حال تمہارے عتاب کا

اندیشہ ہے نہ روح امیں لے اُڑیں جریحؔ — ہوں خاکِ درِ جنابِ رسالت مآب کا

حالِ دل لاکھ طرح ان کو جتا دیتے ہیں
وہ مگر بات کو باتوں میں اُڑا دیتے ہیں

لائقِ نذر نہیں اور تو کچھ اپنے پاس
ایک دِل ہے سو تمھیں نامِ خدا دیتے ہیں

لاکھ نفرت کریں وہ ہم سے عداوت رکھیں
خوش رہیں شاد رہیں ان کو دعا دیتے ہیں

بہرِ تسکیں کبھی احباب نے اتنا نہ کہا
کیوں پریشاں ہو جریح ان کو بلا دیتے ہیں

حرص و ہوا کے ہیں سب بندے کچھ بھی خدا سے کام نہیں
تُف ہے ایسے جینے پر، ہے، جس کا نیک انجام نہیں

مَیں نے ہی پہلے دیکھا تھا مَیں ہی گرا تھا غش کھا کر
مَیں ہی ملزم، مَیں ہی مجرم، آپ پہ کچھ الزام نہیں

حالتِ نزع مت پوچھو تم سکتہ کا سا عالم ہے
اب کوئی دم کا ہے مہماں صبح ہوئی تو شام نہیں

حالت کیا ہے جریح خستہ کچھ منہ سے تو بتلاؤ
ان کے غم میں ہو سرگشتہ، یاد بھی اس کا نام نہیں

عبدالصمد قیصرؔ

محمد عبدالصمد قیصرؔ بدنیروی ابن محمد عبدالرحمٰن
تعلیم : H.S.S.C ملازمت : محکمۂ پولس پیدائش : ۱۸۹۴ء وفات : ۱۹۶۶ء
"طوفان وساحل"، "آبشار"، "غبارِ کارواں" (شعری مجموعے)، "ربابِ ہستی" (افسانے)

عروج میرا ہے جو کہ دنیا سمجھ رہی ہے زوال میرا
کھٹک رہا ہے نگاہِ حاسد میں خار بن کر کمال میرا

کٹیں تو کیوں کر کٹیں بھلا ، نامراد دن زندگی کے آخر
نہ کچھ خبر مجھ کو آپ اپنی ، نہ آپ کو کچھ خیال میرا

کہیں نہ آنسو بہائے شبنم، کہیں نہ کلیاں ہوں چاک دامن
تجھے قسم رونقِ چمن کی صبا نہ کہہ ان سے حال میرا

میں پرتوِ نورِ لم یزل ہوں فنا نوازِ ازل کا ڈر کیا
کمالِ صانع کا نقص ہوگا اگر ہوا بھی زوال میرا

گناہگاروں کی اوّلیں صف سے چشمِ رحمت نے مجھ کو چھانٹا
ہزار سجدوں سے بڑھ کے کام آیا جذبۂ انفعال میرا

کسے خبر ہے کہ ہو ادا فرضِ بندگی پھر بھی مجھ سے قیصرؔ
زبانِ شکر و سپاس بھی بن گیا اگر بال بال میرا

محبت ہو تو شامِ غم بھی پُر تنویر ہوتی ہے
چمک سی دل میں آنکھوں میں کوئی تصویر ہوتی ہے

نظر آئے بہت مسرور اربابِ چمن مجھ کو
نہیں معلوم کیا اس خواب کی تعبیر ہوتی ہے

یہی تاریکیاں غم کی پیامِ امن لائیں گی
اندھیروں کے پسِ پردہ سحر تعمیر ہوتی ہے

جوانی کی خطاؤں پر سزائیں داورِ محشر
کہیں دیوانگی بھی قابلِ تعزیر ہوتی ہے

نکل جاتے کبھی کے نکہتِ گل کی طرح قیصرؔ
مگر خاکِ وطن اٹھ اٹھ کے دامن گیر ہوتی ہے

خزاں کے خوف سے کلیوں کو لرزاں دیکھ لیتا ہوں
ہجومِ رنگ و بو میں غم کے طوفاں دیکھ لیتا ہوں
بھلا بیٹھا ہوں یادِ تلخ ، ایامِ گزشتہ کی
مگر اب بھی کبھی خوابِ پریشاں دیکھ لیتا ہوں
تڑپ اُٹھتا ہوں غم سے سینہ چاکانِ گلستاں کے
گلوں کو دیکھ کر اپنا گریباں دیکھ لیتا ہوں
گلوں کی سینہ چاکی ، بلبلوں کا دردِ بیتابی
میں ہر پردے میں تیرے جورِ پنہاں دیکھ لیتا ہوں
درِ میخانہ وا ہوتا ہے واعظ مَیں ابھی آیا
ذرا پی لوں تو بحثِ کفر و ایماں دیکھ لیتا ہوں
جو غرقابی مقدر ہے تو ارماں ہی نکل جائے
ذرا ہٹ ناخدا میں زورِ طوفاں دیکھ لیتا ہوں
مری خودداریاں جھکنے نہیں دیتیں مجھے قیصرؔ
مگر بندہ ہوں اس کا جس کو انساں دیکھ لیتا ہوں

تلخ کرلیں زندگی کیوں فکرِ مستقبل سے ہم
باز آئے اس جنونِ سعیٔ لاحاصل سے ہم
یہ حرم یہ دیر ، یہ ہوش و خرد کی گمرہی
ہر قدم کچھ دور ہی ہوتے گئے منزل سے ہم
انتہائے شوق میں ڈوبے ہوئے کھوئے ہوئے
تیری محفل میں بھی کتنی دور ہیں محفل سے ہم
حسرتِ ساحل بھی تھی طوفاں سے جب تک دور تھے
ڈوب کر اُبھرے تو اب بیزار ہیں ساحل سے ہم
یہ مسلسل بے حسی ، افتادگی ، فرسودگی
خوب ہیں طوفاں میں قیصرؔ دور ہی ساحل سے ہم

حبیب الرحمٰن صدیقی

حبیب الرحمٰن صدیقی ابن خلیل الرحمٰن صدیقی میرٹھ (یو۔پی) ثمہ امراوتی

ایم۔اے (اردو، فارسی) تاریخ پیدائش : ۱۹۰۱ء وفات : ۱۹۷۱ء

"مکاتیب حبیب" (مجموعۂ خطوط) مرتب ذکاء الرحمٰن صدیقی

صدر مدرس محمڈن ہائی اسکول، امراوتی

دلِ دیوانہ سے حالِ دلِ دیوانہ کہتے ہیں
ہمیں ہیں سُننے والے اور ہمیں افسانہ کہتے ہیں

سُنا ہے پھر بہار آئے گی اس اُجڑے ہوئے گھر میں
بنے گا اِک جہانِ آرزو ویرانہ کہتے ہیں

سرِ اخلاص جس کا محوِ سجدہ ہو ترے در پر
وہ کیا جانے کسے کعبہ کسے بت خانہ کہتے ہیں

دمِ آخر ہے آجاؤ مریضِ غم کی بالیں پر
ذرا سُن لو لبِ خاموش کیا افسانہ کہتے ہیں

نقابِ رُخ اُلٹنا خرمنِ ہستی کا جل جانا
اسی بجلی کو شاید جلوۂ جانانہ کہتے ہیں

آشیاں تھا ہم سے، ہم تھے آشیانے کیلئے
روئیے کیا اب قفس میں اُس زمانے کیلئے

کار فرما ہیں نیازِ عشق کی مجبوریاں
سجدے لیکر مَیں چلا تھا آستانے کیلئے

کشمکش میں ہے حیات و موت کی جانِ حزیں
آپ آجائیں ذرا قصہ چکانے کیلئے

ہوگئے تنکے نشیمن کے قفس کی تیلیاں
بن گیا کیا، ہم چلے تھے، کیا بنانے کیلئے

کوئی ہوتا ہے خریدار متاعِ اہلِ دل
دولتِ دارین لاتے ہیں لُٹانے کیلئے

ہو قفس کی تیلیوں پر بھی نگاہِ لطفِ برق
کیا نشیمن ہی کے تنکے تھے جلانے کیلئے

خود اپنی پرستش کرتے ہیں کچھ دیر و حرم سے کام نہیں
وہ طرزِ نیازِ خاص ہے یہ جو کفر نہیں اسلام نہیں
ہوں پیر مغاں یا شیخ حرم سب باندھ رہے ہیں اپنی ہوا
کہنے کو بہت کچھ کہتے ہیں جو بات ہے اس کا نام نہیں
ہم توڑ دیں قیدِ ہستی بھی یہ قیدِ قفس تو چیز ہے کیا
اک جنبشِ قلبِ مضطر میں یا ہم ہی نہیں یا بام نہیں
ہے جوشِ عطائے ساقی بھی کب وجہِ سکونِ تشنہ لبی
یا جام بقدرِ بادہ نہیں یا بادہ بقدرِ جام نہیں
آزاد رہے ناکام جئے ، پابند بھلا کیا شاد رہیں
ہو صحنِ چمن یا کنجِ قفس ہم کو تو کہیں آرام نہیں
ہمت ہی نہیں کی ورنہ ابھی اک جست میں منزل جا لیتے
کٹتی ہے کہیں یوں راہ بھلا دو گام چلے دو گام نہیں
کیا شاہدِ رعنا چھانٹا ہے اللہ رے میری دیدہ وری
یہ حُسن سرِ بازار نہیں ، یہ ذوقِ تماشا عام نہیں

خوں اگر ہوں گے تو کام آئیں گے پیمانوں کے　حوصلے کچھ تو نکل جائیں گے ارمانوں کے
ایک ہم ہے کہ بجز آپ کے سب ہیں اپنے　ایک ہیں آپ ، نہ اپنوں کے نہ بیگانوں کے
شوقِ مئے تھا تو کہیں سے ہمیں مانگے نہ ملی　توبہ کرلی ہے تو در باز ہیں میخانوں کے
جمع پھر کرتے ہیں اجزائے پریشاں دل کے　ٹکڑے لے آتے ہیں ٹوٹے ہوئے پیمانوں کے
چار تنکے تھے نشیمن کے سو وہ جل بھی چکے　برق کیوں فکر میں ہے سوختہ سامانوں کے

محمد شمس الدین عاجزؔ

محمد شمس الدین عاجزؔ ابن عبدالخالق، تلے گاؤں دساسر (امراوتی)

تاریخِ پیدائش : ۱۹۰۳ء وفات : ۱۰/دسمبر ۱۹۷۲ء

ہنگامہ بپا حشر کا اے دوستو ! جب ہو
ساقیِ گل اندام ہو اور بنتِ عنب ہو

زنجیرِ درِ یار پہ رہتی ہیں نگاہیں
فجر و ظہر و عصر یا تاریکیِ شب ہو

دل دو ! جگر و جان بھی ! ایمان بھی یہ کیا
محتاج نہیں پر بڑے بسیار طلب ہو

حاسد ارے بزدل، ارے شاطر ارے ظالم
حاصل تجھے تسکینِ دلی ہو بھی تو کب ہو

عاجزؔ کرو آرام کہ ستّر کے ہوئے تم
اس عمر میں مرنے کی ہوس ؟ واہ عجب ہو

رُخ سے پردہ اُٹھاتے کیوں
خاک وخوں میں مجھے ملاتے کیوں

تم ہی کرتے اگر نہ تیغ زنی
سیکڑوں خون میں نہاتے کیوں

چپ رہو چپ کہ آرہا ہے عدو
دوستو ! اس کا دل دکھاتے کیوں

دل سے ہوتی اگر نہ گستاخی
زُلفِ پیچاں کو وہ جماتے کیوں

تم نے چھیڑا انھیں غلط عاجزؔ
ورنہ ایسے جھپٹ کے جاتے کیوں

ان کے جور و جفا ان کے ظلم و ستم ،سارے عالم میں معروف و مشہور ہیں
کیا کریں دل مگر مانتا ہی نہیں ، دل کے ہاتھوں بڑے ہم تو مجبور ہیں
واہ واہ شیخ جی ! آپ بھی خوب ہیں، اتنے تڑکے چلے آگئے ہیں یہاں
رات پی لی تھی ہم نے بہت تیز تر ، کیا ملیں کیا کہیں اب تو معذور ہیں
کیا وہ آئے بھی تھے کیا چلے بھی گئے ،کیا سبب ہے کہ ہلتی ہے زنجیر بھی
ہوگئی ہے سحر ، پر نہیں ہے خبر ، کب چڑھا تھا نشہ کب سے مخمور ہیں
بولا جا کے کوئی وہ جو ہیں بے خطا ، جن کو کہتے ہیں سب عاجزؔ بے وفا
ہیں وہی زیبِ سنگِ درِ آستاں ، جم کے بیٹھے ہیں اور شاد و مسرور ہیں

وہ لذتوں پہ لذتیں پائی ہیں دید کی
بے کیف ہو کے رہ گئیں سب خوشیاں عید کی

شکوہ درازدستیٔ دل کا بجا مگر
آپ ہی کے التفات نے مٹی پلید کی

یارو خدا کے واسطے آنکھیں کھلی رکھو
حسرت ہے بعد مرگ بھی پھر ان کے دید کی

عاجزؔ وظیفہ پڑھتے ہیں نامِ حسینؓ کا
کرتا کوئی ہے یاد جہاں میں یزید کی

پروفیسر منظور حسین شورؔ (علیگ)

پروفیسر منظور حسین شورؔ (علیگ)، امراؤتی　تاریخِ وفات : ۸؍جولائی ۱۹۹۴ء

لکچرر مارس کالج ناگپور، کنگ ایڈورڈ کالج، امراؤتی، عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد (پاکستان ہجرت)

''حشر مرتب (غزلیات) ''زماں ومکاں'' ''ذہن وضمیر'' (رباعیات) ''فیضِ دوراں'' ''دیوارِ ابد'' (منظومات) دیگر متعدد نثری و شعری کتب

عشق کب اس تسلّی کا محرم نہ تھا　اس کا پردہ بھی جلوے سے کچھ کم نہ تھا

دل کو اپنی تباہی کا کچھ غم نہ تھا　اس کی آنکھوں کا ارشاد مبہم نہ تھا

وہ گریباں بھی تھا دستِ وحشت سے چاک　دامنِ حسن دامانِ مریم نہ تھا

حُسن پہلے بھی رُسوائے غم تھا مگر　حُسن سر تا قدم نخلِ ماتم نہ تھا

اس سے پہلے بھی سو بار دھڑکا تھا دل　دل دھڑکنے کا لیکن یہ عالم نہ تھا

غنچہ اپنے تبسّم سے مجبور تھا　غنچہ کب محرمِ رازِ شبنم نہ تھا

خون ٹپکا تھا زاہد مری آنکھ سے　موجِ کوثر نہ تھی ، آبِ زمزم نہ تھا

جامِ جم میں جو صدیوں سُلگتا رہا　اور کیا تھا اگر خونِ آدم نہ تھا

کب فلک پر ستارے فروزاں نہ تھے　کب زمیں پر ستاروں کا ماتم نہ تھا

اس نے پوچھا نہ تھا شورؔ جب تک مزاج　آنکھ نم نم نہ تھی ، درد کم کم نہ تھا

ایک شریکِ راہ کا دھیان　کر گیا ہر رستہ سنسان

ایک جنوں لاکھوں بہتان　کس کس سے اُلجھے انسان

راہی کس کو دے آواز　رستہ گُم ، منزل ویران

کس کا منھ دیکھے وہ ناؤ　راس نہ ہو جس کو طوفان

سہل نہیں اشکوں کا خلوص　اے غمِ دل مجھ کو پہچان

ظلمت اس دُنیا کی نہ پوچھ　جس کا اُجالا ہو انسان

چھُپ نہ سکے گا دل کا زخم　چھُپنے والے مان نہ مان

اپنا گریباں اپنا ہاتھ　اس میں کسی کا کیا نقصان

ڈوبنے والے یوں بھی شورؔ　ڈوب گئے ہیں بے طوفان

روش روش پر جنوں کے آگے خرد کے ظالم مقام کب تک
جھکی جھکی سی نظر کہاں تک رُکا رُکا سا خرام کب تک
یہ احتیاطِ کرم کہاں تک ، یہ زحمتِ گام گام کب تک
نفس نفس میں پیام کب تک ، نظر نظر میں سلام کب تک
یہ بندگی ہے تو بندگی کا فریب رسوائے عام کب تک
لبوں پہ صبحیں تو ہیں مسلّم ، مگر یہ سینوں میں شام کب تک
رُکی سی آہیں، جھکی نگاہیں ، وہی حقیقت وہی فسانہ
سکوت تیرا سکوت کب تک ، کلام تیرا کلام کب تک
ترے کنارے نہ تیرے دھارے، تری ہلاکت نہیں تو کیا ہے
ترے سفینوں سے ساحلوں پر یہ موج کا انتقام کب تک
یہی جمالِ گل و سخن ہے تو آ چمن سے دھواں اُٹھادیں
روش روش پر بچھے رہیں گے یہ لالہ و گل کے دام کب تک
نہ دوشِ طوفاں نہ آشیانہ نہ بجلیوں پر کمند تیری
یہی چمن ہے تو اس چمن میں ترے نشیمن کا نام کب تک
نہ نور تیرا نہ آگ تیری ، رباب ٹوٹے شراب چھوٹی
یہ ظلمتِ انجمن کہاں تک ، یہ تہمتِ جام جام کب تک
اگر نہ برہم ہو اہلِ محفل تو اہلِ محفل سے شورؔ پوچھوں
کوئی بتادے کہ میرے ہونٹوں پہ اس کا نغمہ حرام کب تک

دیدہ و دانستہ دھوکا کھا گئے
ہم فریبِ زندگی میں آگئے

جب ہجومِ شوق سے گھبرا گئے
کھو گئے خود اور تم کو پا گئے

چین بھی لینے نہیں دیتے مجھے
میں ابھی بھولا تھا پھر یاد آگئے

دل ہی دل میں اُف وہ دردِ نا گہاں
آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ سمجھا گئے

رُخ سے آنچل بھی نہ سرکا تھا ابھی
نیچی نظریں ہوگئیں ، شرما گئے

پوچھتے کیا ہو ان اشکوں کا سبب
واقعاتِ رفتہ پھر یاد آگئے

اب تو شورؔ اپنا فسانہ ختم کر
ان کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے

سردار خاں اثرؔ

سردار خاں اثرؔ ابن غلام نبی خاں، بالاپور (اکولہ)
تعلیم : درجہ ہشتم
تاریخ پیدائش : ۱۹۰۴ء وفات : ۵ جولائی ۱۹۸۰ء

گلستاں مَیں نے بنایا جو ہے ویرانے کو
کس کی طاقت ہے اُجاڑے مرے کاشانے کو

اور ہوں گے ترے محتاجِ کرم اے ساقی
مَیں بہاروں کو ترستا ہوں نہ پیمانے کو

دھجیاں دامنِ ہستی کی نہ اُڑ جائیں کہیں
اتنا بہکاؤ نہ بہکے ہوئے دیوانے کو

میری روتی ہوئی آنکھوں کو نہ دیکھو پیہم
اور چھلکاؤ نہ چھلکے ہوئے پیمانے کو

آج تک وہ بھی بچاتے رہے دامن اپنا
کتنا ہشیار سمجھتے ہیں وہ دیوانے کو

ساری دنیا تو اثرؔ دیکھ چکی حالِ تباہ
اک خدا رہ گیا حالت پہ ترس کھانے کو

ستم، جور و جفا سب کچھ گوارا کر لیا میں نے
بچا کر ان کا دامن خود کو سجدہ کر لیا میں نے

مرے ہی سامنے جب برق نے پھونکا نشیمن کو
گھڑی بھر کے لئے وہ بھی نظارہ کر لیا میں نے

بڑھی جب بیخودی حد سے ہُوا کیا پھر خدا جانے
انھیں سجدہ کیا یا خود کو سجدہ کر لیا میں نے

یہاں تو داد منھ دیکھے کی ملتی ہے اسی خاطر
سخن دانوں کی محفل سے کنارا کر لیا میں نے

اثرؔ راہِ وفا میں اک مقام ایسا بھی آیا تھا
وہاں پہ جان و دل کا ہنس کے سودا کر لیا میں نے

وہی نا جن کا کل تک ذکر تھا سارے زمانے میں
اُسی کو اب اثرؔ کہتے ہیں اپنا کر لیا میں نے

حصولِ بندگی زاہد اگر داغِ جبیں تک ہے
یہ تیری خود فریبی خود ترے حدِ یقیں تک ہے
کسی کا حسن خود رُسوا ہُوا ہے دونوں عالم میں
ہمارے عشق کی دنیا جہاں ہم ہیں وہیں تک ہے
عتاب آلودہ نظروں سے مجھے او دیکھنے والے !
یہ میری زندگی تیری نگاہِ واپسیں تک ہے
تصور بھی اسی کا ' یاد اس کی ' ہے خیال اس کا
کہ اس پہ دل ہی کیا قرباں مری جانِ حزیں تک ہے
اثرؔ اک دن سناؤں گا اُسی کو حالِ دل اپنا
رسائی میری کعبہ تک نہیں ، کعبہ نشیں تک ہے

جنونِ عشق پہ اچھا صلہ دیا تو نے　　زمانے بھر کی نظر سے گرا دیا تو نے
صبا بھی ڈھونڈتی پھرتی ہے خاک کو میری　　مٹا مٹا کے یہاں تک مٹا دیا تو نے
مرے لئے ہی کمی ہے ترے کرم میں کریم　　کہ بے طلب کو بھی حد سے سوا دیا تو نے
وگرنہ میں کیا جہاں میں مری حقیقت کیا　　ترا کرم ہے کہ جو کچھ عطا کیا تو نے
گواہی دیتی ہیں بربادیاں اثرؔ تیری　　کسی کے عشق میں خود کو مٹا دیا تو نے

حکیم انوار محمد خاں کامل

حکیم انوار محمد خاں کامل، پوسد (ایوت محل) تاریخ پیدائش : ۲۲رجون ۱۹۰۵ء

کیوں ہونے لگے دل میں یہ رنج ومحن پیدا
کیوں ہونے لگی میرے سینے میں جلن پیدا
کیوں ٹیس سی اُٹھتی ہے رہ رہ کے مرے دل میں
کیوں ہے یہ خلش آخر کیوں ہے یہ چبھن پیدا
مائل ہے ستم پر کیوں کچھ لطف اُٹھانے دے
پھر ہونگے نہ دُنیا میں اے چرخِ کہن پیدا
سوداؔ ہے نہ انشاؔ ہے غالبؔ ہے نہ اکبرؔ ہے
ہوں ہند میں پھر ایسے اربابِ سُخن پیدا
دعوائے غزل گوئی کرتا ہے اگر کامل
شاگرد کسی کا ہو، کر مشقِ سُخن پیدا

اُس شوخ سے کس طرح کہیں دل کی کوئی بات
کر دیتا ہے ہر ایک پر اظہار، کہی بات
کس درجہ تنفّر ہے انھیں بات سے میری
منھ پھیرتے ہیں میں نے اگر کی بھی کوئی بات
کیا کہتے ہو عشاق کو مرنا نہیں آتا
اچھا تمھیں دکھلاؤں، رہی تم سے یہی بات
پینے کیلئے آیا تھا میخانے میں زاہد
کیا خوب ہمیں آج یہ ساقی نے کہی بات
گر وصل سے انکار ہے یوں ہی سہی لیکن
کیوں کرتے ہو تہذیب کے درجہ سے گری بات
کہتے ہیں کہ وہ حُسن سے مغلوب کریں گے
کچھ اُڑتی ہوئی آج یہ ہم نے بھی سُنی بات
ہے حضرتِ کامل کی بہت اچھی یہ عادت
کہہ دیتے ہیں ہر ایک سے واللہ کھری بات

عرض کرتا ہوں مانیے واعظ ورنہ پھر آپ جانیے واعظ
کیسی لذّت ہے مے میں پوشیدہ پی کے تھوڑی سی دیکھیے واعظ
گو ملے گی شراب جنّت میں کون اُمید پر جیے واعظ
ہے یقیں بخش دے گا ہم کو خدا کام اچھے بھی کچھ کیے واعظ
دیکھنا میکدے میں آیا ہے ساتھ ایک شوخ کو لیے واعظ
واقعی آپ نے بھی کی توبہ ؟ کہیں ایسا نہ کیجیے واعظ
دل میں کامل کے رہ گئی حسرت ہو گئے تنگ قافیے واعظ

شاید کسی نے آپ سے یہ کہہ دیا غلط ممکن ہے آپ ہی نے کہیں سن لیا غلط
واللہ اب بھی آپ کا مَیں جاں نثار ہوں میں! اور آپ ہی سے کہوں گا بھلا غلط !
مقصد تھا مارنا مجھے تڑپا کے ہجر میں دعوٰی ترا خدا کی قسم ہو گیا غلط
مدّت کے بعد آج نظر آئے شکر ہے دیکھا ہے جب سے تم کو مرا غم ہُوا غلط
ہم کو نہیں ہے واسطہ کچھ عشق سے وَلے چرچا کسی نے کر دیا ہے جا بجا غلط
جاتے تھے گھر رقیب کے پر آ گئے یہاں اُن کو بتا دیا ہے کسی نے پتا غلط
ہم نے سنا کہ حضرتِ کامل گذر گئے ہے آرزو کہ نکلے خبر' یاخدا غلط

عبدالحکیم ذاکر

عبدالحکیم ذاکر، کھام گاؤں — سنِ پیدائش ۱۹۰۶ء

صنعتِ کردگار ہیں ہم لوگ — عظمتِ شاہکار ہیں ہم لوگ
شوکتِ یادگار ہیں ہم لوگ — باعثِ افتخار ہیں ہم لوگ
صلح جو صلح کار ہیں ہم لوگ — گلستاں کی بہار ہیں ہم لوگ
جب سے سینہ فگار ہیں ہم لوگ — پیکرِ اضطرار ہیں ہم لوگ
دل پہ قابو نہ تم پہ قابو ہے — کتنے بے اختیار ہیں ہم لوگ
تیرے بھی ہو کے تیری دنیا میں — باعثِ ننگ و عار ہیں ہم لوگ
عشق کا کاروبار کرتے ہیں — بر سرِ روزگار ہیں ہم لوگ
ہیں چمن میں گلوں کے ہمسائے — اور نگاہوں میں خار ہیں ہم لوگ
ہیں لگائے ہوئے گلے اب بھی — دوستی کا وقار ہیں ہم لوگ
کتنے وزنی ہیں پائے استدراک — دوشِ گیتی پہ بار ہیں ہم لوگ
جانتے ہیں وجوہ بغض و عناد — کیوں محبت شعار ہیں ہم لوگ
غم بچا کر دلوں میں رکھتے ہیں — کیا کفایت شعار ہیں ہم لوگ
بحرِ اُلفت کی تہ میں پاؤ گے — گوہرِ آب دار ہیں ہم لوگ
ذاکرؔ اردو زباں ہماری ہے — اس کے آموزگار ہیں ہم لوگ

آئے بالیں پہ مرے عیسئِ دوراں ہو کر — کیوں مگر بیٹھ گئے سر بہ گریباں ہو کر
رونقِ بزم تو ہوں صورتِ پروانہ مگر — آزمائیں تو مجھے شمعِ فروزاں ہو کر
نہ تو جینے کا مزہ ہے نہ سکوں مرنے میں — زندگی رہ گئی اک خوابِ پریشاں ہو کر
ہم نفس پوچھ تو لے حالِ نشیمن بھی ذرا — برق صیاد کے گھر آئی گلستاں ہو کر
نہ رہی تابِ نظر، لطفِ تماشا معلوم — کیا کیا آپ کے جلوؤں نے پریشاں ہو کر
درد بھی تم نے دیا ہے تو دوا بھی تم دو — میرے پہلو میں رہو درد کا درماں ہو کر
بے بس اتنے ہوئے کیوں عشقِ بتاں میں ذاکرؔ — کفر بکنے لگے اک مردِ مسلماں ہو کر

عبدالمجید کارکرے

عبدالمجید کارکرے، کھام گاؤں (پاکستان ہجرت) سنِ پیدائش: ۱۹۱۲ء

جام چھلکائیں، صراحی سے نظر چار کریں
میکدہ نیند میں ہے، ہم اِسے بیدار کریں
کون آئے گا شبِ غم مری پرسش کے لئے
آپ آئیں گے! ذرا سوچ کے اقرار کریں
ایک قاتل بھی ہے اِس شہر میں منصف کی طرح
جان کی ہم جو اماں پائیں تو اظہار کریں
غنچہ و گل پہ کوئی تازہ قیامت ٹوٹے
لوگ اتنا بھی نہ فکرِ لب و رُخسار کریں

گھر چھوڑ کے بھی گھر ہی کے آزار میں رہنا
کھوئے ہوئے فکرِ در و دیوار میں رہنا
کچھ اور بڑھا دیتا ہے معنی کا تاثر
چپ رہ کے بھی پیرائے اظہار میں رہنا
جو مصلحتِ وقت کو خاطر میں نہ لائے
وہ حُسنِ انا چاہیے فنکار میں رہنا

مصوّرؔ کارنجوی

مرزا احمد بیگ مصوّرؔ ابن مولوی مرزا محمد بیگ، کارنجہ — تعلیم : ثانوی درجات

سنِ پیدائش : ۱۹۰۷ء

"نیرنگِ مصوّر" ۱۹۶۳ء، "رنگینیاں" "رنگِ حیات" ۱۹۷۷ء "جلال و جمال" (شعری مجموعے)

آیا آیا وہ دلربا آیا — دردِ دل لے کے مدّعا آیا
حُسن میرا خدا نہیں لیکن — بندگی میں بڑا مزا آیا
آنے دو جوش میں تلاطم کو — اپنی کشتی میں اب خدا آیا
کیا لگائی ہے آگ دنیا کو — کس قدر دور سرپھرا آیا
حُسنِ کامل، تری حضوری میں — جو بھی آیا وہ پارسا آیا
تم بھی خوش ہو مری تباہی سے — یہ بتاؤ کہ ہاتھ کیا آیا !
جس مصوّرؔ کی آرزو تھی تجھے — وہ ترے شہر میں چلا آیا

سب اٹھ جائیں گے پردے درمیاں سے — اشارہ تو کریں وہ لامکاں سے
چنے تا عمر کانٹے گلستاں سے — کبھی اُجرت نہ مانگی باغباں سے
بہت اونچا سہی وہ عرش لیکن — بہت نیچا ہے تیرے آستاں سے
مرے حُسنِ تخیّل کے کرشمے — ترے جلوے نکلتے ہیں یہاں سے
اُڑا دو گرد میخانے کی رندو — لڑا دو آسماں کو آسماں سے
سراپا گوش بر آواز ہوں مَیں — نہ جانے دی صدا اُس نے کہاں سے
کبھی تو جھانک میخانے میں زاہد — نظر آجائے گی جنّت یہاں سے
مصوّرؔ آپ ہے تصویر اپنی — بنا تصویرِ گویا کی زباں سے

رہے سلامت غمِ محبت کہاں کہاں اپنے کام آیا
صنم پرستوں میں ذکر نکلا ، خدا پرستوں میں نام آیا
کہوں میں کیوں بیوفا کسی کو، وہ مجھ سے بے رُخ نہ بے خبر ہے
ہمیشہ اس کی طرف سے مجھ کو سلام پہنچا ، پیام آیا
مری طرف سے گزرنے والے نہ دیکھ مجھ کو پلٹ پلٹ کر
مَیں وہ نہیں ہوں کہ جو پکارے حضور ٹھہریں غلام آیا
سرور و مستی ہوں میں سراپا یہ راز کیا ہے خدا ہی جانے
نہ میں نے دیکھی سبو کی صورت نہ میرے حصّے میں جام آیا
لہو دیا تھا جنھوں نے اپنا رہے وہ محروم اپنے حق سے
تمام سرمایۂ بہاراں چمن فروشوں کے کام آیا
وہ دیکھو پرچم صنم کدے کا نظر میں تصویر کھنچ گئی ہے
چلو مصورؔ قدم بڑھاؤ بڑا مقدس مقام آیا

کہکشاں زیرِ گام کرلوں کیا — اتنا اونچا مقام کرلوں کیا؟
راس آیا نہ احترامِ صنم — اپنا خود احترام کرلوں کیا؟
مہ و خورشید کی طرح مَیں بھی — سفر نا تمام کرلوں کیا؟
خدمتِ خواہشات کی خاطر — ہر نفس کو غلام کرلوں کیا؟
یاس و حرماں کی ضرب سے ڈر کر — اپنا جینا حرام کرلوں کیا؟
شکر بھولوں ، شکایتیں سیکھوں — ذہنیت اپنی خام کرلوں کیا؟
عاشقانہ نماز کی خاطر — اپنے دل کو امام کرلوں کیا؟
زندگی کی بہاریں کیا کہنے — اور کچھ دن قیام کرلوں کیا؟
آگئی سامنے شبیہہ صنم — اے مصورؔ سلام کرلوں کیا؟

عبدالمجید منظرؔ مرتضیٰ پوری

عبدالمجید منظرؔ ابن شیخ امیر، مرتضیٰ پور　تعلیم : میٹرک بی۔ٹی۔سی　پیشہ : تدریس
تاریخ پیدائش : ۷؍جولائی ۱۹۱۰ء　وفات : ۱۱؍مئی ۱۹۷۵ء
"سوغاتِ منظر" (غزلیات ۱۹۶۲ء)

کبھی مہر و مہ، کبھی کہکشاں، کبھی آسماں سے گذر گیا
مری رفعتوں پہ وہ سرنگوں، مَیں تو لامکاں سے گذر گیا
کئی منزلوں کے نشاں ملے، مَیں ہر اک نشاں سے گذر گیا
مرے پیچھے پیچھے تھا کارواں، مَیں جہاں جہاں سے گذر گیا
ملا بتکدہ تو کبھی حرم، کہیں رُک سکے نہ مرے قدم
تری جستجو میں تری قسم مَیں کہاں کہاں سے گذر گیا
نہ کلی میں تھی کہیں کچھ کشش، تھے فسردہ پھول رَوِش رَوِش
مَیں نگاہ سرسری ڈال کر ترے گلستاں سے گذر گیا
نہ ہی چارہ گر کوئی مِل سکا، نہ علاجِ غم مرا ہو سکا
مجھے مِل سکی نہ دوائے دل، مَیں ہر اک دکاں سے گذر گیا
یہاں اپنے تھے، وہاں غیر تھے، عجب ایک منظرؔ یاس تھا
مَیں کبھی یہاں سے گذر گیا، مَیں کبھی وہاں سے گذر گیا

نظر پڑ جائے منظرؔ پر تو ہو برق و شرر پیدا　مگر ہوتا ہے مشکل سے بشر میں یہ ہنر پیدا
نہیں بنتا ہے تو کردار انسانی نہیں بنتا　وگرنہ یوں تو کر لیتے ہیں سب ہی مال و زر پیدا
بدل دے جو زمانے کے نظامِ پست و باطل کو　تو صدیوں بعد ہوتا ہے کوئی ایسا بشر پیدا
زمیں پر کام ہیں لاکھوں فلک پر ڈھونڈتے کیا ہو　تم اس تاریک دنیا میں کرو کوئی قمر پیدا
کہاں ملتا ہے ہر اک کو میاں وہ بے بہا منظرؔ　بڑی مشکل سے ہوتا ہے سمندر میں گہر پیدا

ظلم یاد آئے کبھی اُن کے ستم یاد آئے
یہ بجا ہے کہ بہ اندازِ کرم یاد آئے
پھیر لیں اپنوں نے غیروں کی طرح جب آنکھیں
کس قدر اُس گھڑی غیروں کے کرم یاد آئے
نہ ملا جب کسی صورت رہِ ہستی کا سراغ
کاروانوں کو مرے نقشِ قدم یاد آئے
عیش کے دن رہے غیروں کے لئے سب مخصوص
وقت جب سخت پڑا کوئی تو ہم یاد آئے
دیکھ کر غیروں کی بے لوث وفا کو منظرؔ
بے بسی میں ہمیں اپنوں کے ستم یاد آئے

مَیں پستیٔ اخلاقِ بشر دیکھ رہا ہوں
پھر نظمِ جہاں زیر و زبر دیکھ رہا ہوں
مظلوم کی آہوں کا گذر دیکھ رہا ہوں
گو، دور بہت بابِ اثر دیکھ رہا ہوں
مقصد یہ شہیدانِ وطن کا نہ تھا ہرگز
جو آج شہادت کا ثمر دیکھ رہا ہوں
یوں تو ہے ہر اِک جنس گراں ہند میں لیکن
ارزاں ہے فقط خونِ بشر دیکھ رہا ہوں
غنچوں کے لبوں پر کہاں آثارِ تبسم
ہر گُل کا یہاں چاک جگر دیکھ رہا ہوں
سچ ہے کسی مجبور کی فریاد کو منظرؔ
"دیکھا نہیں جاتا ہے مگر دیکھ رہا ہوں"

حفیظ اللہ خان بدرؔ

حفیظ اللہ خاں بدر ابن قدرت اللہ خاں کھام گاؤں ضلع ملکاپور (بلڈانہ) ایم۔اے۔بی۔ٹی
تاریخ پیدائش : ۵؍جولائی ۱۹۱۱ء وفات : ۲۲؍جنوری ۱۹۸۴ء
پرنسپل انجمن ہائی اسکول و جونیئر کالج، کھام گاؤں

یہ زخم ہائے غمِ محبت ، یہ داغ ہائے غمِ زمانہ
انھیں چراغوں کے دم سے روشن رہا ہے دل کا غریب خانہ
وہ فتنے جاگ اُٹھے آنکھ ملتے ، وہ زلزلے لے رہے ہیں کروٹ
ذرا تصور میں آگیا تھا خیالِ تعمیرِ آشیانہ
کبھی شکایت کہ بے وفا ہوں ، کبھی خفا عرضِ مدعا پر
مرے ستانے کو مل ہی جاتا ہے آپ کو کچھ نہ کچھ بہانہ
اُنھیں پہ ہے لطفِ برق و باراں ، کرم اُنھیں پر ہے باغباں کا
مرے نشیمن کے چار تنکے ہیں مرکزِ گردشِ زمانہ
یہ کہنہ سالی میں بدرؔ تم کو ، غزل سرائی کی خوب سوجھی
نہ اب وہ رنگینیٔ تخیل نہ اب وہ جذباتِ شاعرانہ

نہ یہ زمین ہے اپنی نہ آسماں اپنا — الگ بنائیں ہم اپنے لئے جہاں اپنا
خیالِ شکوۂ زنداں کے اے بادِ چمن — نہیں بہار سے کم موسمِ خزاں اپنا
چمن کا لطف ہی کیا جب کہ بال و پر نہ رہے — بنا لیا ہے قفس ہی کو آشیاں اپنا
ہیں سخت جان ہم ، ان کی کلائیاں نازک — یہ امتحان ہے اُن کا کہ امتحاں اپنا
ہے زندگی بھی یہی ، لطفِ زندگی بھی یہی — خدا کرے کہ نہ ہو ختم امتحاں اپنا

موجوں میں مزہ آتا ہو جسے گرداب سے لرزاں کیا ہوگا
جو بندۂ ساحل بن کے رہے، لذّت کشِ طوفاں کیا ہوگا

جو عمر کٹے بے کیفی میں، بے لطفی میں، بے رنگی میں
اُس قصّے کی سرخی کیا ہوگی! اُس زیست کا عنواں کیا ہوگا

روداد قفس کیا خاک کہیں، جب تک بھی رہے یہ فکر رہی
انجامِ نشیمن کیا ہوگا؟ انجامِ گلستاں کیا ہوگا

ہے اپنا جنونِ عشق فزا ہر قیدِ مکاں سے بالاتر
ممنونِ گلستاں کیا ہوگا! پابندِ بیاباں کیا ہوگا

بیگانۂ بیم و رجا ہو کر تقدیر بنائیں آپ اپنی
یہ فکر دلیلِ پستی ہے، انجامِ گلستاں کیا ہوگا

واں ضد ہے کہ بے مانگے نہ ملے، یاں حسنِ طلب بھی بدعت ہے
رحمت کیلئے بھی شرطیں ہوں تو عفو کا ارماں کیا ہوگا

یہ طرزِ جہاں، یہ خونِ وفا، یہ ہم نفسوں کی بے مہری
تکمیلِ تمنّا ہو نہ سکی تو زیست کا ساماں کیا ہوگا

رنگین جوانی ہی کب تھی، خیر اب تو بڑھاپا آیا ہے
چالیس کے پیٹھے میں آخر، اب بدرؔ غزل خواں کیا ہوگا

یہ مے خانہ برائے میکشاں ہوتا تو کیا ہوتا
انھیں کے واسطے پیرِ مغاں ہوتا تو کیا ہوتا

لٹا دی دولتِ ہوش و خرد تو مدعا پایا
ہمیں اندیشۂ سود و زیاں ہوتا تو کیا ہوتا

ہمیں تو آزمایا تم نے اور ثابت قدم پایا
رقیبِ روسیہ کا امتحاں ہوتا تو کیا ہوتا

سراپا زحمتِ بزمِ رقیباں بن کے بیٹھے ہو
کبھی ایسا برائے دوستاں ہوتا تو کیا ہوتا

نہ قیصرؔ[1] ہے نہ کیفیؔ[2] ہے نہ عاصیؔ[3] ہے نہ شائقؔ[4] ہے
کوئی اب شاعرِ شعلہ بیاں ہوتا تو کیا ہوتا

بساطِ آشیاں کیا برق! یہ تو چار تنکے ہیں
تری زد میں یہ سارا گلستاں ہوتا تو کیا ہوتا

غزل خوانی کا یہ عالم بڑھاپے میں ترا اے بدرؔ
سنؔ[5] اُنیس سو چھہتر میں جواں ہوتا تو کیا ہوتا

[1] قیصرؔ بدنیروی [2] رشید احمد کیفیؔ جگروی [3] عبدالرؤف شاہ عاصیؔ پانڈھرکیوڑہ [4] عبدالکریم شائقؔ کھامگانوی
[5] طرحی غزل ہے۔ ۱۹۷۶ء میں مشاعرہ روح افزا خاتم اردو اسکول اکولہ میں منعقد ہوا تھا۔ (مرتبین)

احمد آرمانی

شیخ احمد آرمانی نقشبندی، بالاپور (موٹر میکینک)
تعلیم : درجہ پنجم سنِ پیدائش : ۱۹۱۲ء وفات : ۱۹۶۶ء
''مخزنِ تصوف'' (شعری مجموعہ) ۱۹۸۹ء

ہستی میں اس کا جلوہ عیاں پا رہا ہوں آج
دل کو تصورات سے بہلا رہا ہوں آج

مل جائے کوئی باب خوشی کا میں اس لئے
پھر سے کتابِ زیست کو دہرا رہا ہوں آج

اب اپنا ظرفِ مئے کشی دکھلانے کے لئے
ساقی کے ہاتھوں خوب پئے جا رہا ہوں آج

محفل میں خاص ان کی عقیدت کے واسطے
ہاتھوں پہ اپنے دل کو لئے جا رہا ہوں آج

منزل پہ میں ہوں یا کہ فریبِ نظر ہے یہ
ہر سمت میں ہی خود کو نظر آرہا ہوں آج

ان کے مریضِ ہجر نے یہ کہہ کے جان دی
کل آئیں گے وہ دیکھنے، میں جا رہا ہوں آج

احمدؔ زمانہ دید کا ہے جس کی منتظر
ہر سُو میں اُس کا جلوہ عیاں پا رہا ہوں آج

آ کر کسی نے خواب میں جلوہ دکھا دیا
موسیٰ کی طرح مجھ کو بھی بے خود بنا دیا

اِک تیرِ ناز چپکے سے دل پر چلا دیا
کیا جانے کس نے خونِ تمنا بہا دیا

اس طرح میں نے کی ہے ادا رسمِ محبت
مہماں بنا کے غم کو، کلیجہ کھلا دیا

آدم کی اِک فغاں سے لرزنے لگی زمیں
جب آہ کی تو عرشِ معلی ہلا دیا

احمدؔ اسے صراحی و ساغر سے کیا غرض
ساقی نے جس کو اپنی نظر سے پلا دیا

جوشِ وحشت میں گریباں پہ نظر ہے شاید
یہی دیوانے کا سامانِ سفر ہے شاید
میں تو صرف آپ کی بدنامی کا کرتا ہوں خیال
آپ کو بھی بری رسوائی کا ڈر ہے شاید
اُن کے دامن پہ جو ٹپکا تھا خوشی کا آنسو
میں تو سمجھا تھا درخشندہ گہر ہے شاید
روندا جاتا ہے جو پیروں سے عبث مقتل میں
یہ کسی عاشقِ ناکام کا سر ہے شاید
بے پیئے ہوش فراموش ہیں سارے میکش
ان کی مخمور نگاہوں کا اثر ہے شاید
زلفِ رُخ دیکھ کے احمدؔ یہ گماں ہوتا ہے
شام کی گود میں بیتاب سحر ہے شاید

کیا ہُوا کب کہاں نہیں معلوم
کتنے اُجڑے مکاں نہیں معلوم
مجھ سے گلشن میں باغباں اتنا
کیوں ہُوا بدگماں نہیں معلوم
دل بھی غائب ہے آج پہلو سے
جانے ہوگا کہاں، نہیں معلوم
وہ ستمگر بھی حال پر میرے
کب ہُوا مہرباں نہیں معلوم
مجھ کو جوشِ جنوں نے اے احمدؔ
لا کے چھوڑا کہاں نہیں معلوم

محبوب خاں رونق

محبوب خاں رونق ابن شجاعت خاں، اکولہ

سن پیدائش : ۱۹۱۲ء وفات : ۲۷ راکتوبر ۱۹۷۳ء

کیا ستم ہے کہ ستم ہم پہ وہ کر جاتے ہیں
اپنے سائے سے جو تنہائی میں ڈر جاتے ہیں

لوٹ کے آنا ہی پڑتا ہے انھیں سینکڑوں بار
تیرے کوچے سے جو اک بار گذر جاتے ہیں

غم کے ماروں کو بھی آتی ہے کبھی خود پہ ہنسی
کبھی صحرا میں بھی کچھ پھول بکھر جاتے ہیں

یاد رہ جاتے ہیں احباب کے کچھ لطف و کرم
دن مصیبت کے بہر حال گذر جاتے ہیں

پارسائی نہ جتاؤ کہ یہ ہے میخانہ
اچھے اچھے یہاں شیشے میں اُتر جاتے ہیں

تم پشیماں نہ ہوں تم پر کوئی الزام نہیں
مرنے والے کبھی بے موت بھی مرجاتے ہیں

میری بگڑی ہوئی تقدیر بنے یا نہ بنے
"اُن کے بکھرے ہوئے گیسو تو سنور جاتے ہیں"

دفن ہو کر بھی کہیں دبتے ہیں ارمان حسیں
بن کے گُل سینۂ گلشن پہ اُبھر جاتے ہیں

جان دیدیتے ہیں جو بات کے ہوتے ہیں دھنی
اور ہوں گے جو زباں دے کے مکر جاتے ہیں

لے کے اُمید یہاں آئے تھے کیا کیا رونق
آپ کی بزم سے کیا لے کے اثر جاتے ہیں

دعویٰ ہے آزمایئے چاہے جہاں مجھے
ہوں با وفا قبول ہے ہر امتحاں مجھے

فرسودہ اہلِ عشق کے افسانے ہو گئے
لکھنی ہے طرزِ نو سے مری داستاں مجھے

زاہد نے ذکرِ خلد میں کی تھی نشاں دہی
معلوم میکدہ تھا نہ کوئے بتاں مجھے

ہر رہگذر پہ چھوڑے ہیں کچھ ایسے نقشِ پا
کہ ڈھونڈتا رہے گا ہر اک کارواں مجھے

اس منزلِ حیات میں ہے اب جنوں مرا
خواہش ہے سود کی نہ تو خوفِ زیاں مجھے

اُن کی جفا پہ کوئی انھیں ٹوکتا نہیں
تلقینِ صبر کرتا ہے سارا جہاں مجھے

رونق زمانہ کچھ بھی کہے اِس کا غم نہیں
وہ بدگماں ہیں مجھ سے، نہیں یہ گماں مجھے

سنگ دل ہے اثر اُس پہ ہوگا نہیں قصۂ غم سنانے سے کیا فائدہ
کم تو ہوتی نہیں سوزشِ زندگی آنسوؤں میں نہانے سے کیا فائدہ
راز رکھتے ہو کیوں صاف فرمایئے دل کی باتیں چھپانے سے کیا فائدہ
آس دے دے کے مایوس کرتے ہو کیوں یوں کسی کو ستانے سے کیا فائدہ
اپنی تشنہ لبی کی شکایت نہیں یہ تو ساقی گری کی بھی توہین ہے
میکشی کا تقاضا سمجھیے ذرا قطرہ قطرہ چکھانے سے کیا فائدہ
خوفِ صیاد ہے، بجلیوں کا ہے ڈر، ناموافق ہوا ہے فضا پُرخطر
جب مخالف ہے اتنے زمیں آسماں پھر نشیمن بنانے سے کیا فائدہ
آمدِ فصلِ گُل ہو مبارک تمہیں اہلِ گلشن مگر یہ تو فرمایئے
جو کسی کے گلے کی نہ زینت بنے ایسی کلیاں کھِلانے سے کیا فائدہ
چاندنی کی طرح وجہِ فرحت بنے حُسن سے کچھ ضیائے محبت ملے
برق بن کر جلادے جو دنیا مری ایسا جلوہ دِکھانے سے کیا فائدہ
راز اس میں نہیں کوئی اس کے سوا، میں جو خاموش ہوں رونقؔ بے نوا
جس سے فریاد ہے وہ تو سنتا نہیں پھر جہاں کو سنانے سے کیا فائدہ

رُخ جو بدلا غمِ زندگی نے مجھ کو اپنا لیا میکشی نے
موجِ طوفاں میں تھا کون اپنا آ کے ساحل پہ پوچھا کبھی نے
کھل ہی جاتا تھا رازِ خدائی وہ تو روکا حدِ بندگی نے
شام سے صبح تک کوئی پوچھے کیا دیا شمع کو روشنی نے
ورنہ پہچانتا کون رونقؔ مجھ کو رُسوا کیا شاعری نے

عبدالرشید کیفی

عبدالرشید خاں کیفی ابن عبدالمجید خاں، جھکر (بلڈانہ) تاریخ وفات: ۱۳ر جنوری ۱۹۷۲ء
ایم۔اے۔ایل۔ایل۔بی (علیگ)
"کیفِ رشید" (شعری مجموعہ، مرتبہ پروفیسر نورالسعید اختر) ۲۰۰۳ء

اِدھر صبا نے خبر دی آکر کہ آج ابر بہار آیا
اُدھر گریباں سیئے ہوئے مَیں چمن میں دیوانہ وار آیا
دعا ہے اپنی یہی شبِ غم، نہ ہو کبھی اضطرابِ دل کم
یہ زندگی زندگی کہاں پھر، جو دل کو اپنے قرار آیا
گلہ ستم کا جفا کا شکوہ، زباں پہ آیا تمھیں کہو کب
یہ کیوں ہے پھر ہم سے سرگرانی، یہ دل میں کیسے غبار آیا
سکون ہو کس طرح میسّر، نصیب ہو چین کیسے آخر
نہ موت آئی مریضِ غم کو، نہ وہ شبِ انتظار آیا
نہ جانے کیوں جوشِ گریہ اب کے، بجائے گھٹنے کے بڑھ رہا ہے
وگرنہ محفل سے یوں تو تیری مَیں بارہا اشکبار آیا

اُٹھ جانے پر تو جلوے تمھارے نہاں کہاں
تارِ نظر ہے پردہ، کوئی درمیاں کہاں
کُل کائنات کیا ہے بجز یاس و آرزو
دل سے زیادہ وسعتِ کون و مکاں کہاں
اُٹھتے ہیں اب نگاہ سے پردے فریب کے
مُجز درد و غم خوشی کا جہاں میں نشاں کہاں
کیفی کرشمے اپنے ہی کیفِ نظر کے ہیں
اس دہرِ بے بساط میں رنگینیاں کہاں

نشیمن جل چکا اہلِ چمن ہیں سرگراں ہم سے
قفس سے چھوٹ کر جائیں کہاں بے خانماں ہم سے
سنائیں اب انھیں کس منھ سے قصہ حسرتِ دل کا
ہوئے ہیں ایک حرفِ آرزو پر بدگماں ہم سے
جبین و سنگِ در کا تفرقہ یکسر مٹا ڈالا
قریں سجدوں نے اتنا کردیا ہے آستاں ہم سے
جلایا آشیاں ، پھونکا چمن ، پھر بھی نہ چین آیا
طلب اب اور کیا کرتی ہیں آخر بجلیاں ہم سے
کرم تھا آبلوں کا اور عنایت ساتھیوں کی تھی
ذرا سی دور منزل تھی کہ چھوٹا کارواں ہم سے
کبھی تو جذبۂ الفت دکھائے گا اثر کیفی
نہ پوچھی جائے گی کب تک ہماری داستاں ہم سے

مخمور ادائے ساقی ہے محروم دلِ ناکام نہیں
کھنچ آئی ہے میرے ساغر میں وہ مئے جو رہینِ جام نہیں
دنیائے چمن ہے پیشِ نظر پھرتا ہے سماں آنکھوں میں وہی
ہم لاکھ رہیں پابندِ قفس کچھ دل تو اسیرِ دام نہیں
کیوں داغ لہو کے دھوتے ہو، کیوں زینتِ دامن کھوتے ہو
بے کار پریشاں ہوتے ہو ، تم پر تو کوئی الزام نہیں
وہ محوِ تغافل سنتا ہے ، ہم کہتے ہیں دل کا افسانہ
کچھ باتیں ہیں بہکی بہکی سی آغاز نہیں انجام نہیں
یا ہم ہی نہیں شایانِ جفا ، یا اس کو نہیں ہے قدرِ وفا
اس بزم میں کیفی ورنہ کوئی محروم نہیں ناکام نہیں

محمد اسحٰق افسر آفاقی

محمد اسحٰق افسر آفاقی ابن فتح محمد، کھامگاؤں (بلڈانہ)
تاریخ پیدائش: ۲ر فروری ۱۹۱۶ء
ایم۔اے۔بی۔ایڈ　　موظف صدر مدرس گورنمنٹ اکیڈمک ہائی اسکول امراؤتی
"افکارِ افسر" (مجموعۂ کلام) ۱۹۸۶ء

ترے کرم نے وہ دیوانگی عطا کی ہے　　کہ جس نے تیری ہی تشہیر جابجا کی ہے
ابھی سے آپ کی آنکھوں میں آ گئے آنسو　　ابھی تو میں نے فسانے کی ابتدا کی ہے
رہے تو ہم رہے دار و رسن کے دیوانے　　ہمیں نے پرورشِ جذبۂ انا کی ہے
ادا شناس محبت کو حق ہے جینے کا　　حیات ہے تو دلِ درد آشنا کی ہے
جبیں کو جزوِ درِ یار کر کے چھوڑ دیا　　نماز میں نے ادا کی تو یوں ادا کی ہے
حضور اپنا سفینہ نہ ڈوبتا ہرگز　　یقین کیجئے سازش یہ ناخدا کی ہے
جنونِ سجدہ طرازی میں کس کو ہوش افسرؔ　　کہاں نماز پڑھی اور کب دعا کی ہے

کسی سورج سے ہم کو رم نہیں ہے　　ہماری زندگی شبنم نہیں ہے
سرشکِ غم کی حسرت چھوڑ غنچے!　　یہ کوئی قطرۂ شبنم نہیں ہے
سلامت نشترِ غم کی سیاست　　مرا دل خوگرِ ماتم نہیں ہے
جراحت خیز ہے رنگِ تمنا　　یہ اک نشتر تو ہے مرہم نہیں ہے
گلو! جبراً ہنسو پی جاؤ آنسو　　یہ گلشن ہے صفِ ماتم نہیں ہے
تلوّن اور پھر دستِ جنوں کا　　کوئی تعمیر مستحکم نہیں ہے
تمھارا غم بہر صورت ہے پیارا　　ہمیں احساسِ بیش و کم نہیں ہے
مرے زخمِ جگر ناسور بن جا　　تری تقدیر کا مرہم نہیں ہے
نظامِ عقل کی تقدیر افسرؔ　　مزاجِ دل ابھی برہم نہیں ہے

گلوں کو بخش کے زخموں کی تازگی میں نے
بہارِ مردہ میں اک جان ڈال دی میں نے

فراقِ یار میں ہر سانس عمرِ خضر ہوئی
حیات پائی ہے قسمت سے دائمی میں نے

جلا کے اپنے ہی ہاتھوں سے تنکے تنکے کو
مٹائی بختِ نشیمن کی تیرگی میں نے

نہ جانے کونسی منزل ہے دل کے پیشِ نظر
کہ خاکِ عالمِ امکاں تو چھان لی میں نے

ٹپک کے بہہ گئے قلب و جگر بھی آنکھوں سے
مذاقِ گریہ کو سمجھا تھا اک ہنسی میں نے

سرِ نیاز درِ ناز سے اُٹھا نہ سکا
کی ایک سجدہ میں تکمیل بندگی میں نے

مچل کے رہ گئے آغوشِ چشم میں آنسو
تڑپ کے ضبطِ محبت کی داد دی میں نے

یہاں تو مرگِ مسلسل سے پڑ گیا پالا
الٰہی زندگی مانگی تھی زندگی میں نے

نہ مل سکا کہیں مطلوبِ بندگی افسرؔ
تجلیات کی دنیا بھی دیکھ لی میں نے

کشاکش سے ہستی کی دامن چھڑائیں
چلو نا اجل ہی سے رشتہ جڑائیں

وہ نغمہ مرا، میری لَے میں سنائیں
جوانی کو پُرکیف و رنگیں بنائیں

خدارا یہ آنکھیں نہ آنسو بہائیں
کسی کی نظر سے نہ مجھ کو گرائیں

سفینہ ڈبونا ہے موجوں کی فطرت
تو کیا ناخدا کیا موافق ہوائیں

تو خوددار بن جا اے شوقِ نظارہ
وہ خود بام پر آئیں تجھ کو بلائیں

چلو نا کہیں دور دنیا سے چل کر
الگ اپنی دنیائے الفت بنائیں

خزاں آشنا ہوں میں افسرؔ مجھے کیا
بہاریں گلستاں میں آتی ہیں آئیں

زمانے کی چالیں سمجھتے ہیں افسرؔ
اب ایسے نہیں ہم کہ دھوکے میں آئیں

بشیر احمد شہیدؔ

بشیر احمد شہیدؔ ابن مولوی نور محمد، اکولہ
تاریخِ پیدائش : یکم جولائی ۱۹۱۶ء	وفات : ۲۶ دسمبر ۱۹۸۳ء
تعلیم : ایم۔اے۔بی۔ٹی	ملازمت : درس وتدریس موظف بحیثیت صدر مدرس اکولہ
"شباب وشیب" ۱۹۸۳ء "فکروفن" ۱۹۸۵ء

بہاروں میں بھی جلتے آشیاں دیکھے نہیں جاتے
دہکتے گُل سُلگتے گلستاں دیکھے نہیں جاتے

نکل کر بزمِ گل سے نکہتیں آوارہ پھرتی ہیں
فضاؤں میں بھٹکتے کارواں دیکھے نہیں جاتے

یہاں انسان سے انساں تو ہیں سہمے ہوئے لیکن
خدا سے بھی یہ بندے بدگماں دیکھے نہیں جاتے

نمازیں چیختی ہیں ، مسجدیں فریاد کرتی ہیں
عقیدت کو ترستے آستاں دیکھے نہیں جاتے

یقیں دوستی ہو تو صداقت دیکھ سکتے ہیں
گروہوں کے پردے درمیاں دیکھے نہیں جاتے

بڑی دلچسپ سرگرمی ہے بازارِ سیاست کی
مگر بکتے ہوئے ایماں یہاں دیکھے نہیں جاتے

شہیدؔ اہلِ خرد کی دور اندیشی بجا لیکن
اُمید وبیم کے سود و زیاں دیکھے نہیں جاتے

ساقی سے نہیں بڑھ کے کوئی نبض شناس اور
برسات میں دے دیتا ہے دو چار گلاس اور

دل میں ہو اگر سوزِ تمنا کی حرارت
ارمان کی تائید میں بڑھ جاتی ہے آس اور

جب اونگھنے لگتی ہے ارادوں کی جوانی
ہستی کے سمن زار بھی ہوتے ہیں اداس اور

ہے روپ کہ بہروپ ہے انسان کا یہ بھی
ہندو کا لباس اور ہے مسلم کا لباس اور

نیرنگیِ ہستی ہے کہ یہ گلشنِ ہستی
ہر پھول کا رنگ اور ہے ہر پھول کی باس اور

کیا مانگئے ایام سے امید ہی کیا ہے
گردش کے سوا کچھ نہیں ایام کے پاس اور

انکار ہی بہتر ہے شہیدؔ ایسے کرم سے
دو گھونٹ سے کیا ہوتا ہے بڑھ جاتی ہے پیاس اور

نکھرے ہوئے عارض ہیں بکھرے ہوئے گیسو بھی
اے اہلِ نظر دیکھو جلوہ بھی ہے جادو بھی
موسم کی طرح ان کے تیور بھی بدلتے ہیں
پھر جاتی ہیں نظریں بھی تن جاتے ہیں ابرو بھی
اظہارِ تمنّا پر ہنس ہنس کے 'نہیں' کہنا
انکار میں شامل ہے اقرار کا پہلو بھی
اے عشق بتا تو ہی یہ کون سا عالم ہے
ہونٹوں پہ تبسم ہے آنکھوں میں ہیں آنسو بھی
گلشن میں بھی دیوانو ، صحرا کے مزے لوٹو
گردش میں ہے بزمِ گُل آوارہ ہے خوشبو بھی
سچ ہے کہ مرا دامن آلودہ ہے اے واعظ
یہ جھوٹ نہیں لیکن بے داغ نہیں تو بھی
اربابِ سیاست سے کہنا ہے شہیدؔ اتنا
اربابِ محبت کا شہکار ہے اردو بھی

دل کے ہر داغ کو سینے سے لگائے رکھئے
خانۂ دل میں یہ فانوس جلائے رکھئے
زندگی وقت کے سانچے میں ڈھلی جاتی ہے
دیدہ و دل کو قرینے سے سجائے رکھئے
شامِ غم کا جو فسانہ تھا وہ اب ختم ہُوا
صبحِ اُمید کا ماحول بنائے رکھئے
اپنے اخلاص ومحبت کے ہیں قائل سب لوگ
زندگانی کا یہی رنگ جمائے رکھئے
مَیں ابھی چپکے سے پی آتا ہوں میخانے سے
زاہدوں کو ذرا باتوں میں لگائے رکھئے
رازداں اپنا فرشتہ نہیں انساں ہی تو ہے
دل کے ہر راز کو دل میں ہی چھپائے رکھئے
یہ جو ہے فرصتِ امروز غنیمت ہے شہیدؔ
آج کے کام کو کل پر نہ اُٹھائے رکھئے

ابراہیم خلیل

محمد ابراہیم خاں خلیل، ملکاپور (بلڈانہ)

سنِ پیدائش : ۱۹۱۶ء	وفات : ۱۳ر دسمبر ۱۹۹۲ء

''گلزارِ خلیل'' (تین جلدوں میں اور قلمی نسخے) غزلیں (غیر مطبوعہ)

ترے خیال کی جنت میں کھو گیا ہوں میں
اب اپنے آپ کو رہ رہ کے ڈھونڈتا ہوں میں

ہجومِ شورشِ جلوہ سے آشنا ہوں میں
اک اجنبی سا الگ دور جا کھڑا ہوں میں

حریمِ ناز میں بے وقت آ گیا یہ بجا
حضور سوچیں تو کیا کوئی دوسرا ہوں میں

شبِ فراق میں اک آس لے کے وعدوں کی
چراغِ اشک لئے راہ پر کھڑا ہوں میں

تشددِ غمِ ہستی کو دے کے سب نغمے
خلیل آج تو اک سازِ بے صدا ہوں میں

ہجر کی شب جو طبیعت کبھی گھبرائی ہے
تو نہ آیا تو تیری یاد بہت آئی ہے

پُر خطر کتنی یہ ماحول کی تنہائی ہے
دل سے اک بات نہ نکلی تھی کہ اک آئی ہے

دستِ الفت دلِ بے کل کی طرف یوں لائے
کوئی سمجھے یہ ترا ناز ہے انگڑائی ہے

حادثے ہیں ابھی کتنے اسی خطرے کے تحت
اس میں رسوائی ہے، اس میں تری رسوائی ہے

وہ ترے سر کی قسم کھاتے ہیں یعنی کہ خلیل
ایک کافر نے مسلماں کی قسم کھائی ہے

اٹھو اس شان سے کہ وقت کے دھارے بدل ڈالو
نگاہیں تھک چکیں جن سے وہ نظارے بدل ڈالو
زمانہ تشنہ کامِ امن ہے تسکیں کا بھوکا ہے
چلو ظلم و تشدد خیز گہوارے بدل ڈالو
تمہارے ہاتھ میں آنے کو ہے پھر گردشِ دوراں
عزائم اپنے بھی کچھ اے مرے پیارے بدل ڈالو
یہاں تو سب کو جینا ہے، سبھی کو جینے دینا ہے
طریقہ وہ، جو اپنا یہ بھی حق مارے بدل ڈالو
خلیل اک جان ہو جانا ضروری ہے زمانے میں
خلل انداز شیرازے کے شہ پارے بدل ڈالو

رُخ پہ اپنے نقاب رہنے دے
درمیاں اک حجاب رہنے دے
سعیِ پیہم کی سسکیوں پہ نہ جا
شوق میں پیچ و تاب رہنے دے
دل کا آئینہ ہے جواب ترا
ہے بھی تو لاجواب رہنے دے
جرم میرے، کہاں تری رحمت
یہ حساب و کتاب رہنے دے
پھر کہیں کھو کے رہ نہ جائے خلیل
اذنِ چنگ و رباب رہنے دے

نزاکت اللہ خاں فیضی

نزاکت اللہ خاں فیضی ابن کرامت اللہ خاں افگر، ملکاپور (بلڈانہ)
ایچ۔ایس۔سی ڈپلوما ان ٹیکسٹائل سنِ پیدائش: ۱۹۱۷ء وفات: ۱۸ رجون ۱۹۹۸ء

مری نظر بس مری نظر تھی مگر تمھاری نظر سے پہلے
وجود سے اپنے بے خبر تھا مگر تمھاری خبر سے پہلے
یہ شب کی تاریکیاں بھی کب سے ترے ہی جلوے کی منتظر ہیں
مگر اے خورشیدِ تاباں تیری ضیاء ہو کیونکر سحر سے پہلے
رہے ہو پابند رسم کہنہ کے میکدے میں بھی تم وگرنہ
نگاہ ساقی میں تھا اشارہ بتاؤ! دوں میں کدھر سے پہلے
ہجوم ہے میکشوں کا ساقی تری بھی دریا دلی کی خاطر
ہر ایک لب پر یہی صدا ہے اِدھر سے پہلے، اِدھر سے پہلے
جہاں کو ہم نے، لہو سے اپنے، یہ بزم آرائیاں عطا کیں
کہاں تھی یہ روشنی بتاؤ ہمارے خونِ جگر سے پہلے
نگر ہوا جل کے خاک سارا، کسے خبر ہے، خیال کس کو
ہمیں پتہ ہے تو صرف اتنا لگی تھی آگ اپنے گھر سے پہلے
چلوں گا میں ساتھ کارواں کے مگر ذرا ٹھہر جاؤ فیضی
کہاں لٹے گا یہ کارواں پھر، یہ پوچھ لوں راہبر سے پہلے

ترے در کے سوا سجدوں کو بہلانے کہاں جاتے
بجز دشتِ محبت دل کو بہلانے کہاں جاتے
تری بے التفاتی کا کرم ہم پر ہوا ورنہ
مشیت رزق پہنچاتی نہ گر افلاس میں مجھ کو
غنیمت ہے جو رکھ لی بیکسی کی لاج موجوں نے
خود اپنی بستیاں ویران کر کے جوشِ وحشت میں
اجل کو رحم آیا بے کسوں کے حال پر فیضی

ہم آخر عقدۂ مشکل کو سلجھانے کہاں جاتے
جنھیں ٹھکرا دیا تو نے وہ دیوانے کہاں جاتے
دلِ غم آشنا کو غم سے بہلانے کہاں جاتے
تو میرے نام کے لکھے ہوئے دانے کہاں جاتے
مری میت کو ورنہ لوگ دفنانے کہاں جاتے
نہ جاتے چاند پر تو پھر یہ دیوانے کہاں جاتے
وگرنہ بزم سے اُٹھ کر یہ دیوانے کہاں جاتے

جھونپڑوں پر مفلسی کے خوب چلاتی ہے دھوپ
ہاں مگر دیکھا کہ زرداروں سے شرماتی ہے دھوپ
گردشوں سے تھک کے گھر میں جب پڑا رہتا ہوں میں
صحنِ خانہ میں مرے تلووں کو سہلاتی ہے دھوپ
چھین لیتی ہے کبھی چہروں سے کل شادابیاں
اور کبھی ٹھٹھرے ہوئے جسموں کو گرماتی ہے دھوپ
پھیرتی ہے بستیوں پر ہاتھ جتنے پیار سے
طیش میں اتنے ہی صحراؤں پہ بل کھاتی ہے دھوپ
رحم کا احساس تک فطرت میں اس کی ہے گناہ
برہنہ جسموں پہ اکثر آگ برساتی ہے دھوپ
برہنہ پا دھوپ کو روندے جو کوئی نازنیں
اپنی اس توہین پر بھی تلملا جاتی ہے دھوپ
چھت نہ ہونے سے اندھیروں کا نہیں ہوتا گذر
گھر میں فیضی کے مگر ہمدم اتر آتی ہے دھوپ

خلوص و پیار گر اہلِ چمن کے درمیاں ہوتا
چمن میں رہنا ہم کو کس لئے بارِ گراں ہوتا
چھپا رکھا اجل کی آنکھ سے اس ناتوانی نے
دگرنہ پیکرِ خاکی یہ جنت آشیاں ہوتا
فضیلت اس کو ثابت کرنی تھی انسان کی ورنہ
رسول آتے نہ دنیا میں نہ صحرا گلستاں ہوتا
لٹا کر دولتِ ہوش و خرد یہ مدعا پایا
ہمیں اے کاش کچھ اندازۂ سود وزیاں ہوتا
بساطِ آشیاں، اے برق! کیا، دو چار تنکے تھے
مزہ تو جب تھا تیری زد میں سارا گلستاں ہوتا
عدالت میں ضرورت ہی نہ تھی جھوٹی گواہی کی
اگر جو خنجرِ قاتل، حقیقت کی زباں ہوتا
نہ کرتے نفرتوں کی تخم ریزی ہم اگر فیضی
تو یہ ہندوستاں اپنا وہی جنت نشاں ہوتا

شیخ حسن مشکل افکاری

شیخ حسن مشکل افکاری ابن شیخ محبوب، گوندھنا پور (بلڈانہ)

سنِ پیدائش : ۱۹۱۵ء　صحافی : ''آوازِ جدید'' ہفتہ وار اخبار

مری نظر سے گذرنے والے پیام کب تک سلام کب تک
عنایتِ دلبری کہاں تک، نوازشِ خاص و عام کب تک
یہ فرصتِ اہتمام کب تک، یہ زحمت گام گام تک
یہ دل کی دنیائے نرم و نازک رہے گی مشقِ خرام کب تک
پیام آتے رہیں گے آخر اسیر الفت کے نام کب تک
یہ اضطرابِ غمِ محبت رہے گا یوں تشنہ کام کب تک
یہ مہکا مہکا سا کیف ساماں شباب تیرا شراب میری
بھری نظر سے پلانے والے یہ زحمت جام جام کب تک
نہ میری منزل نہ میرا جادہ مذاق فطرت یہ کیا تماشا
خرد کی یہ گم رہی کہاں تک جنوں کا یہ فیض عام کب تک
یہ تیرا روشن سا ایک عالم یہ میری تاریکیٔ شبِ غم
ترے ہی جلوؤں سے پوچھتا ہوں یہ صبح کب تک یہ شام کب تک
مری تمنا بھی اور کب تک رہینِ ذوقِ طلب رہے گی
مری محبت مرا ہی جینا کرے گی مجھ پر حرام کب تک
کسی کا، لیکر بھی نام دنیا کبھی تو آخر کرے گی چرچے
رہے گا میرا ہی نام مشکلؔ زباں زدِ خاص و عام کب تک

واقف ہیں بیخودی سے نہ اپنی خودی سے ہم
شاید کہ بے خبر ہیں ابھی زندگی سے ہم
بیٹھے ہیں تیری بزم میں کس سادگی سے ہم
جیسے کہ آشنا ہی نہیں ہیں کسی سے ہم
جو آج تک ہُوا نہ کبھی خضر کو نصیب
وہ کام لے رہے ہیں ابھی گمرہی سے ہم
اک تیرے غم سے پیار ہمیں کیا ہُوا اے دوست
دنیا کا غم خرید رہے ہیں خوشی سے ہم
مشکلؔ اگرچہ عزم کریں پختگی کے ساتھ
نظمِ چمن بدل کے رہیں آج ہی سے ہم

ہر موجِ بلا سے ہم اپنی جب کشتیٔ دل ٹکراتے ہیں
طوفان کی نبضیں ڈوبتی ہیں ساحل کو پسینے آتے ہیں

ہم ان کی محفل میں اپنا افسانۂ غم دہراتے ہیں
دل اور تڑپنے لگتا ہے جب دادِ وفا کچھ پاتے ہیں

آلامِ جہاں کے اس دل پر کیا مشقِ ستم فرماتے ہیں
ناگن کی طرح بل کھاتے ہیں سانپوں کی طرح لہراتے ہیں

تشہیر و نمائش کی گویا پرواز سے دل بہلاتے ہیں
دنیا میں کئی ایسے ہیں جنھیں سُرخاب کے پَر لگ جاتے ہیں

ہر طرزِ ستم پر ہنس ہنس کر ہر جور و جفا پر رو رو کر
دیوانے ترے دنیا کو ابھی آدابِ وفا سمجھاتے ہیں

کہرام سا اُٹھتا جاتا ہے اک حشر بپا ہوجاتا ہے
غلطی سے اگر دو اشک مرے دامن پہ کہیں گر جاتے ہیں

ہر برق تڑپ کر کہتی ہے تخریب کا رشتہ مجھ سے ہے
تعمیرِ نشیمن کی خاطر گلشن میں جہاں بھی جاتے ہیں

اک جذر و مد کا عالم بھی وابستۂ قسمت ہوتا ہے
انسان وہیں کچھ پاتا ہے احساس جہاں تڑپاتے ہیں

دنیا میں ابھی تک باقی ہیں جابر بھی کئی ، ظالم بھی کئی
حیرت تو یہی ہے اے مشکلؔ انسان سبھی کہلاتے ہیں

گری ہے برق چمن میں کہاں نہیں معلوم
چمن پھنکا کہ جلا آشیاں نہیں معلوم

کسی کو دل ترا دردِ نہاں نہیں معلوم
کہاں ملے گی تجھے اب اماں نہیں معلوم

بدل رہا ہے یہ نظمِ حیات ہی اپنا
کہ ہو رہی ہے محبت جواں نہیں معلوم

یہ جانتا ہوں فقط جل رہا ہے دل میرا
نکل رہا ہے کہاں سے دھواں نہیں معلوم

بھٹک رہا ہوں ہر اک رہ گذر سے وارفتہ
کدھر ہے گرد کہاں کارواں نہیں معلوم

دلِ خراب کو اب فرصتِ تلاش کہاں
خلش ضرور ہے لیکن کہاں نہیں معلوم

گذر رہا ہوں جنوں کی جلو میں اے مشکلؔ
یہ ذوق لے کے چلا ہے کہاں نہیں معلوم

خلیل الہدیٰ شارقؔ نیازی

خلیل الہدیٰ خاں شارقؔ نیازی ابن محمد حیات خاں مظہر، امراوتی
تاریخ پیدائش : یکم جولائی ۱۹۱۷ء وفات : ۲۸ مئی ۱۹۷۸ء
ایم۔اے (اردو، فارسی) پرنسپل اردو ڈی۔ایڈ کالج، بالاپور
"صبح کا ساقی" (شعری مجموعہ) تعلیم و تنقید (مضامین) "مرقع اردو" "بہارستان" مدیر

کہیں آنے کے ہیں نہ جانے کے — ہم ہیں نقشِ قدم زمانے کے
تیلیاں جب قفس کی ٹوٹی ہیں — کام آئی ہیں آشیانے کے
کس قدر زندگی سے ملتے ہیں — چند حصے مرے فسانے کے
آج تک خواب کا سا عالم ہے — خواب دیکھے تھے کس زمانے کے
چند آنسو متاعِ دیدہ و دل — نذرِ غم ہوگئے زمانے کے
زُلفِ برہم ہے' آپ کس کے لیے — ہو رہے آئینے کے شانے کے
جو سنائے نہ جا سکیں شارقؔ — وہی افسانے ہیں سنانے کے

ہم نے بتوں کو رام کیا' تم نے کیا کیا ؟ — ہم نے خیالِ خام کیا' تم نے کیا کیا ؟
ہم نے تو پائے نازکِ جاناں پہ جان دی — سجدہ کیا' قیام کیا' تم نے کیا کیا ؟
دیوانگی میں ہوش کی باتیں کیا کیے — ہم نے یہ اہتمام کیا' تم نے کیا کیا ؟
گہرے ہیں گھاؤ دل کے پہ تم سے گلہ نہیں — یہ تو زباں نے کام کیا' تم نے کیا کیا ؟
کس سادگی سے کہتے ہیں مرجائیں اہلِ دل — ہم نے تو قتلِ عام کیا' تم نے کیا کیا ؟
وعدے کی صبح شام ہوئی پھر بھی تم نہ آئے — ہم نے سحر کو شام کیا' تم نے کیا کیا ؟
کیوں ناتمام رہ نہ گئی دل کی داستاں ! — قصہ کہاں تمام کیا' تم نے کیا کیا ؟
شارقؔ سلام اُس نے لیا' ہاں لیا ضرور — کس شخص کو سلام کیا' تم نے کیا کیا ؟

اسیرِ شام و سحر انقلاب پیدا کر　　تو سینہ چاک سہی ، آفتاب پیدا کر
سکونِ دل کو فریب اُمید کیا کم ہے　　جو تشنگی ہے مقدر ، سراب پیدا کر
کہاں وہ شوق کہاں وہ فریب کاریٔ شوق　　کہیں سے پھر وہی عہدِ شباب پیدا کر
تڑپ تڑپ کے دلِ بیقرار رہ جائے　　کچھ اور زُلفِ سیہ پیچ و تاب پیدا کر
نہیں جو جلوۂ یوسف نہیں سہی شارقؔ　　نظر فریب زلیخا کا خواب پیدا کر

عشرت کا خیال آئے اور دل میں ملال آئے　　یوں جسکا خیال آئے خاک اسکا خیال آئے
پیغامِ بہار آئے مجبورِ قفس تک کیوں　　کیوں عشرتِ رفتہ کا اب دل میں خیال آئے
ساقی تری محفل میں اندیشۂ فردا کیا　　ساغر لئے تو آئے اور فکر مآل آئے
کچھ ہوش نہیں ہم کو پیمانِ وفا کیا تھا　　ہم صبحِ ازل ہی سے سرمستِ خیال آئے
معلوم نہیں شارقؔ کیوں چاک گریباں ہیں　　پھولوں سے کوئی پوچھے کیا ہو کے نہال آئے

قاضی سیّد خورشید الدین خورشیدؔ

قاضی سیّد خورشیدؔ الدین ابن قاضی سیّد فخر محی الدین اچل پور ملازمت : پاکستان ریلوے
پیدائش : یکم مارچ ۱۹۱۰ء وفات : ۱۵؍ اکتوبر ۱۹۹۴ء
کُل تصانیف : تیرہ (۱۳) آٹھ شعری مجموعے
"مدوجزر" "جنونِ خرد" "تانے بانے" "ایک آئینہ چار عکس"

پھیلے ہوئے ہیں سائے در و بام پر ابھی
اُبھری نہیں ہے عظمتِ نورِ سحر ابھی

کیوں جذبۂ طلب کو نہیں شوقِ جستجو
جلتے تو ہیں چراغ سرِ رہگذر ابھی

خود ہی جو بڑھ کے تھام لیں دامن حیات کا
اتنے کہاں ہیں اہلِ جنوں معتبر ابھی

اے رہروانِ راہِ تمنا بڑھے چلو
پہنچے نہیں ہو منزلِ مقصود پر ابھی

کتنے بجھے بجھے سے ہیں شعلے حیات کے
کتنے اُداس اُداس ہیں شام و سحر ابھی

کتنا بدل گیا ہے شعورِ مذاقِ غم
کتنے فریب دیتے ہیں اہلِ نظر ابھی

ہے کائناتِ عظمتِ شدّاد جلوہ گر
انسانیت سسکتی ہے ہر گام پر ابھی

ہیں دامنِ خزاں میں بہاروں کی عظمتیں
نا آشنا سکوں سے ہیں اہلِ ہنر ابھی

خورشیدؔ جس سے ظلمتِ شب فیضیاب ہو
آنکھوں سے دور ہے وہ ضیائے سحر ابھی

جلوؤں کا حسیں رنگِ تغافل بھی وہی ہے
جذبات کی بکھری ہوئی محفل بھی وہی ہے

اب تک ہیں وہی کشمکشِ زیست کے انداز
طوفاں بھی وہی دوریٔ ساحل بھی وہی ہے

کیوں سرد ہے ہر دل میں تری دید کا ارماں
محفل بھی وہی گرمیٔ محفل بھی وہی ہے

پھر کیوں جرسِ وقت کی آواز ہے خاموش
رہبر بھی وہی جادہ و منزل بھی وہی ہے

کیوں سرد ہیں وارفتگیٔ شوق کے انداز
بکھرے ہوئے جلوے بھی وہی دل بھی وہی ہے

کیوں جلوے پریشان نہیں آج سرِ طور
موسیٰ بھی وہی جذبۂ کامل بھی وہی ہے

اٹھتی نہیں کیوں میکدہ بردوش گھٹائیں
ساقی وہی پیمانہ وہی دل بھی وہی ہے

آتی نہیں آواز اسیرانِ وفا کی
زنداں بھی وہی طوق و سلاسل بھی وہی ہے

ہر عزم تمنا کو نئی راہ جو بخشے
خورشیدؔ کے افکار کا حاصل بھی وہی ہے

ہم نے چاہا تھا جنھیں شوق سے ارمانوں سے
وہ بہاریں نہیں وابستہ گلستانوں سے

عظمتِ فطرتِ ادراک بدل جاتی ہے
کام بگڑے ہوئے بن جاتے ہیں دیوانوں سے

قہقہے درد کی تمہید بھی ہو سکتے ہیں
بجلیاں بھی کبھی ٹکراتی ہیں کاشانوں سے

موت اُن کے لئے پیغامِ بقا ہوتی ہے
کھیل جاتے ہیں جو بے ساختہ طوفانوں سے

کس قدر پست ہُوا فطرتِ آدم کا وقار
آج انسان لرز اُٹھتا ہے انسانوں سے

اور بڑھ جاتا ہے اندازِ جنوں کا عالم
جب بھی دیوانے الجھتے ہیں گریبانوں سے

میکشی نام ہے پینے کا نگاہوں سے مدام
ہم نے پینا نہیں سیکھا کبھی پیمانوں سے

کس قدر فطرتِ بیباک کی خو بدلی ہے
عزمِ محمود لرزتا ہے صنم خانوں سے

ہم رہے دہر میں آزردۂ ساحل خورشیدؔ
ناخدا سے کبھی اُلجھے کبھی طوفانوں سے

ہر شخص اسیرِ غمِ دوراں نہیں ہوتا
ہر اہلِ جنوں چاک گریباں نہیں ہوتا

ہر کنج قفس رشکِ بہاراں نہیں ہوتا
ہر پھول متاعِ چمنستاں نہیں ہوتا

کرتے ہیں جو منجدھار سے ساحل کا تماشا
اُن کو کبھی اندیشۂ طوفاں نہیں ہوتا

ہر رات کے دامن میں نہیں نورِ سحر کا
ہر نورِ سحر کیف بداماں نہیں ہوتا

ہر زخم کو رسنے کی تمنا نہیں ہوتی
ہر دردِ زبوں کیش نمایاں نہیں ہوتا

ہر غم کے لیے اذنِ تبسم نہیں لازم
ہر ایک تبسم غمِ انساں نہیں ہوتا

ہر ذرہ نہیں ہوتا ہے خورشیدؔ کا پَر تو
خورشید ہر اک ذرہ بداماں نہیں ہوتا

اسمٰعیل خاں طالبؔ

اسمٰعیل خاں طالبؔ ابن بڈھن خاں، اکولہ　　تاریخ پیدائش : یکم مارچ ۱۹۱۸ء

تعلیم : انٹرمیڈیٹ　　پیشہ : سائیکل ڈیلر

''زاویے'' (شعری مجموعہ) ۱۹۸۲ء

لطیف بن کے مہک جو گُل و سمن میں رہے　کہیں تمھیں تو نہیں پردۂ چمن میں رہے

زلیخا ہوتی ہے رُسوا بھی پاک دامانی !　اُلجھ کے لاکھ جو یوسف کے پیرہن میں رہے

بجھا ہو دل ہی تو اس جستجو سے کیا حاصل　کوئی ہو پھول کسی گوشۂ چمن میں رہے

جنوں قسم ہے تجھے بات ہوش کی جب ہے　کہ ایک تار بھی باقی نہ پیرہن میں رہے

خدا سے کرکے دعا تم کو مانگ ہی لینگے　زباں ہماری سلامت اگر دہن میں رہے

سخن کی بزم پہ موقوف کچھ نہیں طالبؔ　رہے ہیں روحِ رواں ہم جس انجمن میں رہے

رسم ہوتی ہے مری اب بھی ادا میرے بعد　خاک اُڑاتی ہے بیاباں میں صبا میرے بعد

عشق کو میرے، جنوں کہہ کے نوازا تم نے　ہائے رُسوا مجھے، کیا کیا نہ کیا میرے بعد

اب مری طرح کسے کھینچ کے شامت لائی　کون ہے حاملِ بیداد و جفا میرے بعد

ابر تو چھاتے ہیں مے خانے پہ اب بھی لیکن　لطف معدوم، مکدّر ہے فضا میرے بعد

میرے جاتے ہی گلستاں پہ اُداسی چھائی　پھول تو پھول ہیں سبزہ نہ اُگا میرے بعد

پوچھنے والا ہی تھا کون جہاں میں طالبؔ　نام بھی مٹ گیا، اچھا ہی ہُوا میرے بعد

نظر ہر شئے کو ہر ذرّہ کو اپنا دل سمجھتا ہوں
اسی دیوانگی کو ہوش کا حاصل سمجھتا ہوں

ڈبویا جذبۂ معصوم کی اس خوش فریبی نے
مجھے دادِ وفا دیں گے سرِ محفل سمجھتا ہوں

علاجِ درد کس کافر کو ہے درکار چارہ گر
محبت کی امانت ہے اِسے میں دل سمجھتا ہوں

طبیعت ہوگئی ہے اس قدر خوگر حوادث کی
سفینہ موج کو ، طوفان کو ساحل سمجھتا ہوں

بچھا دیتا ہوں طالبؔ اپنی آنکھیں اس کی راہوں میں
کسی اہلِ ہنر کو جب بھی اس قابل سمجھتا ہوں

کہیں زاغ کی رسائی کسی گوشۂ چمن میں
کہیں خواب تو نہیں ہے مرا ذکر انجمن میں

مَیں کبھی حریمِ گُل میں ، کبھی گوشۂ چمن میں
تجھے ڈھونڈتا رہا ہوں مَیں ہر ایک انجمن میں

وہ لطیف کیفیت جو تری چشم کی عطا ہے
یہ ودیعتِ الٰہی کہاں بادۂ کہن میں

وہ حسیں جواں تھے کتنے ، مری زندگی کے حاصل
جو ملے تھے چند لمحے مجھے تیری انجمن میں

نہیں عزم جس کا تنہا مَیں وہ رہروِ عدم ہوں
مرے دل کی حسرتیں بھی مرے ساتھ ہیں کفن میں

سرِ بزم اُن کی مجھ پر جو نوازشِ کرم ہے
مرے حاسدوں کے طالبؔ لگی آگ تن بدن میں

عبدالرؤف شاہدؔ انصاری

عبدالرؤف شاہدؔ انصاری ابن شیخ احمد مرشد انصاری، اکولہ

تاریخِ پیدائش: ۷؍ جولائی ۱۹۱۸ء

''جلتا ہوا ساون'' ۱۹۷۰ء ''مشاہدات'' ۱۹۸۰ء ''سیلِ رواں'' ۱۹۸۳ء (شعری مجموعے)

''طیبات'' ۱۹۸۹ء (مجموعہ نعت و منقبت)

یہ کس نے کہہ دیا ناکامیوں کا غم نہیں ہوتا
بہت ہوتا ہے لیکن شوقِ منزل کم نہیں ہوتا

یقیناً آپ کے وعدوں میں کوئی دم نہیں ہوتا
مگر یہ بھی حقیقت ہے بھروسہ کم نہیں ہوتا

بجا ہے آپ پھر آمادہ ہیں ترکِ تغافل پر
مگر اب مجھ سے عرضِ مدعا پیہم نہیں ہوتا

خزاں کی چیرہ دستی سے نہ گھبراؤ چمن والو
جہانِ زندگی میں ایک ہی موسم نہیں ہوتا

تعجب سے مرے پیروں کے چھالے دیکھنے والو
رہِ ہستی میں فرشِ سبزہ و شبنم نہیں ہوتا

میں گرتا ہوں سنبھلتا ہوں قدم آگے بڑھاتا ہوں
مری ناکامیوں میں یاس کا عالم نہیں ہوتا

کہاں کی بندگی شاہدؔ اسے حسنِ طلب کہیے
کسی کے آستاں پر سر کسی کا خم نہیں ہوتا

شیرازۂ حیات کی ہر شے بکھر گئی
کیا ہوگیا وفا کو محبت کدھر گئی

میری شبِ فراق کا عالم نہ پوچھیے
قلب و نظر پہ ایک قیامت گذر گئی

کیا کیجیے شکایتِ غم ہائے روزگار
یہ بھی گذر ہی جائے گی اتنی گذر گئی

دل میں مچل کے رہ گئی سجدوں کی آرزو
جلوے کے انتظار میں تابِ نظر گئی

کیا پوچھتے ہو دیر و حرم کی حقیقتیں
پردے پڑے ہوئے تھے جہاں تک نظر گئی

شاہدؔ وفا شعاروں کو ہم نے بھلا دیا
انسانیت کے ساتھ شرافت بھی مر گئی

دلِ غریب کہاں پائے گا نشاں اپنا
لُٹا کے شہرِ نگاراں میں کارواں اپنا

حریمِ ناز سے کرب والم کے زنداں تک
کہاں کہاں نہ ہُوا خون رائیگاں اپنا

خدا کا شکر بجا لاؤ سوختہ جانو!
زمینِ دوست سے کم تر ہے آسماں اپنا

دل و نگاہ کے سجدوں کی بات کر واعظ
جبینِ شوق کو حاصل ہے آستاں اپنا

کچھ اور ضبط سے لے کام اے دلِ ناداں
مِلا ہُوا ہے رقیبوں سے رازداں اپنا

گِلہ بھی ان کے ستم کا نہ کر سکے شاہدؔ
ہزار بار لیا ہم نے امتحاں اپنا

اور کیا ہوگا دلِ مجبور کی آغوش میں
جل رہا ہے طور برقِ طور کی آغوش میں

یوں لگا رکھی ہے دل سے زندگی کی آرزو
جیسے طفلِ جاں بلب مزدور کی آغوش میں

نور ہی کی جستجو میں کٹ گئی عمرِ عزیز
دَم بھی پروانے کا نکلا نور کی آغوش میں

تھک گئے تھے جستجو میں حضرتِ انسان کی
سوگئے ہم دُخترِ انگور کی آغوش میں

جاگنا واعظ کا صبحِ حشر تک ممکن نہیں
سوئے ہیں حضرت خیالِ حور کی آغوش میں

میرے ساغر میں ہے شاہدؔ اب وہ جانِ میکدہ
گُم تھی جو خیامِ نیشا پور کی آغوش میں

عبدالصمد جاوید (علامہ گنبد)

عبدالصمد جاوید (علامہ گنبد) ابن شیخ محبوب، اکولہ

انٹرنس تاریخ پیدائش : ۲۱؍اپریل ۱۹۲۱ء

''صدائے گنبد'' طنز و مزاح ۱۹۷۱ء دوسرا ایڈیشن ۲۰۱۵ء

مدیر ہفت روزہ ''ہم لوگ'' روزنامہ انقلاب (طنز و مزاح نگار)

بدلی بدلی سی گلستاں کی ہوا آج بھی ہے دستِ صرصر میں گلِ تر کی قبا آج بھی ہے
آج بھی خونِ شہیداں سے ہے تزئینِ جمال دستِ قاتل کو تمنائے حنا آج بھی ہے
کارگر ہو نہ سکا زخم کے مرہم کا علاج میرے سینے میں ہر اک زخم ہرا آج بھی ہے
آنسوؤں میں بڑی لذّت تھی بہت پہلے بھی اک طرف بیٹھ کے رونے میں مزا آج بھی ہے
ہاں وہ جاوید ! وہی تیغِ تغافل کا قتیل ایک منجملۂ اربابِ وفا آج بھی ہے

حسن ہے مہرباں تعجب ہے پھر بھی ہم بدگماں تعجب ہے
آمد آمد تھی موسمِ گل کی جل گیا آشیاں تعجب ہے
جو بھٹکتے تھے پہنچے منزل پر کھو گئے کارواں تعجب ہے
گرم تھی کل تو عیش کی محفل آج ماتم وہاں تعجب ہے
پھول جھڑتے تھے ہر گھڑی جن سے اُن لبوں پر فغاں تعجب ہے
توبہ کی تھی شراب خانے سے آگئے پھر یہاں تعجب ہے
کوئے جاناں کی سرزمیں جیسے بن گئی آسماں تعجب ہے

زمانے کی یہ حالت انقلابی ہم نے دیکھی ہے
غریبی ہم نے دیکھی ہے توابی ہم نے دیکھی ہے

اُڑاتے پھر رہے ہیں خاک ویراں ریگزاروں کی
مہ و انجم کی صدیوں ہم رکابی ہم نے دیکھی ہے

چھلکتے جام جن ہاتھوں میں ہر دم رقص کرتے تھے
انھیں ہاتھوں میں اب خالی گلابی ہم نے دیکھی ہے

ہم اپنے گاؤں میں جس کا تصور کر نہیں سکتے
بڑے شہروں میں اتنی بے حجابی ہم نے دیکھی ہے

جواں اپنے مقدر پر بھروسہ کر کے بیٹھے ہیں
مشقت میں ہمیشہ کامیابی ہم نے دیکھی ہے

بسیرا ہے ہمارا ان دنوں فٹ پاتھ پر، ہے سچ
یہ کل کی بات ہے عزت مآبی ہم نے دیکھی ہے

اپنے اربابِ زر نہیں بدلے — ہیں بڑے کم نظر نہیں بدلے
چھوڑ دی شاخِ گل، ہوئی مدت — طورِ برق و شرر نہیں بدلے
گردشوں نے جہان کو بدلا — شیخ والا گہر نہیں بدلے
انقلاب آ کے ہو گئے رخصت — اپنے شام و سحر نہیں بدلے
ہم کو دنیا کچل کے رکھ دے گی — ہم نے رہبر اگر نہیں بدلے
گھولا جاتا ہے زہر امرت میں — دوستوں کے ہنر نہیں بدلے
ساری دنیا بدل گئی لیکن — ہم ہی اپنی ڈگر نہیں بدلے

نیاز علی نیاز قیصری

نیاز علی نیاز قیصری، آکوٹ (اکولہ)　سنِ پیدائش : ۱۹۲۱ء

جب غمِ زندگی نے لی کروٹ　چین آیا نہیں کسی کروٹ
ہم نے بدلی گھڑی گھڑی کروٹ　نیند آئی نہیں کسی کروٹ
وہ نظر آئے ہاتھ اُٹھائے ہوئے　وقتِ نزع جو ہم نے لی کروٹ
فکرِ دُنیا سے اب نجات ملی　ہم نہ بدلیں گے اب کبھی کروٹ
یک بہ یک کیا ہُوا نیازؔ انہیں　لے رہے تھے ابھی ابھی کروٹ

کہکشاں کی قمر کی بات چلی　صبح دم رات بھر کی بات چلی
اونچی نیچی ڈگر کی بات چلی　زندگی کے سفر کی بات چلی
زرد پتّوں کا تذکرہ نہ ہُوا　بس نسیمِ سحر کی بات چلی
یاد آئے لہو لہو پتھر　جب کہیں سنگ و سر کی بات چلی
کیا غضب ہے کہ موسمِ گل میں　خشک برگ و ثمر کی بات چلی
آج اونچی اُڑان والوں میں　ایک بے بال و پر کی بات چلی
بزمِ احباب میں نیازؔ اکثر　کیوں کسی بے ہنر کی بات چلی

ابھی ابھی تھی لبوں پر ہنسی، ابھی نہ رہی — بنی تھی بات مقدر سے جو بنی نہ رہی
بہار آئی، گلستاں میں دلکشی نہ رہی — نکھار پھولوں میں، کلیوں میں تازگی نہ رہی
کدورتوں کو مٹاؤ، خلوصِ دل سے ملو — بھروسہ زیست کا کیا ہے رہی، رہی نہ رہی
امید و یاس کے گھر میں رہا قیام اپنا — چلے سفر پہ تو امید واپسی نہ رہی
اُٹھا کے آئینہ دیکھو ذرا جمال اپنا — تمھارے حسن میں پہلی سی دلکشی نہ رہی
نظر مِلائی جو ان سے تو اے نیازؔ لگا — مزاجِ یار میں پہلی سی برہمی نہ رہی

رونقِ بزم تھا کیا ہُوا — اک دیا ٹمٹماتا ہُوا
اب کرے کیا تماشہ کوئی — آدمی خود تماشہ ہُوا
کشتیاں ڈوب کر رہ گئیں — پار دریا کے تنکا ہُوا
دیکھئے گلستاں کی طرف — ہے ہر اک پھول مسلا ہُوا
وہ نمک ڈال کر چل دیے — زخمِ دل اور گہرا ہُوا
بن گیا زینتِ گلستاں — خوں ہمارا نچوڑا ہُوا
بے بسی دیکھ کر اے نیازؔ — رُک گیا کوئی آتا ہُوا

غلام دستگیر شررؔ

غلام دستگیر شررؔ ابن شیخ امام، بلڈانہ — تعلیم : درجہ ہشتم تک

تاریخِ پیدائش : ا رجولائی ۱۹۲۱ء — وفات : ۱۴ر نومبر ۱۹۹۸ء

زمانے! جس قدر جی چاہے لے لے امتحاں ہم سے
بدل جائیگا تو بدلی نہ جائیگی زباں ہم سے

بسایا ہے غموں نے جب سے اپنے خانۂ دل کو
مسرت روٹھ کر چل دی خدا جانے کہاں ہم سے

سنانے کو تو ہم بھی داستاں اپنی سنا دیتے
کریں کیا پوچھنے والا تو ہو کوئی یہاں ہم سے

وہ جب سے مل کے بچھڑے ہیں تو یہ محسوس ہوتا ہے
کسی نے چھین لی جیسے حیاتِ جاوداں ہم سے

شبِ فرقت بسا لیتے ہیں وہ دنیا تصور کی
تری تصویر تک بھی بات کرتی ہے جہاں ہم سے

قریبِ منزلِ مقصود پھر قسمت نے بھٹکایا
بچھڑ کر رہ گئے ہم کارواں سے کارواں ہم سے

شررؔ اپنا قفس اک دن یقیں ہے گلستاں ہوگا
بہاریں خود گلے ملنے کو آئیں گی یہاں ہم سے

ہنسی نصیب نہیں ہے خوشی نصیب نہیں
وہ جب سے روٹھ گئے زندگی نصیب نہیں

ہر اک گل ہے پریشاں ہر اک کلی ہے اُداس
بہار میں بھی انہیں تازگی نصیب نہیں

نظر کے سامنے ہے ان کا سنگِ در پھر بھی
مری جبیں کو مگر بندگی نصیب نہیں

پلا رہا ہوں ہزاروں کو اپنے ہاتھوں سے
ہوں میکدے میں مگر میکشی نصیب نہیں

سکون کہتے ہیں کس کو قرار کیا شئے ہے
تمہارے بعد مجھے ایک بھی نصیب نہیں

میں چاہتا ہوں شررؔ تجھ کو دیکھ لوں اک بار
نہ جانے کیوں ترا دیدار بھی نصیب نہیں

ہماری بادہ کشی سے واقف نہیں ہے شاید ابھی زمانہ
ہم ایک ساغر میں جب بھی چاہیں ڈبو کے رکھ دیں شراب خانہ
تمھاری نظرِ کرم کا سایہ رہے جو یوں مجھ پہ غائبانہ
مَیں پھیر دوں حادثوں کے رُخ ہی مَیں روک دوں گردشِ زمانہ
جو تم چلو جھوم اٹھیں فضائیں، رُکو تو رُک جائے نبضِ عالم
جہاں تم اپنی نظر جھکا دو وہیں ٹھہر جائے گا زمانہ
نگاہِ مخمور کی وہ مستی چھڑوا دے رندوں سے مئے پرستی
جسے نگاہوں سے تم پلا دو وہ بھول جائے شراب خانہ
یہ حُسن والے جفا کے ماہر، وفا کی تسکین دے رہے ہیں
فریب کتنا ہے خوبصورت، حسین ہے کس قدر بہانہ
ابھی تو دل میں تمھاری یادوں کی مشعلیں جل رہی ہیں پیہم
چراغِ داغِ جگر ہیں روشن سجا ہُوا ہے غریب خانہ
دیا ہے جو دعوتِ نظارہ تو تابِ نظارگی بھی دے دو
وگرنہ اہلِ جہاں نہ دہرائیں پھر وہی طور کا فسانہ
ہوائیں کچھ گرم ہو رہی ہیں سب اپنے دامن بچائے رکھیں
کہیں شررؔ کی ذرا سی لغزش نہ پھونک دے یہ نگار خانہ

تمھارے میکدے میں جب قدم رکھ دینگے دیوانے
صراحی کانپ جائے گی لرز جائینگے پیمانے
وہ شمع جس کو احساسِ محبت تک نہیں ہوتا
خدا جانے اسی پر کیوں مرے جاتے ہیں پروانے
ترے محتاج کوئی اور ہوں گے ہم نہیں ساقی
جہاں ہم ہیں وہاں خود کھنچ کے آجاتے ہیں پیمانے
مرے دو چار تنکوں نے رکھی ہے لاج گلشن کی
وگرنہ برق جاتی کس کے آگے ہاتھ پھیلانے
اگر خاموش رہتے ہیں وفا بدنام ہوتی ہے
جو کہتے ہیں تو اپنے راز ہو جاتے ہیں بیگانے
بُرے پہچانے جاتے ہیں بھلوں کے ساتھ ہی اکثر
چمن میں ہوں نہ گر کانٹے گلوں کو کون پہچانے
یہ دنیا چند روزہ ہے شررؔ کچھ کام ہی کر لو
یہ دن آخر گذر جائینگے رہ جائینگے افسانے

غلام حسین رازؔ

غلام حسین رازؔ ابن غلام یٰسین خورشیدؔ بالاپور — تاریخ پیدائش : جنوری ۱۹۲۳ء
تعلیم : درجہ ہشتم تک — پیشہ : تجارت وزراعت
''متاعِ احساس'' ''دامنِ شب'' ''جامِ سفال'' ''چاکِ گریباں'' ''آخرِ شب'' (شعری مجموعے)

ہوں امن کا داعی کبھی شورش کا سبب ہوں — مَیں مسئلہ خود اپنے لئے غور طلب ہوں
الطاف بہت ہیں مرے آزار بھی بے حد — کہنے کو تو کہئے کہ فقط جنبشِ لب ہوں
جب چاہوں گا تب چھین کے لے لوں گا مرا حق — پھیلائے ہوئے دستِ طلب تب تھا نہ اب ہوں
کردار کی عظمت ہوں قناعت ہے مرا نام — نے دستِ گدائی ہوں نہ دامانِ طلب ہوں
انسان ہوں حیرت سے تکیں جن و ملائک — میں مہر و محبت ہوں کبھی قہر و غضب ہوں
اک شغل ہے میرا جسے کہتے ہیں تفکّر — مصروفِ مشقت ہوں نہ آرام طلب ہوں
فطرت مجھے دہرائے ازل سے تو ابد تک — آغازِ سحر ہونے کو ہوں آخرِ شب ہوں
ہوتے ہیں مضامین و خیالات مرے پاس — تنہا نہ مجھے جانئے مَیں بزمِ ادب ہوں
حالات سے شکوہ نہ مقدر سے گلہ ہے — اے رازؔ میں خود اپنی تباہی کا سبب ہوں

کبھی کرم، کبھی غیظ و غضب تو ہوگا ہی — مزاجِ یار سلامت، یہ سب تو ہوگا ہی
کسی کے گھر میں بچھی ہو اگر صفِ ماتم — کسی کی بزم میں جشنِ طرب تو ہوگا ہی
تمھاری بات ہو یا ذکر حور و غلماں کا — بیان شانہ و رُخسار و لب تو ہوگا ہی
ادب کے نام پہ ہوگی جو اتنی پابندی — تو کوئی واقعہ سوءِ ادب تو ہوگا ہی
میں اختلاف نہ ان سے کبھی کروں اے رازؔ — پڑے خودی پہ مگر ضرب تب تو ہوگا ہی

شکوہ ، گلہ ، مطالبہ ، فریاد کچھ تو ہو
جینا اگر ہے اے دلِ برباد کچھ تو ہو

شیریں و دلنواز کوئی خواب ہی سہی
آخر تسلیٔ دلِ ناشاد کچھ تو ہو

خوش آ سکی نہ لذّتِ تحسینِ ناشناس
تعریف بھی اگر ہو تو بنیاد کچھ تو ہو

ہاں مسکراؤ کھل کے سرِ دار دوستو
دلکش تمہارے قتل کی روداد کچھ تو ہو

آؤنا ، گائیں نغمۂ آزادیٔ چمن
کنجِ قفس میں خاطرِ صیاد کچھ تو ہو

حسرت سے تک رہی ہے مری التجا حضور
کب تک خموش رہیئے گا ارشاد کچھ تو ہو

احباب کے دلوں پہ کوئی نقش چھوڑ جا
اے رازؔ تیرے ذکر کی بنیاد کچھ تو ہو

دل کو پھر اس کی محبت کا گماں ہے کہ جو تھا
پھر غزل خواں مرا اندازِ بیاں ہے کہ جو تھا

ذہن میں جل تو اُٹھے علم و ترقی کے چراغ
دل میں اخلاص مگر ہائے کہاں ہے کہ جو تھا

چھٹ گیا عقل کے ہاتھوں سے یقیں کا دامن
پھر وہی سلسلۂ وہم و گماں ہے کہ جو تھا

امن کے دعوے ہیں دن رات مگر کیا کہیئے
اب بھی ہر سمت وہی شورِ فغاں ہے کہ جو تھا

خندۂ گل کی قسم گریۂ شبنم کی قسم
"وہی اندازِ جہانِ دگراں ہے کہ جو تھا"

ڈھونڈھنے میں تجھے تکلیف نہ ہوگی اے دوست
میرا اب بھی وہی مٹّی کا مکاں ہے کہ جو تھا

اپنے قدموں پہ بھی تم دیکھ لو کچھ ہے کہ نہیں
میرے ماتھے پہ تو اب تک وہ نشاں ہے کہ جو تھا

شوق ہے، عیش ہے، اے رازؔ اداکاری ہے
اب کہاں عشق وبالِ دل و جاں ہے کہ جو تھا

سعید اللہ خاں اُفق

محمد سعید اللہ خاں اُفقؔ ابن اسد اللہ خاں ضمیرؔ، ایوت محل — تاریخ پیدائش : مارچ ۱۹۴۴ء
عالم و فاضل (دہلوی) — پیشہ : فیشن ڈیزائنر
''بامِ اُفق'' (شعری مجموعہ) ۲۰۱۰ء

کوہِ شبِ سیاہ کو کاٹ کے جوئے نور لا
ہیشۂ آفتاب اُٹھے وہ عزم وہ شعور لا

نا محرمِ خود آگہی ، نا آشنائے برتری
فرش سے لے کے عاجزی، عرش پہ جا غرور لا

محفلِ کائنات میں بزمِ تصورات میں
آئینۂ حیات میں عکسِ قصور و حور لا

مُطربِ خوش گلو ذرا نغمۂ جانفزا سنا
کہتا ہے دَورِ ابتلا کیف میں آ ، سرور لا

پروردگار! الاماں بندے ہیں تجھ سے بدگماں
مثلِ صدائے کُن فکاں آوازۂ نشور لا

تیرے خرامِ ناز پہ صدقے وفا کی رہ گذر
لیکن ذرا تو سوچ کر فتنے اٹھا فتور لا

رند خراب ہوں ترا ، میری بھی تشنگی بجھا
ساقی لاجواب لا ، جامِ مئے طہور لا

نادان آسماں نہ چھو موسیٰ نظر اگر ہے تو
اپنے اُفقؔ کے روبرو جلوۂ کوہِ طور لا

دیوار بن گئے تھے جو موسم بدل گئے
آجائیے کہ شام کے سائے بھی ڈھل گئے

آتش فشاں پہاڑ تھے، لاوے نگل گئے
شاطر مزاج لوگ نئی چال چل گئے

حالانکہ بات سچ ہی کہی تھی ضمیرؔ نے
لیکن بہت ہی تلخ تھے الفاظ، کھل گئے

صبحِ شبِ سیاہ بڑے طمطراق سے
سورج اُگا رہی تھی مگر ہاتھ جل گئے

آئی شبِ سیاہ ، ضیا باریوں کے ساتھ
شکرِ خدا کہ اپنے بُرے دن بھی ٹل گئے

جیسے کسی کا صورِ سرافیل پھونکنا
دنیائے درد کانپ اُٹھی ، دل دہل گئے

اس درجہ پائیدار سفینہ تھا عزم کا
طوفان آئے اور ارادے بدل گئے

دیکھا، مذاق اُڑانے لگیں پھر بلندیاں
ہم پھر اُفقؔ حدود سے آگے نکل گئے

تمام رعنائیاں سمیٹے نظر نظر میں سمائے جانا
یہ اُن کے جلوؤں کا معجزہ ہے ہر ایک منظر میں پائے جانا

ہواؤں کا کام اور کیا ہے بجھائے جانا بجھائے جانا
"یہی مرا فرضِ منصبی ہے چراغ پیہم جلائے جانا"

اصولِ راہِ وفا یہی ہے، یہی تقاضا ہے رہروی کا
رَوِش رَوِش غم اُٹھائے جانا، قدم قدم مسکرائے جانا

ملے نہ جب تک کوئی اشارہ، قدم ہی اُٹھتا نہیں ہمارا
ضمیر کرتا نہیں گوارا کسی کے گھر بن بُلائے جانا

یہی محبت کی ابتدا تھی یہی محبت کی انتہا تھی
وہ ان کی باتیں بنائے جانا ہمارا باتوں میں آئے جانا

نگاہِ صد التفات سمجھوں کہ مضحکہ خیز بات سمجھوں
وہ لوحِ دل پر اقؔ براری کا نام لکھ کر مٹائے جانا

عشق ہے نام مرا، حُسن کا شیدائی ہوں
"بات یہ اور کہ محرومِ پذیرائی ہوں"

قافلے غم کے جہاں رُکتے ہیں دَم لینے کو
میں وہی سایۂ دیوارِ شکیبائی ہوں

کچھ اس انداز سے اُٹھتی رہی حاسد کی نظر
جیسے میں ہی سببِ انجمن آرائی ہوں

نکتہ چیں میرے، مرے خوں کی سفیدی پہ نہ جا
میں نئے دَور کے بھائی کا سگا بھائی ہوں

مصرعۂ تر کے کبھی پاؤں پھسل جاتے ہیں
جیسے میں راہِ تخیّل پہ جمی کائی ہوں

گن لئے اُڑتے ہوئے "طائرِ لاہوت" کے پر
کون کہتا ہے کہ گم کردۂ بینائی ہوں

کم نظر ہیں وہ جو کمزور سمجھتے ہیں مجھے
ایٹمی دور کی طاقت ہوں، توانائی ہوں

دل دہل جاتے ہیں فولاد سی چٹانوں کے
شورِ تنہائی ہوں، آوازۂ برنائی ہوں

یہ مرا اپنا طریقہ ہے خود آگاہی کا
خود تماشا ہوں اقؔ خود ہی تماشائی ہوں

ڈاکٹر منشاء الرحمٰن خاں منشاؔ

محمد منشاء الرحمٰن خاں منشاؔ ابن علیم الرحمٰن خاں، پمپل گاؤں راجہ (بلڈانہ)
تاریخِ پیدائش : یکم مئی ۱۹۲۴ء تعلیم: ایم۔اے (اردو، فارسی) بی ٹی، پی ایچ ڈی
صدر شعبۂ اردو فارسی N.M.V. کالج ناگپور
"جیون ترنگ" "آہنگِ حیات" "نوائے دل وغیرہ۔ تقریباً ڈیڑھ درجن کتب (مصنف/شاعر)

ہوئے جو پاؤں سے معذور ہم جبیں سے چلے
جنونِ شوق میں یہ سلسلے ہمیں سے چلے

ہمارا سر ہی ہمیشہ نشانہ بنتا ہے
کسی بھی سمت سے پتھر چلے، کہیں سے چلے

کھلے طریقے سے ہم پر چلے نہیں خنجر
اگر چلے بھی تو یاروں کی آستیں سے چلے

ذرا بھی دوش نہیں اس میں آسمانوں کا
بگولے فتنوں کے جب بھی چلے زمیں سے چلے

فرازِ دار کی عظمت میں کچھ کلام نہیں
بلند بختی کے سب سلسلے یہیں سے چلے

یہ پیش رفت کی ہے شرطِ اوّلیں منشاؔ
کہ چلنے والا اٹل عزم پر یقیں سے چلے

دل کی شعلہ زائی کے آنکھوں کی طغیانی کے دن
ہیں جوانی کے ہی دن دراصل جولانی کے دن

ان میں تو دانائیاں کھل کر دکھاتی ہیں کمال
کون کہتا ہے کہ یہ ہوتے ہیں نادانی کے دن

تھا لہو میں تر بتر دامن ہمارا جن دنوں
ہم نہ بھولیں گے کبھی وہ خون افشانی کے دن

تازہ تازہ آیا تھا جب کاروانِ فصلِ گل
یاد ہیں اب تک ہمیں وہ خانہ ویرانی کے دن

کیسے لوگوں کو بتائیں مشکلوں پر مشکلیں
کتنی پیدا کرتے ہیں، یہ خواب سامانی کے دن

ہوتے ہوتے جان کو ہو جاتا ہے حاصل قرار
جاتے جاتے جاتے ہیں منشاؔ پریشانی کے دن

سوزِ دل ، آہِ شرر بار سے پہچانتے ہیں
لوگ طوفان کو آثار سے پہچانتے ہیں

حوصلہ کہتے ہیں اک راہِ عمل دیتا ہے
حشر کو ہم تری رفتار سے پہچانتے ہیں

رنگِ مئے، رنگِ شفق، رنگِ گہر، رنگِ گلاب
تیرے رنگِ لب و رُخسار سے پہچانتے ہیں

اپنی قسمت کے خم و پیچ کو ہم دیوانے
تیرے ہی گیسوئے خمدار سے پہچانتے ہیں

اہلِ دل ، اہلِ جگر ، اہلِ نظر ، اہلِ وفا
ہم کو شوقِ رسن و دار سے پہچانتے ہیں

گردشِ چرخ کا رُخ ہو کہ زمانے کا مزاج
صرف ہم دیدۂ بیدار سے پہچانتے ہیں

اور ہیں وہ جو زر و سیم پہ رکھتے ہیں نظر
ہم تو انسان کو کردار سے پہچانتے ہیں

حُسن والوں کی یہ خوبی ہے کہ دل والوں کو
اک نظر ہی میں بڑے پیار سے پہچانتے ہیں

شاعری کا یہ کرم کم تو نہیں ہے منشاءؔ
لوگ تجھ کو ترے اشعار سے پہچانتے ہیں

پیار کی تم سے التجا کی ہے
دل نے کتنی حسیں خطا کی ہے

ظلم جن دوستوں نے ڈھائے ہیں
ہم نے اُن کے لئے دعا کی ہے

اُن نگاہوں کو کیا کہیں قاتل
جن میں معصومیت بلا کی ہے

کوئی ایسے وفا بھی کیا کرتا
آپ نے جس طرح جفا کی ہے

ڈوبتے ہیں سفینے ساحل پر
سب عنایت یہ ناخدا کی ہے

زلفِ ہستی سنوارنے کے لئے
ہم نے کوشش تو بارہا کی ہے

زندگانی سے ہاتھ دھو کر ، بھی
کرنے والوں نے یاں وفا کی ہے

اس زمانے میں ہر کوئی منشاءؔ
جانے کیوں زندگی کا شاکی ہے

عبدالکریم مجروحؔ صدیقی

عبدالکریم مجروحؔ صدیقی ابن عبداللطیف صدیقی، اُودا پور (امراؤتی)
تاریخ پیدائش: ۲۴؍جون ۱۹۲۵ء وفات: ۱۲؍ستمبر ۱۹۹۵ء
انسپکٹر سینٹرل اکسائز
"وجدان وتواجد" (شعری مجموعہ) ۱۹۹۵ء

نازشِ حُسنِ نظر ہیں ہم لوگ
عظمتِ شام و سحر ہیں ہم لوگ

حُسنِ دوروزہ پہ نازاں کیوں ہو
دائمی گُلِ بصر ہیں ہم لوگ

کارواں، راہ گذر، اور رہبر
اور پھر گردِ سفر ہیں ہم لوگ

ہر قدم حُسن کے محشر لیکن
حشر کی حدِ نظر ہیں ہم لوگ

کیوں زمانہ نہیں واقف ہم سے
ہیبت و خوف و خطر ہیں ہم لوگ

وقت ہے تیز رواں ہم خفتہ
کتنے کوتاہ نظر ہیں ہم لوگ

شدّتِ غم سے آہ کر بیٹھے
عظمتِ غم تباہ کر بیٹھے

چار اُن سے نگاہ کر بیٹھے
کتنا رنگیں گناہ کر بیٹھے

اُن کی جانب نگاہ کر بیٹھے
ساری محفل گواہ کر بیٹھے

اُن کی دلجوئی ہر طرح سے کی
غیر سے رسم و راہ کر بیٹھے

دردِ دل تحفۂ محبت تھا
دردِ دل سے نباہ کر بیٹھے

گُل سے عارض پہ شبنمی قطرے
کیوں انہیں اشتباہ کر بیٹھے

پارسائی کی چھاؤں میں مجروحؔ
کیسے کیسے گناہ کر بیٹھے

میرا دل جلے تو جلا کرے وہی کر جو تیرا خیال ہے
میرے دل کی بات نہیں نہیں، ترے گھر کا یہ تو سوال ہے

نہ تو تابِ عرضِ سوال ہے نہ تو دم زدوں کی مجال ہے
مری خاموشی ہے فغاں بہ لب یہی قال ہے یہی حال ہے

ترے حسن کا یہ کمال کیا یہ مجال کیا یہ خیال کیا
ہے کمالِ حُسنِ نظر مرا نہ جمال ہے نہ خیال ہے

مجھے بھا گئی تری یہ ادا ہے عجیب دلکش و دل رُبا
تری اِک نظر ہے جواب کل مری ہر نظر میں سوال ہے

نہیں مجھ کو تجھ سے گلہ کوئی تری یاد بن گئی دل رُبا
شبِ ہجر اَب مرے واسطے نہیں ہجر یہ تو وصال ہے

تجھے دے گا داغ مفارقت جسے تیرا مجروحؔ کہتے ہیں
ذرا آ کے دیکھ لے اِک نظر کہ قریب وقتِ وصال ہے

یہ خیالِ شوق پرور دل کے بہلانے کو ہے
کوئی بے رُخ، بے رُخی سے باز آ جانے کو ہے

یہ معمہ میکدے میں کون سمجھانے کو ہے
بے خودی ہشیار کو اور ہوش دیوانے کو ہے

رازِ در پردہ کا پردہ خود بخود اُٹھ جائے گا
بس فقط ان سے نظر دو چار ہو جانے کو ہے

میکدے میں شیخ کا آنا شگون اچھا نہیں
ہوش کی لے ساقیا رندوں کو بہکانے کو ہے

سادگی ششدر کھڑی ہے شوخیاں سینہ سپر
اِک ادا جانے کو ہے اور اِک ادا آنے کو ہے

اللہ اللہ یہ نظامِ ہوش و مستی ساقیا
ہوش مستانے کو ہے اور کیف پیمانے کو ہے

جام و مینا کی ضرورت ہی نہیں مجروحؔ کو
مست نظروں سے کوئی مدہوش فرمانے کو ہے

قاضی سیّد مشتاق نقوی

قاضی سیّد مشتاق محی الدین نقوی ابن قاضی سیّد کرم محی الدین، اچلپور

پیشہ : طبابت   تاریخ پیدائش : ۴؍اکتوبر ۱۹۲۶ء   وفات : ۲۴؍مئی ۱۹۸۴ء

"لحن ترانی" (شعری مجموعہ۔ زیر طبع)

میری خزاں ہے رنگِ بہاراں لئے ہوئے
کنجِ قفس ہے عکسِ گلستاں لئے ہوئے

امواج کا سکوت ہے طوفاں لئے ہوئے
ہر رہگذر ہے حشر کا ساماں لئے ہوئے

جلووں کی کائنات ذرا منتشر تو کر
مری نظر ہے دید کا ارماں لئے ہوئے

پھیلی ہوئی ہے مستیٔ دامِ بہارِ نو
ہر اک روش ہے کیف کا ساماں لئے ہوئے

تبدیل ہو کے رہ گئی تصویرِ کائنات
اب اہرمن ہے عظمتِ یزداں لئے ہوئے

تخلیقِ حق کو آج بھی جس پر غرور ہے
وہ عظمتِ بلند ہے انساں لئے ہوئے

داغوں کا اک چمن مرے سینے میں بند ہے
پھرتا ہوں اپنے ساتھ گلستاں لئے ہوئے

زد پر ہے انقلابؔ کے شیرازۂ حیات
ہر داستاں ہے درد کا عنواں لئے ہوئے

مشتاقؔ وہ نہیں ہیں زمانے میں کامیاب
بیٹھے ہیں جو نصیب کا داماں لئے ہوئے

شکوہ سنجِ عمرِ فانی ہے بیانِ آرزو
ختم ہوتی ہی نہیں ہے داستانِ آرزو

آنکھوں آنکھوں میں کہی ہے داستانِ آرزو
باتوں باتوں میں کیا ہے رازدانِ آرزو

وہ بیانِ آرزو پر مجھ سے فرمانے لگے
آرزو دل کی نہ نکلے یہ ہے شانِ آرزو

بن سنور کر آئے ہیں وہ پرسشِ بیمار کو
لے رہے ہیں وقتِ نزع امتحانِ آرزو

مجھ میں اور اُن میں فقط مشتاقؔ اتنا فرق ہے
میں سراپا آرزو ہوں وہ ہیں جانِ آرزو

وابستۂ دام ہوش و خرد ہنگامۂ وحشت کرنا ہے
تعمیر کے رنگین پھولوں سے تخریب کا دامن بھرنا ہے
پھر عزم تقاضا دینا ہے جذبات شکستۂ فطرت کو
ابھرے ہوئے شورِ طوفاں کی ہر موج کو ساحل کرنا ہے
وہ فطرتِ ذوقِ عزم ہی کیا جو غیر پہ تکیہ کر بیٹھے
کس کام کا ایسا جینا ہے، کس کام کا ایسا مرنا ہے
طوفان سے ٹکرانے والے، اندازۂ طوفاں کیا معنی
اب قوتِ بازو پر تجھ کو اپنے ہی بھروسہ کرنا ہے
کوشش ہے یہ اپنی شام وسحر ہر شاخ نشیمن ہوجائے
بجلی کے اشارے کہتے ہیں تاراج چمن کو کرنا ہے
وہ عزم نہیں وہ بات نہیں وہ صبح نہیں وہ شام نہیں
مرنے کیلئے جیتے تھے کبھی، جینے کے لیے اب مرنا ہے
وابستۂ دورِ رنج و الم ہے راہِ محبت کی منزل
مشتاقؔ قدم اس منزل میں اب سوچ سمجھ کر دھرنا ہے

طاقتِ ضبطِ فغاں اتنی بڑھا سکتے ہیں ہم
انتہائے یاس میں بھی مسکرا سکتے ہیں ہم
عظمتِ شانِ محبت بھی دکھا سکتے ہیں ہم
ہنستے ہنستے جان پر بھی کھیل جا سکتے ہیں ہم
دھجیاں ظلم و ستم کی بھی اُڑا سکتے ہیں ہم
صبر و استقلال کے دریا بہا سکتے ہیں ہم
باغباں کیوں ناز ہے اپنی بہاروں پر تجھے
آشیانے میں بہاریں اپنی لا سکتے ہیں ہم
سچ تو یہ ہے کہ خودی میں زندگی کا راز ہے
اپنی قسمت اپنے ہاتھوں سے بنا سکتے ہیں ہم
جذبۂ جوشِ جنونِ شوق ہونا چاہیئے
پھر سراغِ منزلِ ہستی بھی پا سکتے ہیں ہم
ہم نے پائی ہے محبت میں مجسم زندگی
مسکرا کر موت سے آنکھیں ملا سکتے ہیں ہم
واقفِ آدابِ اسرارِ محبت ہے یہ دل
وہ تو کیا مشتاقؔ دنیا کو جھکا سکتے ہیں ہم

قاضی مستقیم الدین سحرؔ

قاضی مستقیم الدین سحرؔ ابن قاضی محمد مقیم الدین افسرؔ، دیول گھاٹ (بلڈانہ)
ایچ۔ایس۔ایس۔سی۔ڈی۔ایڈ	تاریخِ پیدائش : ۵ رجولائی ۱۹۳۷ء
موظف مدرّس اردو پرائمری اسکول چانڈول تعلقہ چکھلی
"ندائے سحرؔ" (شعری مجموعہ) ۲۰۱۲ء

وقت یہ فیصلہ کرتا نہیں تدبیر کے ساتھ
کون اُلجھا ہے تری زُلفِ گرہ گیر کے ساتھ

اور ہوں گے جنھیں راس آئی ہے دنیا کی بہار
ہم تو الجھے ہی رہے گردشِ تقدیر کے ساتھ

راہرو کوئی ہو ، منزل پہ پہنچ جاتا ہے
کبھی قسمت کے سہارے، کبھی تدبیر کے ساتھ

کسی فرزانے کو توفیق مدد بھی نہ ہوئی
کوئی دیوانہ سسکتا رہا زنجیر کے ساتھ

فائدہ ہو تو ہر اک شخص نکل پڑتا ہے
کبھی تخریب کے ساتھ اور کبھی تعمیر کے ساتھ

جرأتِ عشق سزا دے کہ جزا ، ہم نے تو
اپنی تصویر لگا دی تری تصویر کے ساتھ

دامنِ فہم و فراست ہو اگر ہاتھوں میں
کام بگڑے بھی سنور جاتے ہیں تدبیر کے ساتھ

یہ سحرؔ ہے کہ نہیں کون ہمیں بتلائے
ظلمتِ شب بھی نظر آئی ہے تنویر کے ساتھ

ترا دستِ ستم ہے اور مَیں ہوں
مرا چھوٹا سا دم ہے اور مَیں ہوں

یہ دنیا ہے، الم ہے اور مَیں ہوں
"تری تیغِ ستم ہے اور مَیں ہوں"

مرے اپنے نہیں ہیں آج اپنے
یہی تو ایک غم ہے اور مَیں ہوں

خدا جانے کہاں لے جائے وحشت
ترا نقشِ قدم ہے اور مَیں ہوں

مجھے منظور ہے ہر بات تیری
سرِ تسلیم خم ہے اور مَیں ہوں

اُدھر خوشیوں کے نظارے ہیں، تم ہو
اِدھر رنج و الم ہیں اور مَیں ہوں

مصیبت میں بھی ہے یک گونہ راحت
بہت اُس کا کرم ہے اور مَیں ہوں

مسرّت کی سحرؔ دیکھی نہیں ہے
مسلسل شامِ غم ہے اور مَیں ہوں

بزمِ سخن ہے اور سخنداں نئے نئے
محفل میں آج آئے ہیں مہماں نئے نئے

کن منزلوں کی تاک میں ہے کاروانِ زیست
راہیں نئی نئی ہیں گلستاں نئے نئے

بالکل غلط ہے کون یہ کہتا ہے وجد میں
ملتے نہیں جنوں کو بیاباں نئے نئے

ساقی ذرا نظر تو اُٹھا دیکھ بزم میں
پینے کو آج آئے ہیں مہماں نئے نئے

جب تک ہے سانس حوصلہ باقی رہے مرا
ڈھونڈا کروں گا درد کے درماں نئے نئے

مسکان، ابروؤں کے اشارے، سلامِ عشق
کیسے اُٹھائے جائیں گے احساں نئے نئے

کیا غم جو اجنبی ہے ذرا گفتگو سحرؔ
اُن کے لئے تو آپ ہیں مہماں نئے نئے

اُن سے شکوہ بھی ہے شکایت بھی
باوجود اس کے اُن سے اُلفت بھی

کیا صلہ دے گئی محبت بھی
چاک داماں ہے زورِ وحشت بھی

کوئی تم سا نظر نہیں آتا
لاکھوں دیکھے ہیں خوبصورت بھی

آرزو تھی کہ دیکھتے جلوہ
رہ گئی دل کی دل میں حسرت بھی

یہ زمانہ عجب زمانہ ہے !
شرم رُخصت ہوئی ہے، غیرت بھی

اب منائیں تو کیا منائیں اُسے
ہم سے روٹھی ہوئی ہے قسمت بھی

اُس محبت کے گیت گاتے ہو
کھو چکی ہے جو قدر و قیمت بھی

اب ملاقات ہو تو کیوں ہو سحرؔ
آپ کرتے نہیں ہیں زحمت بھی

احمد مرزا صابرؔ براری

احمد مرزا قادری صابرؔ براری ابن مولوی حمید مرزا، اچل پور
بی۔اے، بی۔ایڈ　　تاریخ پیدائش : ۳۰؍اکتوبر ۱۹۲۸ء وفات : ۵؍مئی ۲۰۰۵ء
درس وتدریس (کراچی)
"چشمِ شوق" (غزلیات) مجموعات نعت ۴، مجموعاتِ تاریخ ۵، مجموعاتِ مناقب ۲

اسی سبب سے خزاں ہم کو ناگوار نہیں　　بہار بھی تو ہمارے لئے بہار نہیں
ہوس کی دھوپ میں تپتے ہیں غنچۂ نورس　　چمن میں کوئی شجر آج سایہ دار نہیں
نہ جانے کیا ہوئے ہمراہیانِ منزلِ شوق　　ہماری حدِ نظر تک کوئی غبار نہیں
جنونِ عشق کے انجام کی خبر کیا ہو　　ابھی تو اپنا گریباں بھی تار تار نہیں
خلوص اُٹھ گیا کچھ اس طرح زمانے سے　　کہ جن پہ ناز تھا اب وہ بھی غمگسار نہیں
یہ درد و رنج و الم کم ہیں کیا قیامت سے　　ہمیں مزید قیامت کا انتظار نہیں
ہمیں تو آج ہی آزاد کردے اے صیاد　　کہ اب ہمیں ترے وعدوں پہ اعتبار نہیں
گزار لیں گے یوں ہی اپنی زندگی صابرؔ　　کسی کے لطف و کرم پر ہی انحصار نہیں

جب سے گلچیں چمن پرست نہیں　　بارآور کوئی درخت نہیں
ہم ہیں صدیوں سے گوش برآواز　　آج تک کوئی بازگشت نہیں
اہلِ گلشن پہ کیا نہیں گذری　　نقش یہ کس کے دل پہ ثبت نہیں
لگ گئی لب پہ مہر خاموشی　　گرچہ لہجہ مرا کرخت نہیں
چاند پر لوگ ڈالتے ہیں کمند　　کہئے کیا یہ خرد کی جست نہیں
میکدہ پر طلسم طاری ہے　　بے اثر ان کی چشمِ مست نہیں
عہدِ حاضر ہے سخت پُرآشوب　　حوصلہ پھر بھی میرا پست نہیں
کون پوچھے گا تجھ کو اے صابرؔ　　تو اگر مصلحت پرست نہیں

وہ نظر جب ادھر نہیں ہوتی
روشنی میرے گھر نہیں ہوتی

ہر بیاں مستند نہیں ہوتا
ہر زباں معتبر نہیں ہوتی

عشق کی راہ میں کسی کی نظر
اپنے انجام پر نہیں ہوتی

تھک کے ہر گام بیٹھنے والو
زندگی یوں بسر نہیں ہوتی

جس دعا میں تڑپ نہ ہو دل کی
وہ رہینِ اثر نہیں ہوتی

عشق میں جاں سے ہاتھ دھوتے ہیں
یہ مہم یوں ہی سر نہیں ہوتی

جو سحر حاصلِ شبِ غم ہے
وہ سحر عمر بھر نہیں ہوتی

دردِ دل یوں عزیز ہے صابرؔ
منتِ چارہ گر نہیں ہوتی

شہر میں تیرے مرا کوئی شناسا بھی نہیں
کون ہوں میں یہ کسی شخص نے پوچھا بھی نہیں

حسنِ مغرور کو آنکھوں میں بسایا بھی نہیں
حرص کا زہر مری روح میں اُترا بھی نہیں

اس کی یادوں سے منور ہوئی دل کی دنیا
چاند ایسا جو ابھی ابر سے نکلا بھی نہیں

اپنی مرضی سے قفس ہم نے چنا تھا صیاد
اس لئے تیرے ستم کا ہمیں شکوہ بھی نہیں

دور دورہ ہے یہاں جور و جفا کا لیکن
دوستو ! اہلِ وفا شہر میں عنقا بھی نہیں

گلستاں کیسے تجھے سونپ دیں اے دشمنِ گل
اس میں شامل تو ترے خون کا قطرہ بھی نہیں

ناخدا غیر کی کشتی کا تجھے کیوں غم ہے
دور گرداب سے کچھ تیرا سفینہ بھی نہیں

پارسا گو کہ نہیں صابرؔ خستہ لیکن
آپ جیسا اسے سمجھے ہیں تو ویسا بھی نہیں

ایڈوکیٹ مردان علی خاں نشاطؔ

ایڈوکیٹ مردان علی خاں نشاطؔ ابن غلام نبی خاں انعامدار جمعدار، (مرحوم) اکولہ
تاریخِ پیدائش : دسمبر ۱۹۲۸ء　وفات : ۲۰۰۳ء
ایم۔اے۔ایل۔ایل۔بی　　سبکدوش سول جج، فرسٹ کلاس مجسٹریٹ
"سرودِ رفتہ" ۲۰۰۳ء، (شعری مجموعہ)　مدیر اعلیٰ : جمعیت (ہفتہ وار)

ادا نہ دیکھی کوئی ان کی بے رُخی کی طرح　　وہ ہم سے ملنے بھی آئے تو اجنبی کی طرح
اُٹھاؤ جام پیو مئے کہ موسمِ گُل ہے　　چٹک رہا ہے بدن اس کا چاندنی کی طرح
بس اتنی عرض ہے تجھ سے اے داورِ محشر　　سزا ملے نہ ہمیں کوئی زندگی کی طرح
جو اجنبی تھے یہاں شہریار بن بیٹھے　　جو شہریار تھے رہتے ہیں اجنبی کی طرح
نگاہِ ناز کی سرمستیاں نشاطؔ نہ پوچھ　　سرور اس کا بھی رہتا ہے مئے کشی کی طرح

عشقِ جنوں نواز کو سرشار دیکھنا　　ہر درد کو ہے لذّتِ آزار دیکھنا
اپنی نظر ہے اوجِ ثُریا سے بھی بلند　　ہر کم نظر کو زحمتِ دیوار دیکھنا
کس کس کے نام آئے گا پروانۂ اجل　　مقتل بنا ہے کوچۂ دلدار دیکھنا
رنگیں قبا ہے پھول تو کیا اس سے فائدہ　　عریاں ہے زیرِ شاخ ہر اک خار دیکھنا
تھے جتنے حق پرست وہی ہو گئے شہید　　اک ہم ہی رہ گئے ہیں سرِدار دیکھنا
عاشق ہے اپنے آپ پہ وہ نازنیں نشاطؔ　　صہبائے احمریں کو قدح خوار دیکھنا

راستہ میں اک نیا منظر نظر آیا تو کیا
ساتھ چلنے اپنے کوئی ہم سفر آیا تو کیا

کون سلجھا پائے گا عشق وجنوں کی گتھیاں
اہلِ دل آیا تو کیا ' اہلِ نظر آیا تو کیا

وقف جب ہم نے کیا خود کو خدا کی راہ میں
اپنے ہاتھوں میں لئے وہ سیم وزر آیا تو کیا

بخشے جائیں گے غلامانِ نبیؐ روزِ جزا
واں فرشتہ کوئی فردِ جرم گر لایا تو کیا

جادۂ حق پر رہیں گے گامزن ہم تو نشاطؔ
راہ میں بہکانے ہم کو راہبر آیا تو کیا

چہروں پہ اب نقاب، کہیں ہے کہیں نہیں
شرم وحیا ' حجاب ' کہیں ہے کہیں نہیں

ہلچل مچی کہیں ہے، کہیں پر جمود ہے
وہ شورِ انقلاب ، کہیں ہے کہیں نہیں

اُس حُسنِ تیزگام کی تصویر کیا بنے
جو حُسنِ محوِ خواب ، کہیں ہے کہیں نہیں

کتنے شباب ڈھل گئے فکر معاش میں
رعنائیِ شباب ' کہیں ہے کہیں نہیں

یہ فیض اہل دل کی دعاؤں کا ہے نشاطؔ
ہلکا سا جو عذاب ' کہیں ہے کہیں نہیں

شفیع اللہ خاں جانبازؔ

شفیع اللہ خاں جانباز چکھلی (بلڈانہ)
تاریخ پیدائش : ۷ رمئی ۱۹۲۹ء وفات : ۱۴ را کتوبر ۲۰۰۱ء
ایس۔ ایس۔ سی
موظف صدر مدرس اردو پرائمری مدرسہ چکھلی

اُڑا کر امن کے پرچم ستم والوں کی تدبیریں
خرد کے پاؤں میں ڈالی گئیں سونے کی زنجیریں
جہانِ شور و شر کا نام ہی ہے گرچہ آزادی
قفس ہی اس سے اچھا تھا بہت اچھی تھیں زنجیریں
سکون و امن کے خوگر بنے ہیں خار راہوں کے
اندھیرے رقص فرما ہیں اُجالوں کی ہیں تاثیریں
ثمر یہ ٹوٹ جائے گا خرد کے پاسبانوں کا
جنوں کے عزم کی جس دم مچل اُٹھیں گی تصویریں
نظامِ زندگی ڈر ہے کہیں برہم نہ ہو جائے
یہی ہے گرچہ اے جانبازؔ آزادی کی تاثیریں

رستے رہتے ہیں زخم سینے میں
لطف آنے لگا ہے جینے میں
دل پگھلتا ہے اشک ڈھلتے ہیں
آگ سی لگ گئی ہے سینے میں
تیری یادوں کی دھوپ ہوتی ہے
ڈوب جاتے ہیں ہم پسینے میں
اشک بہتے ہیں یاد میں تیری
عکس تیرا ہے ہر نگینے میں
کب کے طوفان منھ چھپا لیتے
ناخدا ہوتا گر سفینے میں
لوٹ لیتے جو ہوش میں رہتے
مال تھا دفن جو دفینے میں
اب یہ عالم ہے حضرتِ جانبازؔ
ہم نہ مرنے میں ہیں نہ جینے میں

زندگی ہونے لگی درہم کہیں برہم کہیں
ناچتے ہیں مِل کے باہم شعلہ و شبنم کہیں

ہر طرف غارتگری ہے خون کا دریا رواں
خون سے ڈھالی گئی ہے فطرتِ آدم کہیں

اے خداوندِ جہاں دنیا میں کیا اندھیر ہے
ہے کہیں ساون، یہاں پت جھڑ کا ہے موسم کہیں

چاندنی راتوں میں گم ہے کاروانِ زندگی
کون جانے کب ملیں گے تم کہیں اور ہم کہیں

اپنی بربادی کا افسانہ نہ ہو جائے عیاں
سازِ دل پر چھیڑ دیں نہ حسرتیں سرگم کہیں

ہر قدم جانبازؔ منزل کی طرف اُٹھتا تو ہے
دل کے ارماں توڑ دیں نہ راستے میں دم کہیں

ہم مصلحتِ وقت کے دیوانے نہیں ہیں
نظروں سے جو گر جائیں وہ پیمانے نہیں ہیں

بیہوش ہیں جو ہوش کی باتیں نہیں کرتے
دیوانے نظر آتے ہیں دیوانے نہیں ہیں

دیکھوں ذرا عبرت کی نگاہوں سے کہ واللہ
یہ حال کی تفسیریں ہیں افسانے نہیں ہیں

دل میں ہے تری یاد ترا دردِ تصور
آبادی ہی آبادی ہے ویرانے نہیں ہیں

دیکھے نہ کوئی ہم کو حقارت کی نظر سے
انسان ہیں ٹوٹے ہوئے پیمانے نہیں ہیں

جانبازؔ ہیں مشہور ہیں جانبازیاں اپنی
دنیا کی نگاہوں میں ہم انجانے نہیں ہیں

شفاعت اللہ خاں سحرؔ

شفاعت اللہ خاں سحرؔ ابن محمد کرامت اللہ خاں، ملکاپور (بلڈانہ)
تاریخِ پیدائش : ۱۱/۱اکتوبر ۱۹۲۹ء وفات : ۲۶/مئی ۲۰۰۳ء
ایڈمنسٹریٹیو آفیسر، سینٹرل اکسائز

ساکت و جامد جہاں میں انقلاب آ ہی گیا
ظلمتوں کو ختم کر کے آفتاب آ ہی گیا

اِک خزاں ہی موجبِ بربادیٔ گلشن نہیں
فصلِ گل میں بھی تو گلچیں کا عذاب آ ہی گیا

سوچ میں گم تھا کہ آخر زندگی کیا چیز ہے
سامنے نظروں کے میری اِک حباب آ ہی گیا

کم سِنی میں ضد کیا کرتے تھے پھولوں کے لئے
آج ان کو پھول لینے میں حجاب آ ہی گیا

سحرؔ دل پر اب رہا ہے نہ رہے گا اختیار
پھر اُسی ظالم پہ یہ خانہ خراب آ ہی گیا

باز آیا میں دلِ ناکام سے
"روتے روتے صبح کردی شام سے"

ہمنشیں وارفتگیٔ شوق میں
کون ڈرتا ہے بھلا انجام سے

داستانِ غم ہر اک سے کیا کہوں
کہنا پڑتا ہے کہ ہوں آرام سے

رہنے دیجے چارہ جوئی ہے فضول
سو گیا بیمارِ غم آرام سے

ہاں پیامِ نو سنا کوئی سحرؔ
تھک گئے ہم قصۂ اصنام سے

ہو گیا منزل نشیں جو راہرو دیوانہ تھا
انتخابِ راہ میں ہی گم ابھی فرزانہ تھا

اے نگاہِ برق یوں تو اور بھی تھے آشیاں
تیرا منظورِ نظر کیا میرا ہی کاشانہ تھا !

موردِ الزام کیوں ٹھہرے بھلا دستِ کرم
مانگنے والے ! ترا لہجہ ہی گستاخانہ تھا

قوم کا ہی غم تھا جو اقبالؔ نے شکوہ کیا
غور کیجے تو وہ شکوہ ، شکوۂ بے جا نہ تھا

درد ہی سے عظمتِ انساں بڑھی ورنہ سحرؔ
ایک مشتِ خاک تھا جب درد سے بیگانہ تھا

نہ رو اے دل ترے رونے سے کیوں ہو مہرباں کوئی
یہاں نہ ہم زباں کوئی نہ تیرا رازداں کوئی

ریا کاری سے بچنے کے لئے ہو آستاں ایسا
جہاں ماتھے پہ قشقہ ہو نہ سجدہ کا نشان کوئی

گلوں کا رنگ پیلا ہے خزاں کا دَور دورہ ہے
چمن کی آبیاری کو نہیں ہے باغباں کوئی

مکاں کی اس قدر قلت تری دنیا میں اے مالک
کہ بعد از مرگ بھی ملتا نہیں خالی مکاں کوئی

کہاں کی رہبری کیسی قیادت کیا قیادت میں
سحرؔ پہنچا بھی ہے منزل پہ اب تک کارواں کوئی

غنی اعجازؔ

عبدالغنی اعجازؔ ابن شیخ کریم، اکولہ تاریخ پیدائش : ۱۹۲۹ء وفات : ۲۰ر دسمبر ۲۰۱۰ء
تعلیم : میٹرک
"دشتِ آرزو" "گردِ سفر" "کانٹوں کی چبھن" (شعری مجموعے)

ادھوری ناشنیدہ داستاں ہوں — کہ شاید میں سماعت پر گراں ہوں
خیالوں میں بھی کچھ واضح نہیں ہے — یقیں کی گود میں پلتا گماں ہوں
لبِ اظہار چپ ہے میری خاطر — ابھی ہاں اور نہیں کے درمیاں ہوں
بلندی پر ہوا لے جا رہی ہے — چراغِ جسم سے اُٹھتا دھواں ہوں
کشش بازار کی روکے ہوئے ہے — ابھی میں اپنے گھر پہنچا کہاں ہوں
مجھے پاؤگے دل کے پاس ہر دم — جہاں محسوس کرلوگے وہاں ہوں
مرے اندر ہے پوشیدہ قیامت — کمالِ ضبط کا اک امتحاں ہوں
ہوئے اعجازؔ بوڑھے تم مگر میں — خدا کے فضل سے اب تک جواں ہوں

مسرت کی فراوانی کے دن ہیں — محبت کی جہانبانی کے دن ہیں
تمناؤں کی شادابی کا موسم — یہ ارمانوں کی جولانی کے دن ہیں
ہے کلیوں کے تبسم کا زمانہ — گلوں کی چاک دامانی کے دن ہیں
مناظر میں ہے رنگینی غضب کی — نظر کی شوق سامانی کے دن ہیں
اُٹھے ہیں چار سو بادل خوشی کے — حسیں جذبوں کی طغیانی کے دن ہیں
ملے ہیں پیار کے انمول تحفے — خلوصِ دل کی ارزانی کے دن ہیں
ہوئے روشن مقدر کے ستارے — فلک کی نور افشانی کے دن ہیں
سلامت رحمتِ حق کا تسلسل — مبارک، فضلِ ربانی کے دن ہیں

آئینہ ہوں ایک حیرانی مرے چاروں طرف
لمحہ لمحہ حشر سامانی مرے چاروں طرف

بحرِ عصیاں میں گھِرا "تنہا جزیرے سا" وہ مَیں
اور پھر حدِّ نظر پانی مرے چاروں طرف

جرم ہے معصومیت ! معتوب ہے دیوانگی
ہے خرد مندوں کی نادانی مرے چاروں طرف

وقفے وقفے سے یہاں اُٹھنے لگے ہیں گردباد
ہر طرف ماحول طوفانی مرے چاروں طرف

بستیاں جتنی بھی تھیں شہرِ خموشاں ہوگئیں
ہوگئی آباد ویرانی مرے چاروں طرف

مَیں کہ ہوں ہر حال میں چشمِ توجہ کا شکار
ہے تغافل کی نگہبانی مرے چاروں طرف

کون ہے جبر و سزا کا مستحق میرے سوا
ہے جو بدخواہوں کی سلطانی مرے چاروں طرف

جنوں میں دیر سے خود کو پکارتا ہوں میں
جو گم ہے دامنِ صحرا میں وہ صدا ہوں میں

بدل گیا ہے زمانہ بدل گیا ہوں میں
اب اپنی سمت بھی حیرت سے دیکھتا ہوں میں

حیات ایک سزا ہے ، بھگت رہا ہوں میں
درِ قبول سے لوٹی ہوئی دعا ہوں میں

جسے خود آپ ہی اپنے پہ پیار آجائے
جفا کے دَور میں وہ لغزشِ وفا ہوں میں

بس ایک جنبشِ لب تک وجود ہے جس کا
زبانِ شوق پہ وہ حرفِ مدّعا ہوں میں

اگر ہے جرم محبت تو پھر تکلّف کیا
مدارِ جرم ہوں ، تقصیر ہوں ، خطا ہوں میں

رفاقتوں کے یہ فانوس تابہ کے اعجازؔ
ہَوا کی زد پہ لرزتا ہُوا دیا ہوں میں

قمر الزماں قمر

محمد قمر الزماں خاں قمر، انجن گاؤں سورجی (امراؤتی)　تاریخ پیدائش : ۲۳ مارچ ۱۹۳۰ء

تعلیم : ایم۔اے۔بی۔ایڈ

مؤظف مدرس سیکنڈری اسکول انجن گاؤں سورجی

موبائیل : 07224-242611 ، 9604448032

سورج گیا تو چاند ستارے نکل پڑے　جن کی تلاش تھی وہ نظارے نکل پڑے
اے کاروانِ قوم تری خیر ہو کہ ہم　لگتا ہے رہزنوں کے سہارے نکل پڑے
طوفان جوش پر تھا سفینہ بھنور میں تھا　غرقاب ہم ہوئے تو کنارے نکل پڑے
تھا جس کا خوف ، ہو کے رہا حادثہ وہی　نیزے کسی کے سینے ہمارے نکل پڑے
پہلے تو میرے حق میں زباں اس کی آگ تھی　جب آگ تھم گئی تو شرارے نکل پڑے
جب سے بڑھا ہے بھاؤ سیاست میں زہر کا　لے کر سپیرے ناگ پٹارے نکل پڑے
تھا گھر کا سائبان ، بُرا پیڑ جب گرا　تقسیم ساز ہاتھوں سے آرے نکل پڑے
کیسی خطا ہوئی کہ سرِ میکدہ تھے ہم　سب کہہ اُٹھے قمر بھی ہمارے نکل پڑے

ہوتا نہیں یقین مجھے چھوڑ جائے گا　وہ میرا پیار میری وفا آزمائے گا
اے سنگ سُرخ توڑ نہ نفرت کی ضرب سے　نازک ہے میرا شیشۂ دل ٹوٹ جائے گا
زر بھی زمیں بھی نورِ محمدؐ بھی ہے ترا　اک ساتھ چل کے دیکھ زمانے پہ چھائے گا
بھونروں کو اتنی دعوتِ حرص و ہوس نہ دے　تجھ سے ترا گلاب بدن چھوٹ جائے گا
یہ دَور وہ نہیں ہے کہ مخلص رہیں گے دوست　اک دن کوئی اُٹھے گا تجھے کاٹ کھائے گا
مجرم کے ظلم و جور سے ملزم نہ ہو اُداس　تجھ کو سزا سے منصفِ اعلیٰ بچائے گا
تو نے بھی اپنی قوم کو بخشی نہیں ضیاء　الزام اے قمر یہ ترے سر بھی آئے گا

میں تیرا منتظر ہوں جلوۂ جانانہ برسوں سے
چھلک اٹھتا ہے میرے صبر کا پیمانہ برسوں سے
وفا کی پاسداری ہے نہ جل جانے کا جذبہ ہے
بدل ڈالی ہے کس نے فطرتِ پروانہ برسوں سے
نہ لا گردش میں اُس کے سامنے پیمانہ اے ساقی
نہ جانے کون سے زنداں میں تھا دیوانہ برسوں سے
انھیں اصرار ہے میں ان کو گھر آنے کی دعوت دوں
کہوں کیسے انھیں گھر ہے مرا ویرانہ برسوں سے
قیامت ہے اُسی پر بے وفا ہونے کی تہمت ہے
جو دیتا آرہا ہے جان کا نذرانہ برسوں سے
نہ جانے کتنی برساتوں میں ڈھونڈا ہے قمر ہم نے
نظر آتے ہیں وہ میکش نہ وہ مے خانہ برسوں سے

جلوۂ یار مری راہ گذر تک پہنچے
ذوقِ دیدار اگر تابِ نظر تک پہنچے
اُس کی یہ ضد مرے قدموں کو نہیں تھی منظور
اُس نے چاہا تو بہت تھا مرے سر تک پہنچے
آگئی شرم دواؤں کو' اثر کر نہ سکیں
جب اُٹھے ہاتھ دعاؤں کے اثر تک پہنچے
فتنہ گر نام اسی کا ہے عمل ، ردِّ عمل
تیرے فتنے تھے پلٹ کر ترے در تک پہنچے
تو بھی پہچان نہ پائے گا خد و خال ترے
تیرے بہروپ اگر میری نظر تک پہنچے
میرے اپنے ہی مری پیٹھ کے خنجر نکلے
غیر تو مجھ کو بچانے مرے گھر تک پہنچے
ایک صرف آپ ہیں ملتے نہیں اُس سے ورنہ
لوگ یہ فخر سے کہتے ہیں قمر تک پہنچے

سیّد علی محسنؔ شہیدی

سیّد علی محسنؔ شہیدی ابن سیّد عزیز، اکولہ
تاریخ پیدائش : یکم جولائی ۱۹۳۰ء
ادیب، کامل (علیگ)
مدیر "جمعیت"، "سویرا" (ہفتے وار)
پروپرائٹر : ناولٹی اسپورٹس، اکولہ

تری اس نوازش کا مشکور ہوں میں
وہ بخشا ہے غم جس سے مسرور ہوں میں

ستم ہائے پیہم سے مجبور ہوں میں
وگرنہ ترے در سے کب دور ہوں میں

محبت کی یہ ناکامیاں اللہ اللہ
ترے پاس آنے کو مجبور ہوں میں

بہت کوششیں کیں تجھے بھول جاؤں
مگر ان خیالوں سے اب دور ہوں میں

خدا کے لئے صرف اک بار آجا
کہ تیری جدائی میں رنجور ہوں میں

اِدھر عشق کو پاسِ خودداریاں ہے
اُدھر حسن کہتا ہے مغرور ہوں میں

نہ بھولوں گا محسنؔ میں ان کی وفائیں
ہزاروں وفاؤں کا مشکور ہوں میں

پھر نظر ٹکرا رہی ہے کیا کروں
بزمِ دل تھرّا رہی ہے کیا کروں

وہ نہ آئے ہیں نہ آئیں گے کبھی
آرزو بہلا رہی ہے کیا کروں

یاس کی بدلی دلِ ناکام پر
درد بن کر چھا رہی ہے کیا کروں

یاد ان کی دل میں پھر آنے کو ہے
اک قیامت آ رہی ہے کیا کروں

دردِ پیہم اور اشکِ خونچکاں
رنگ الفت لا رہی ہے کیا کروں

پھر مری دنیائے دل پر اے ندیم
غم کی بدلی چھا رہی ہے کیا کروں

زندگی کی کیفیت محسنؔ نہ پوچھ
یاس دل کو کھا رہی ہے کیا کروں

کشمکش میں ہے مری جان بڑی مشکل ہے / دل میں ارمانوں کا طوفان بڑی مشکل ہے
ایک ٹوٹا ہُوا دل یعنی شکستہ ساحل / اور اُٹھتے ہوئے طوفان بڑی مشکل ہے
تم پر مرتا ہوں مگر جان نہیں دے سکتا / کیونکہ ہو تم ہی مری جان بڑی مشکل ہے
روز آتے ہو تصور میں قیامت بن کر / اور کرتے ہو پریشان بڑی مشکل ہے
دل بڑی چیز ہے محسنؔ مجھے ہے ناز اس پر / وہ بھی اب ان پہ ہے قربان بڑی مشکل ہے

جو دلنواز ہو اپنا وہ دلربا نہ ملا / ستم پسند ملا درد آشنا نہ ملا
غریب ڈوب گیا بحرِ غم کے طوفاں میں / وہ جس کو ڈوب کے ابھرنے کا حوصلہ نہ ملا
جھکا سکے نہ مرے دل کو اہلِ دیر و حرم / خدا کے گھر میں خدا کی قسم خدا نہ ملا
وہ ایک تم ہو کہ ساحل ملا بغیر طلب / وہ ایک میں ہوں کہ تنکے کا آسرا نہ ملا
خدا کا شکر ہے محسنؔ کہ مل گئی منزل / بھلا ہُوا کہ ہمیں کوئی رہنما نہ ملا

سیّد بسم اللہ ناصرؔ، اکولہ

سیّد بسم اللہ ناصرؔ ابن سیّد بالا، اکولہ — سن پیدائش : ۱۹۳۰ء
فروٹ کمیشن ایجنٹ

کچھ تو اخلاق کی قدروں کو اُجالے کوئی
اِک تبسم ہی مری سمت اچھالے کوئی

آج کے خار لہو پیتے ہیں انسانوں کا
کیوں لئے پھرتا ہے اب پاؤں میں چھالے کوئی

جانے کیا بات ہے مائل بہ کرم ہیں کچھ لوگ
مجھ کو اس تازہ مصیبت سے بچالے کوئی

مَیں فضاؤں میں بکھر جاؤں گا خوشبو کی طرح
اِک حقیقت ہے کتابوں میں سجالے کوئی

لذتِ غم کو ترس جاؤگے ناصرؔ تم بھی
ظلم کرنے سے اگر ہاتھ اُٹھالے کوئی

شمس الدین اعجازؔ

شمس الدین اعجازؔ ابن محمد معصوم ارمانی، بالاپور　　تاریخ پیدائش : ۲؍دسمبر ۱۹۳۴ء
پیشہ : درس وتدریس　　سکونت : بھساول

روؤں تو خشک آنکھ میں آنسو کہاں سے آئے
بولوں تو بھی زبان پہ قابو کہاں سے آئے

بہنو ! تمھاری مانگ کا سیندور کیا ہوا ؟
بچو ! تمھارے ہاتھ میں چاقو کہاں سے آئے

انصاف کا لحاظ ! نہ تقسیم کا شعور
ان بندروں کے ہاتھ، ترازو کہاں سے آئے

وہ احترامِ مسجد و مندر کہاں گئے ؟
یہ سادھوؤں کے بھیس میں ڈاکو کہاں سے آئے

ہیں ایک گھر کے لوگ یہاں غیر کون ہے
پھر یہ معاملاتِ من و تو کہاں سے آئے

آپس کی رنجشیں ہیں کہ باہر کی سازشیں
یہ ضد، یہ اختلاف کے پہلو کہاں سے آئے

اللہ کیسے آگئی لفظوں میں روشنی
میری بیاضِ شعر میں جگنو کہاں سے آئے

غم کسی اور کا رونا میرا
کھیل اس کا ہے کھلونا میرا

سارا گھر ہے بہو بچوں کے لئے
میرا حصہ یہی کونا میرا

سب یہیں چھوڑ کے جانا ہوگا
اوڑھنا ہے نہ بچھونا میرا

میں اگر ہوں تو بھی حاصل کیا ہے
اس سے اچھا نہیں ہونا میرا

وقت کی آگ بری ہوتی ہے
کوئلہ بن گیا سونا میرا

آئینہ رنگ دکھاتا ہے الگ
ورنہ چہرہ ہے سلونا میرا

گہرے پانی میں اتر کر اعجازؔ
دیکھ دامن نہ بھگونا میرا

شفقت علی شفق

شفقت علی شفق سردیشمکھ ابن حسن علی سردیشمکھ، آکوٹ (اکولہ)　فون : 07162-248834

(بی۔اے)　تاریخِ پیدائش : ۱۰ر جولائی ۱۹۳۰ء　وفات : ۱۰ر دسمبر ۲۰۱۲ء

''رنگِ شفق'' (شعری مجموعہ)　حاشیہ (ادبی رسالہ سہ ماہی مدیر)

یہ فن یہ علم و ادب بانٹنا ہمارے بعد　　ہمارے نام کو مت پوجنا ہمارے بعد

ہیں دوست اتنے مگر ساتھ کون دیتا ہے　　کسی کو آزما کے دیکھنا ہمارے بعد

بتائیں گے تمھیں وہ ، اہلِ ادب اہلِ قلم　　ہمارے بارے میں تم پوچھنا ہمارے بعد

ابھی تو رہنے دو جیسا بھی گھر کا نقشہ ہے　　ہماری گدی پہ تم بیٹھنا ہمارے بعد

وبال کوئی بھی آئے ، تو حوصلہ رکھنا　　ہمارے نقشِ قدم ڈھونڈھنا ہمارے بعد

ابھی تو عیش کرو سرپرست زندہ ہے　　پہ خواہشات کو تم روکنا ہمارے بعد

ابھی تو زندہ ہیں آکر مِلا کرو یارو　　جو بھولنا ہے ہمیں بھولنا ہمارے بعد

جو آج کرتے ہیں ہم کو شفق نظر انداز　　کریں گے یاد ہمیں دیکھنا ہمارے بعد

حکم کیا دے کسی کو وہ جس کی　　عمر گذری ہے التجاؤں میں

ڈکھ تو اس بات کا ہر اک کو ہے　　کیوں اثر اب نہیں دعاؤں میں

ہے بہت ہی کٹھن وفا کی ڈگر　　دیکھ چھالے ہے کتنے پاؤں میں

کیا کہیں گے وہ دھوپ کی تیزی　　پاؤں جلتے ہیں جن کے چھاؤں میں

اب نہ وہ سادگی نہ مہر و وفا　　کس قدر تھا خلوص گاؤں میں

کتنی مشکل سے چل رہی ہے غزل　　زخم کتنے لگے ہیں پاؤں میں

اب یہ اردو زباں کا عالم ہے　　شہر سمٹا ہو جیسے گاؤں میں

زندگی کو ملا ہے چین کہاں　　آگئی جب ازل کی چھاؤں میں

التجا یہ شفق کی سب سے ہے　　یاد رکھنا اُسے دعاؤں میں

کیا ہے دنیا دلِ نادان نے سمجھا کیا ہے
گاہے غم، گاہے خوشی، اور یہاں رکھا کیا ہے

صرف اعمال ہیں انساں کا اثاثہ کیا ہے
چھوڑ کر جانا ہے سب کچھ، یہاں اپنا کیا ہے

ٹھوکریں کھائیں ہیں جس نے ذرا اُس سے پوچھو
تم نے دہلیز کے پتھر کو بھی سمجھا کیا ہے

یہ کیا سمجھیں گے وفا، رسمِ محبت، اخلاق
آج کے دَور کے انسان نے دیکھا کیا ہے

پھول اور پھل کی تمنا تو ہے جائز لیکن
غور اس پر بھی کریں آپ نے بویا کیا ہے

کسی معذور کا، بیکس کا اُڑاؤ نہ مذاق
کیا پتہ اپنے مقدر میں بھی لکھا کیا ہے

زندگی سے ہے بھری لپٹی ہوئی گردِ سفر
مَیں نے دیکھا ہے جہاں، آپ نے دیکھا کیا ہے

اندھی تقلید نہ کر سوچ سمجھ دیکھ شفقؔ
رُخ ہَوا کا ہے کدھر، وقت کا منشا کیا ہے

یہ بُرا دَور ہے ہر ایک کو اچھا نہ سمجھ
آج بن پرکھے تو اپنوں کو بھی اپنا نہ سمجھ

لوگ اکثر اسی انداز پہ کھاتے ہیں فریب
مسکراہٹ کو محبت کا اشارہ نہ سمجھ

ہم نے ساحل سے بھی اُٹھتے ہوئے طوفاں دیکھے
تو کنارے کو بھی محفوظ کنارا نہ سمجھ

مَیں نے جو کچھ بھی دیا ہے اُسے لوٹا نہ مجھے
قرض کو قرض ہی رہنے دے اُدھارا نہ سمجھ

فرض انسان کا انسان کے کام آنا ہے
غیر کے درد و الم کو بھی پرایا نہ سمجھ

قدر مَیں حُسن کی کرتا ہوں مگر یاد رہے
میرے اخلاق کو تو حُسن کا مارا نہ سمجھ

ہے ابھی تو ترا ہمدرد و بہی خواہ شفقؔ
خود کو تو اتنا بھی مجبور و اکیلا نہ سمجھ

ڈاکٹر اختر جمیل نظمیؔ

ڈاکٹر اختر جمیل نظمیؔ گوالیاری ابن سید ممتاز الدین بیخودؔ، اکوٹ (اکولہ)
صدر شعبۂ اردو کملا راجہ گرلس کالج، گوالیار
تاریخ پیدائش : ۲۹ر۱ر۱۹۳۱ء وفات : ۱۹۹۷ء
''شب ریزے'' ''خوابوں کا حساب'' ''سوا نیزے پہ سورج'' (شعری مجموعے)
''سویا نہیں کبیر'' (دوہے)

سب یہ باتیں کہاں سمجھتے ہیں ❊ درد کی ہم زباں سمجھتے ہیں
کاروباری نہیں ہیں سب لیکن ❊ اپنا سود و زیاں سمجھتے ہیں
جانتے ہیں کہ کیوں اُٹھا لنگر ❊ کیوں کھلا بادباں سمجھتے ہیں
اُن سے مل کر بھی وہ مِلا ہی نہیں ❊ جو اُسے بے زباں سمجھتے ہیں
کون کیسا ہے کس کی نظروں میں ❊ لوگ یہ سب کہاں سمجھتے ہیں
اب ہماری زباں نہ کھلواؤ ❊ ساری باتیں میاں سمجھتے ہیں
داد دینا تو اک الگ فن ہے ❊ شعر ہم بھی کہاں سمجھتے ہیں
کھیل ہے وہ مرے لئے نظمیؔ ❊ سب جسے امتحاں سمجھتے ہیں

اُلجھنیں اور بڑھاتے کیوں ہو ❊ مجھ کو ہر بات بتاتے کیوں ہو
میں غلط لوگوں میں گھِر جاتا ہوں ❊ تم مجھے چھوڑ کے جاتے کیوں ہو
دن مرا کاٹے نہیں کٹتا پھر ❊ تم ذرا دیر کو آتے کیوں ہو
مَیں نہیں ہاتھ لگانے والا ❊ اس قدر خود کو بچاتے کیوں ہو
یہ بھی تسکین کی صورت ہے کوئی ❊ اُس کے خط سب کو دکھاتے کیوں ہو
وادیٔ گل سے گزرتے جاؤ ❊ ہاتھ پھولوں کو لگاتے کیوں ہو
مجھ پہ روشن ہے حقیقت نظمیؔ ❊ روز اِک خواب سناتے کیوں ہو

راہ گیروں سے ربط پیدا کر
دور جاتا ہے بات سمجھا کر

رات پر دن کا کوئی قرض نہیں
ذہن کو صاف رکھ کے سویا کر

کیا مرا ہم خیال کوئی نہیں
تو اگر ہے تو ہاتھ اونچا کر

رات بھر جاگنے سے کیا حاصل
خواب کا راستہ نہ روکا کر

فاصلے سوچنے نہیں دیتے
مجھ کو دیکھو مرے قریب آ کر

عکس کب کون سا اُبھر آئے
دیر تک آئینہ نہ دیکھا کر

گھر میں نظمیؔ اگر سکوں ہوتا
بیٹھتے کیوں کسی کے گھر جا کر

مسلسل چلا ، رہگذر میں رہا
مرا آب و دانہ سفر میں رہا

مَیں اپنی گھٹن اپنے دل میں لئے
ہمیشہ ہَوا دار گھر میں رہا

نظر سے کئی لوگ گزرے مگر
وہی ایک چہرہ نظر میں رہا

مجھے بھی خوشی ڈھونڈنے آئی تھی
مگر اُن دِنوں مَیں سفر میں رہا

کسی پر توجہ کسی نے نہ دی
مرا عیب سب کی نظر میں رہا

مجھے خود بھی حیرت ہے اس بات پر
سکوں سے بہت شور و شر میں رہا

گذاری ہے نظمیؔ عجب زندگی
مَیں باہر رہا ہوں نہ گھر میں رہا

پروفیسر سیّد یونسؔ

پروفیسر سیّد یونسؔ ابن سید عثمان، امرا پور (ضلع بلڈانہ)
تاریخ پیدائش : ۲۳/ اگست ۱۹۳۲ء وفات : ۴/ مئی ۲۰۰۳ء
تعلیم : ایم۔اے۔(انگریزی) وظیفہ یاب پروفیسر دھونتے نیشنل کالج، ناگپور
"انکشاف" (شعری مجموعہ) ۱۹۹۷ء

نہ راستہ نہ سفر کا جواز مانگتے ہیں
ہم اپنا کھویا ہُوا رخت و ساز مانگتے ہیں
گراں گزرتا ہے ہموار راستوں کا سفر
مسافتوں سے نشیب و فراز مانگتے ہیں
ہماری زیست کے حالات اتنے ظالم ہیں
وہ آنکھ جو رہے ہر لحظہ باز مانگتے ہیں
ہمیں تو جاں کے علاوہ نہیں ہے کچھ دینا
یہ آستاں تو جبینِ نیاز مانگتے ہیں
غنی فقیر کو کردے امیر کو محتاج
اسی سے ایک دلِ بے نیاز مانگتے ہیں

دام دیکھے نہ نام دیکھا ہے
ہم نے بس اپنا کام دیکھا ہے
شہر کا شہر بن گیا جنگل
آپ کا انتظام دیکھا ہے
جو بظاہر نظر نہیں آتا
ہم نے وہ قتلِ عام دیکھا ہے
گردشِ صبح و شام کیا دیکھیں
اس کا طرزِ خرام دیکھا ہے
زحمتِ رہنمائی مت کیجے
ہم نے اپنا مقام دیکھا ہے
اس نے دیکھا ہے کب مری جانب
ازرہِ انتقام دیکھا ہے
تم نے دیکھا نہیں ہے یونسؔ کو
طائرِ زیرِ دام دیکھا ہے

اک فصلِ درد آٹھ پہر چن رہا ہوں میں
جو کٹ رہے ہیں راہ میں سر چن رہا ہوں میں
پرواز کے بغیر تو جینا محال ہے
صیاد نے جو کاٹے ہیں پر چن رہا ہوں میں
ساتھی تھے کیسے کیسے مرے جو بچھڑ گئے
پلکوں سے ان کی گردِ سفر چن رہا ہوں میں
تائید کے لئے مجھے انجم کی ہے تلاش
اک انجمن کے شمس و قمر چن رہا ہوں میں
کٹ بھی چکا وہ کب کا جو تھا مدعیٔ فن
اب پرزہ ہائے دستِ ہنر چن رہا ہوں میں
کیا دلخراش کام ہُوا ہے مرے سپرد
"اک زرد رُت کے برگ و ثمر چن رہا ہوں میں"

جو والہانہ لگن مجھ کو اپنے فن سے ہے
اسی طرح کی محبت مجھے وطن سے ہے
گذرنا گرچہ ہمیں تیرگی کے بن سے ہے
ہمارا واسطہ امید کی کرن سے ہے
وقارِ سر نہیں دستار و تاج کا محتاج
وقارِ سر جو ہے قائم تو بس کفن سے ہے
ہے فصلِ قرب کوئی دوریاں نہ پھیلائے
معاملہ تو یہاں روح کا بدن سے ہے
گو میری پیاس میں شامل ہے آبِ زم زم بھی
پہ پرورش تو مری گنگ اور جمن سے ہے
ترا بیان تو اک انکشاف ہے یونسؔ
کہ دل کی بات نمایاں سخن سخن سے ہے

خان منظورؔ

منظور الحسن خاں منظورؔ ابن ڈاکٹر عمر احمد خاں، اکولہ　تاریخِ پیدائش : ۱۹۳۰ء

نہ ہوتے اہلِ دل، اہلِ ستم، جانے کہاں جاتے
یہ برقِ اندازِ جلوے آگ برسانے کہاں جاتے

کبھی زاہد صفت ہوتے تو میخانے کہاں جاتے
شباب و کیف و سرمستی کے افسانے کہاں جاتے

وہ یوں کہیئے کہ ٹھوکر کھا کے آتا ہے سنبھل جانا
وگرنہ تم سے ظالم، ہم سے پہچانے کہاں جاتے

جنوں گر انقلابِ دہر کی راہوں پہ چل پڑتا
جنابِ خضر کیا کرتے، یہ فرزانے کہاں جاتے

مجسّم برف ہوں جذبات جن کے اُن سے کیا حاصل
ہم ایسی بے حسی میں خون گرمانے کہاں جاتے

مرے ہی دم سے ہیں منظورؔ ان کی جلوہ گاہیں بھی
وگرنہ حشر ساماں ناز فرمانے کہاں جاتے

وہ ہم ہوں گے ستم گاروں سے جو ٹکرانے آئیں گے
سرِ محفل محبت کا سبق دہرانے آئیں گے

وہ مے جس کو سمجھنے کیلئے پینا پڑے ہم کو
ہمیں اس کی حقیقت شیخ کیا سمجھانے آئیں گے

انھیں لب تک نہ لانے کی قسم تم نے تو دے دی ہے
زبانِ خلق پر لیکن وہی افسانے آئیں گے

سکوں کس کا لٹے گا، کون خوش ہوگا سرِ محفل
نہیں معلوم وہ کس پر کرم فرمانے آئیں گے

فرشتوں سے خطا ہوتی نہیں انساں سے ہوتی ہے
سنا ہے اس بہانے شیخ بھی میخانے آئیں گے

خود اپنی تنگ ظرفی سے چھلک اٹھیں گے محفل میں
بوقتِ مے کشی ایسے بھی کچھ پیمانے آئیں گے

شگونِ نیک ہے مے خانے کا برباد ہو جانا
نیا ساقی، نئے شیشے، نئے پیمانے آئیں گے

بہارِ گلستاں منظورؔ جن راہوں سے آئیگی
چھڑکتے خوں پہ گل جھومتے دیوانے آئیں گے

ہم پر نہ کریں گے وہ جفا سوچ رہے ہیں
یہ سوچ رہے ہیں تو بُرا سوچ رہے ہیں

یہ آپ کے الطاف و کرم کا ہے نتیجہ
اچھے تھے جو کل، آج بُرا سوچ رہے ہیں

پوری کوئی ہوتی نہیں انساں کی تمنّا
کیا کیجے طلب وقتِ دعا سوچ رہے ہیں

اتنے تو کبھی دستِ حسیں سُرخ نہ دیکھے
یہ خون ہے یا دستِ حنا سوچ رہے ہیں

معلوم نہیں جن کو فضا اپنے وطن کی
دنیا کی ہے کس رُخ پہ ہوا سوچ رہے ہیں

حیرت ہے کہ ہر فرد کو بیمار بنا کر
اب وقت کے لقمان دوا سوچ رہے ہیں

انساں کی تباہی کے لئے کیا کریں تخلیق
دنیائے ترقی کے خدا سوچ رہے ہیں

جینے کے لئے شیخ یہ سوچیں کہ کریں کیا
فردوس کی کیوں بعدِ فنا سوچ رہے ہیں

منظورؔ مرے ذکر پہ وہ سر کو جھکائے
کس فکر میں ڈوبے ہوئے کیا سوچ رہے ہیں

پھر شباب و شعر کا چرچا ہُوا
ایک جشنِ زندگی برپا ہُوا

کاروبارِ زندگی پھیلا ہُوا۔
عمر کم اور وقت ہے اُڑتا ہُوا

اشک ہائے غم کی طغیانی نہ پوچھ
جیسے دریا جوش پر آیا ہُوا

آتشِ غم سے پھٹا جاتا ہے دل
پر نظر آتا نہیں جلتا ہُوا

جان کر بھی میری آمد کا سبب
پوچھتے ہو کس لئے آنا ہُوا

سر بسجدہ ہیں خدا کے سامنے
زُلفِ جاناں میں ہے دل اٹکا ہُوا

دل میں ہنگامے تمنّاؤں کے ہیں
غم ہٹا ان کا کہ سنّاٹا ہُوا

غالباً اُمید افزا ہے جواب
ہے لفافہ عطر سے مہکا ہُوا

اُن کو منزل پر پہنچنے کا یقیں
راہبر جن کا ہے خود بھٹکا ہُوا

تنگ ظرفوں کو لبالب جامِ مے
رند اک اک بوند کو ترسا ہُوا

کر گیا یہ کون خود کو سربلند
کس کا سر ہے دار پر لٹکا ہُوا

جس جگہ بھی آپ نے رکھا قدم
اک نیا فتنہ وہاں پیدا ہُوا

ظالمانِ وقت نے دیکھا نہیں
خشمگیں آنکھوں میں خون آیا ہُوا

ہو رہا ہے نوکِ خنجر سے رقم
ہر فسانہ خون میں ڈوبا ہُوا

دیکھ وہ ہے مردِ میدانِ حیات
جی رہا ہے موت سے لڑتا ہُوا

محمد محسن ساحرؔ انصاری

محمد محسن ساحرؔ انصاری ابن محمد یسین، اکولہ — موبائیل : 9850282432
ڈپلوما ان الیکٹریکل انجینئرنگ — تاریخِ پیدائش : ۹ر اگست ۱۹۳۱ء
سروینر الیکٹریکل انجینئر انڈین ریلوے (ریٹائرڈ) — "خار و گل" (شعری مجموعہ)

لمحہ لمحہ شیون تھا — بھیگا بھیگا دامن تھا
کانٹا کانٹا مخزن تھا — بدلا بدلا گلشن تھا
ہریالی تک خشک ہوئی — سوکھا سوکھا ساون تھا
یکجائی ناممکن تھی — ٹوٹا ٹوٹا بندھن تھا
عکس نہ اپنا دیکھ سکے — ریزہ ریزہ درپن تھا
ویرانے میں پھول کھلے — اُجڑا اُجڑا گلشن تھا
لحد تھی اپنی صحرا میں — تنہا تنہا مدفن تھا
ہر سو غم کے سائے تھے — سہما سہما بچپن تھا
کوچہ اس کا کاہکشاں — ذرّہ ذرّہ روشن تھا
ساحرؔ کو سب بھول گئے — اپنا اپنا بدظن تھا

ہمسفری اک دھوکہ تھا معلوم نہیں — شاید ساتھ میں سایا تھا معلوم نہیں
لمحہ لمحہ یکجا کرکے دیکھیں گے — کون کہاں کب بچھڑا تھا معلوم نہیں
جانے کیسے اُس نے سہے یہ ظلم و ستم — اندھا، گونگا، بہرا تھا معلوم نہیں
دیوانے کیا پیاس بجھاتے اشکوں سے — صحرا کتنا پیاسا تھا معلوم نہیں
عکس تمھارے، یاد تمھاری ساتھ رہی — کیسے بھیڑ میں تنہا تھا معلوم نہیں
جس در سے سوغات کسی نے نہ پائی — ہاتھ وہاں کیوں پھیلا تھا معلوم نہیں
کس نے عطا کی خار و گل کو رعنائی — کون چمن سے گذرا تھا معلوم نہیں
مانگ اُجاڑی، کنگن توڑے بیوہ نے — رنگِ حنا کب چھوٹا تھا معلوم نہیں
دیر و حرم میں اشکوں کی برسات رہی — ساحرؔ نے کیا مانگا تھا معلوم نہیں

آگ میں جلتے سورج نے ہی روشن جب مہتاب کیا
چاندنی رات کی خنکی نے بھی حدت کو برفاب کیا
آنکھوں نے یہ کام یقیناً خوب کیا ، نایاب کیا
غم کا گلشن جس نے اپنی آنکھوں سے سیراب کیا
صحرا میں تسکین ملی ہے شاد کیا ویرانوں نے
دیوانوں کو صحنِ چمن میں پھولوں نے بیتاب کیا
یہ بھی تو ہے ایک طریقہ پند و نصائح کا یارو !
عمر رسیدہ لوگوں نے خود بچّوں کو آداب کیا
میں نے لہو سے سینچا ہے جو سبزۂ نو رس رستے میں
پاؤں سے بہتے خون نے میرے صحرا کو شاداب کیا
حکمِ نبیؐ میں مضمر ہیں احکام خدائے برتر کے
اُسوۂ حسنیٰ کو اپنا کر عقبیٰ کو زرتاب کیا
سیلِ حوادث سے بچ کر تو ساحر ساحل تک آیا
ڈوب نہ پایا وہ طوفاں میں دریا کو پایاب کیا

وقتِ رخصت ہر اک بات رونے لگی
آخری تھی ملاقات رونے لگی
سر جھکائے اندھیروں کی آغوش میں
جانے کیوں رات بھر رات رونے لگی
جستجو زندگی کو تبسم کی تھی
دیکھ کر تلخ حالات رونے لگی
اسپ و فرزیں گئے ، شتر بھی نہ رہے
کھا کے پیدل سے شہہ ، مات رونے لگی
در سے منعم کے سائل کو کچھ نہ ملا
خالی دامن پہ خیرات رونے لگی
رہزنوں کے ستم ، ظلم کو دیکھ کر
اب کمیں گاہ میں گھات رونے لگی
بے گناہی تھی چہروں سے اُن کے عیاں
قیدیوں پر حوالات رونے لگی
نربدا تاپتی میں لہو دیکھ کر
گلفشاں خاکِ گجرات رونے لگی
ہر قدم سازشیں ، قتل و غارتگری
عظمتِ ہند ، ہیہات رونے لگی
بغض و نفرت کے سیلاب میں غوطہ زن
گنگا جمنی مساوات رونے لگی
سر مُطافِ حرم میں جھکا جب کبھی
لب پہ ساحر مناجات رونے لگی

ڈاکٹر مناف خان مضطرؔ

ڈاکٹر مناف خاں مضطرؔ ابن غلام نبی خاں، بالا پور ضلع اکولہ
سنِ پیدائش : ۱۹۳۱ء وفات : ۲۰/اپریل ۱۹۹۹ء
ایس۔ایس۔سی لائیو اسٹاک سپروائزر

مجھ کو سکوں نصیب نہ دل کو قرار ہے
برہم مزاج گردشِ لیل و نہار ہے

رنگینیاں چمن کی نظر میں نہ آئیں گی
میری نگاہِ شوق میں رشکِ بہار ہے

یہ کون سا مقامِ محبت ہے اے جنوں
اب تو خیالِ عیش تصور پہ بار ہے

داماں بھی تار تار گریباں بھی چاک چاک
جوشِ جنوں ہے آمدِ فصلِ بہار ہے

مضطرؔ جنونِ عشق کی توقیر دیکھیے
ہر خار اپنے پائے جنوں پہ نثار ہے

لوٹا سکون میرا دلِ بیقرار نے
مجھ کو خزاں بنا دیا میری بہار نے

تجھ کو یقیں نہیں ہے تو اے چرخ پوچھ لے
دیکھا ہے حوصلہ مرا برق و شرار نے

شامِ فراق چاند ستارے نہیں تو کیا
روشن کیے ہیں داغ دلِ داغدار نے

عہدِ شباب ابر سیاہ میکدہ بدوش
توبہ کو میری توڑ دیا ہے بہار نے

مضطرؔ جنونِ شوق کی میرے نوازشیں
تلوؤں کو تیرے چوما ہے صحرا کے خار نے

حواس و ہوش کھو کے تیرے دیوانے کہاں جاتے
بجز صحرا جنوں میں دل کو بہلانے کہاں جاتے

جبینِ شوق نقشِ پا پہ گر جھکتی نہ اے ہمدم
خدا جانے پری خانے، صنم خانے کہاں جاتے

ہمارے دَم قدم سے ہے یہ زینت پیرِ میخانہ
نہ ہوتے میکدے کے ہم تو میخانے کہاں جاتے

تڑپ کر جان دے دی شمعِ محفل پہ غنیمت ہے
وفا کی داد پانے ورنہ پروانے کہاں جاتے

مناؤ خیر توبہ کرتے کرتے رہ گئے ورنہ
صراحی یہ کہاں جاتی یہ پیمانے کہاں جاتے

اُلجھ کر رہ گئے ہم ہی رہِ منزل کے پیچوں میں
تری اُلجھی ہوئی زلفوں کو سلجھانے کہاں جاتے

بہت اچھا ہوا دل ہی تصدق ہو گیا اُن پر
وگرنہ ہم دلِ مضطر کو بہلانے کہاں جاتے

خبر بھی ہے تجھے تیرے چلے جانے پہ کیا گزری
پرستاروں پہ کیا گزری صنم خانے پہ کیا گزری

پرے دیر و حرم سے بھی گئے کیونکر خدا جانے
حدودِ عقل سے آگے نکل جانے پہ کیا گزری

گئے تھے بن سنور کے آئینہ خانے میں وہ اِک دن
کسے معلوم ہے پھر آئینہ خانے پہ کیا گزری

مرا دستِ جنوں آگے بڑھا ہے جیبِ داماں سے
خدارا اب نہ پوچھو کہ بہار آنے پہ کیا گزری

اجازت ہو تو اے پیرِ مغاں کیا پوچھ سکتا ہوں
کہ میرے بعد تجھ پہ تیرے میخانے پہ کیا گزری

سیّد انیس انورؔ

سیّد انیس الدین انورؔ ابن سیّد بشیر الدین، اکولہ
تاریخ پیدائش : ۱۵؍فروری ۱۹۳۳ء　　وفات : ۲۰۱۴ء
تعلیم : ایم۔اے۔بی۔ایڈ
"طلسمِ الفاظ" (شعری مجموعہ) ۱۹۷۹ء "سرابِ انا" "افسونِ خواب" (غیر مطبوعہ)

آنگن میں مرے دیکھئے کب پاؤں دھرے وہ　　جاتا ہوں قریب اس کے تو ہوتا ہے پرے وہ
باتوں میں لبھا کر کہیں گم ہو گیا اک دن　　شاید مجھے یاد آتا ہے اک شخص، ارے وہ!
اس چاند سے چہرے کی چمک اور کہیں ہے؟　　لگتا ہے ستاروں سے سدا مانگ بھرے وہ
جاں دشمنِ جانی سے بچانی نہیں ممکن　　ہاں جان ہی دینی ہے کسی کو تو مرے وہ
بے خوف ہی جیتے رہو، مرنا ہے بہر حال　　بزدل ہے اگر کوئی تو دنیا سے ڈرے وہ
اس دَور میں اُلٹا ہُوا معیارِ شرافت　　کھوٹوں میں گنے جاتے ہیں ہم، اور کھرے وہ

سخن اک ناشنیدہ میں ندا ہونے سے پہلے تھا　　کہ جیسے حرفِ حق پنہاں صدا ہونے سے پہلے تھا
اِدھر فرعونیت کافی ہے تیری روسیاہی کو　　اُدھر تو بندۂ سرکش خدا ہونے سے پہلے تھا
درِ توبہ کھلا ہے، اب غلط ہے سوچنا تیرا　　بہت معصوم تو شاید سزا ہونے سے پہلے تھا
مری سیرت کی خوشبو اب ہواؤں میں مہکتی ہے　　نگر میں عطرِ تنہائی صبا ہونے سے پہلے تھا
اللہ اور اِلّا کا عقیدہ عین ایماں ہے　　مری رگ رگ میں یہ موجود لا ہونے سے پہلے تھا
عناصر متحد تھے جوہری ذرات یکجا تھے　　کبھی کو انتظارِ کن خلا ہونے سے پہلے تھا

راس آنے لگی ہے خاموشی
دل کو بھانے لگی ہے خاموشی

سلسلہ گفتگو کا ٹوٹ گیا
آنے جانے لگی ہے خاموشی

شورِ گویائی ہر طرف سُن کر
خوف کھانے لگی ہے خاموشی

اہلِ دل چُپ ہیں ماجرا کیا ہے
دل جلانے لگی ہے خاموشی

لامکاں اور مکاں کا رشتہ
کیوں چھپانے لگی ہے خاموشی

بولتے شہر ہنستے قریوں پر
اب تو چھانے لگی ہے خاموشی

بن کے بیٹھے ہیں گونگے اب ان کو
آزمانے لگی ہے خاموشی

ایک چُپ پر ہزار باتیں کیوں
اب بنانے لگی ہے خاموشی

خالی ذہنوں میں سانپ کی مانند
سرسرانے لگی ہے خاموشی

بے زبانی کا یہ تقاضا ہے
رنگ لانے لگی ہے خاموشی

بڑھایا ہاتھ مگر کچھ صلہ نہ ہاتھ آیا
کفِ تہی کے سفر میں گیا نہ ہاتھ آیا

گرہ میں کھولتا کیسی خرد اسیروں کی ؟
کہ ڈور اُلجھی ہوئی تھی سرا نہ ہاتھ آیا

یہ رسم خوب چلی ہے مرے زمانے میں
کہ ہاتھ لگ گیا اچھا، بُرا نہ ہاتھ آیا

لو ہاتھوں ہاتھ لُٹا ہے بہار کا خرمن
خزاں تو خوش ہوئی جیسے خزانہ ہاتھ آیا

میں اُس کے سامنے خاموش کیا رہا کہ اُسے
خطاب کرنے کا سب سے بہانہ ہاتھ آیا

سراب دیتا ہمیں کیا ہوس کے صحرا میں
سوائے مشتِ غبار، ہوا نہ ہاتھ آیا

مجال ہے یہ کسی کی، کوئی بشر یہ کہے؟
خدا خدا بھی کیا اور خدا نہ ہاتھ آیا!

محمد علی شاداںؔ

محمد علی خاں شاداںؔ ابن محمد نصیب خاں، اچل پور (امراوتی) موبائل : 7304079030
تاریخِ پیدائش : ۱۹؍مارچ ۱۹۳۳ء ملازمت : وودبھ مِل (سبکدوش)

جو کچھ ہے چھپی دل میں جو ذہن کے اندر ہے — وہ بات بہر صورت چہرے سے اُجاگر ہے
پتھر کی طرح جملے مت پھینک مری جانب — بوسیدہ بہت میرے احساس کی چادر ہے
لازم ہے پہن رکھیں خود اپنی حفاظت کو — تلوار تعصب کی لٹکی ہوئی سر پر ہے
وہ مجھ سے خیال اپنے پوشیدہ نہیں رکھتا — دشمن ہی سہی لیکن احباب سے بہتر ہے
تسکین کی باعث ہے پیاسے کے لیے شاداںؔ — اِک بوند ہی پانی کی دریا کے برابر ہے

ماضی کا آج دورِ طرب یاد آگیا — اپنی تباہیوں کا سبب یاد آگیا
جب جب بھی سر اُٹھانے لگا ذہن میں گنہ — تب تب خدا کا قہر و غضب یاد آگیا
تضحیک اس غریب کی کرتا بھی کیسے میں — مجھ کو بھی میرا دستِ طلب یاد آگیا
حیرت ہے دشمنوں کو مرے حال پر اگر — اپنوں کا وہ کرم ہے کہ رب یاد آگیا
اب تو ادب برائے ادب بھی ادب نہیں — اسلاف کا وہ دورِ ادب یاد آگیا
چھلکا رہا ہے جام سے مئے کس کے نام کی — شاداںؔ کو کون تشنۂ لب یاد آگیا

میں نہ ترسوں گا کبھی ساقی جو ترسانے لگے
ہاتھ کے چھالے بھی مجھ کو اب تو پیمانے لگے
ترک پینا مئے کیا، اوروں کے غم کھانے لگے
کیف بخش اب ہاتھ کے چھالوں کے پیمانے لگے
کل تر و تازہ تھے گلشن میں جو چہروں کے گلاب
دھوپ میں فکروں کی آج آئے تو مرجھانے لگے
دل کا چھالا زخم کی صورت نہ کر لے اختیار
حال پر اب میرے اپنے رحم فرمانے لگے
کل کا سورج امن کا پیغام لائے یا خدا
"شام آئی پھر گھروں میں لوگ گھبرانے لگے"
آج یہ محفل میں کس نے دی اُلٹ رُخ سے نقاب
روشنی بڑھنے لگی اور دیپ شرمانے لگے
قوم پھر پائے گی شاداںؔ خوابِ غفلت سے نجات
رفتہ رفتہ ہوش میں دیوانے اب آنے لگے

یہ تمکنت یہ تکبّر یہ شان رہنے دو
جو ہے تمہارے بھرم کا مکان رہنے دو
سوالِ عمر نہ پیش آئے نیک مقصد میں
ارادے اپنے ہمیشہ جوان رہنے دو
انھیں کو دیکھ کے پہنچے گی نسل منزل تک
ہر اک قدم پہ لہو کے نشان رہنے دو
ہَوا کا رُخ ہو موافق یہ انتظار کرو
ابھی لپیٹے ہوئے بادبان رہنے دو
خوشی کے ساتھ اُڑاؤ گُلال سوئے فلک
مگر یہ سُن لو زمیں پر امان رہنے دو
کسی کی بات سکوں کا سبب ہے اے شاداںؔ
مری زبان پہ یہ اک داستان رہنے دو

سعد اللہ خاں اثرؔ ملکاپوری

سعد اللہ خاں اثرؔ، ملکاپور
درس وتدریس
تاریخ پیدائش : ۲۲ رنومبر ۱۹۳۳ء
مؤظف یاب مدرّس ممبئی میونسپل کارپوریشن

میں نے تم کو کیا سمجھا ہے ، ایسا تم نے سوچا کیا !
تم کیسے ہو ، تم کیا کیا ہو ، آئینہ بھی دیکھا کیا !
مجھ سے بہتر ہونگے لاکھوں ، میں لاکھوں میں بہتر ہوں
اس الجھن میں پڑنا بھی کیا ، اس اُلجھن میں رکھتا کیا !
مندر ، مسجد بنا گرنا ، سب مطلب کی باتیں ہیں
دونوں ہی اللہ کے گھر ہیں ، کون بتائے اچھا کیا !
کبتک جھوٹی آس پہ جی کے دل کے پھپھولے پھوڑے گا
خودداری کو بیچنے والے آخر تیرا ہوگا کیا !
ہم نے مانا بستی بستی آج اثرؔ کا چرچا ہے
اس بادل کا ذکر نہ کیجے "جو گرجا وہ برسا کیا" !

رنگ و نام و نسل کے جھگڑے مٹا لیجے ذرا
ہم گلے مل لیں گے یہ پردے اُٹھا لیجے ذرا
زلف کی ، رُخسار کی ، سُننے کو تب جی چاہے گا
آئینہ آپ اپنے چہرے کو دکھا لیجے ذرا
گُل کی ، بلبل کی ، بہاروں کی ، چمن کی پھر کبھی
اُجڑے اُجڑے آشیاں پہلے بسا لیجے ذرا
اُنگلیاں پھر میری جانب ، شوق سے لینا اُٹھا
اپنے دامن پر لگے دھبّے مِٹا لیجے ذرا
آپ کی ادنیٰ دعاؤں میں بھی آئے گا اثرؔ
دونوں ہاتھوں کو عقیدت سے اُٹھا لیجے ذرا

زرداروں کی وقعت کیا ہے کون یہ گوہر بانٹے گا
حُبِّ اُخوت ، مہر و محبت دل کا تونگر بانٹے گا

میں نے اَن دیکھے پر اپنا سب کچھ قرباں کر ڈالا
تو اے برہمن کیا کر بیٹھا ، تو کیا پتھر بانٹے گا!

اپنے منھ سے اپنے گھر کی بات کہو نادانی ہے
ایک ہی ماں کا جایا ہو کر کہتا ہے گھر بانٹے گا

جھوٹ ، کپٹ ، چھل ، بے ایمانی ، چندہ ، رشوت ، لوٹ کھسوٹ
جس کی سیاست ایسی ہوگی کیا وہ لیڈر بانٹے گا

بے مہروں کے شہر میں آخر کس سے یہ اُمید کریں
اس دنیا میں کون اثرؔ کے درد برابر بانٹے گا

پیڑ احساس کا جذبات کا پھل دیتا ہے
یہ شجر آج کا حاصل ہمیں کل دیتا ہے

حوصلہ کہتے ہیں اک راہِ عمل دیتا ہے
حوصلہ مند تو تقدیر بدل دیتا ہے

سب کی یکساں ہی گذر جائے کہاں ہے ممکن
وہ تو نادان ہے جو مونچھ پہ بَل دیتا ہے

سانپ فطرت میں فقط سانپ ہُوا کرتا ہے
دودھ پی لیتا ہے اور زہر اُگل دیتا ہے

اے اثرؔ کہتی ہے دنیا جسے انساں کا ضمیر
فیصلہ جب بھی یہ دیتا ہے اٹل دیتا ہے

عبدالستار اختر انصاری

عبدالستار اختر انصاری ابن شیخ احمد مرشد انصاری، اکولہ

سنِ پیدائش : ۱۹۳۳ء وفات : ۱۹۸۸ء

ایم۔اے۔بی۔ایڈ موظف مدرس ضلع پریشد ہائی اسکول، اکولہ

پیار کا ہے خراج رہنے دو — دل کے زخموں کی لاج رہنے دو

منھ نہ موڑو کبھی محبت سے — اپنے سر پر یہ تاج رہنے دو

ہم سمجھتے ہیں پیار کی نظریں — مت دِکھاؤ مزاج رہنے دو

گلشنِ زیست پہ چمن والو — پیار و اُلفت کا راج رہنے دو

عشق سے حُسن مت جدا کرنا — ہے حسیں امتزاج رہنے دو

اہلِ حاجت کے کام کی خاطر — اپنی ہر احتیاج رہنے دو

عالمِ حسن ہے یہاں اختر — دل کا ہر اختراج رہنے دو

نصیب اپنے یہاں تم سے بہرہ ور نہ ہوئے — تمام عمر کبھی مرکزِ نظر نہ ہوئے

تمام عمر ہماری کچھ اس طرح گذری — تمہاری یاد سے اک لمحہ بے خبر نہ ہوئے

وہ کون سے ہیں مراحل رہِ محبت میں — جنونِ عشق و محبت سے بھی جو سر نہ ہوئے

تمہاری یادوں کے نغموں کی گونج کے صدقے — اداس دل کے ہمارے کبھی گھر نہ ہوئے

ہمارے خواب سلامت تصورات بخیر — نظر سے دور ہماری وہ رات بھر نہ ہوئے

پہنچتے لے کے اسے منزلِ محبت پر — نصیب ایسے زمانے کو راہبر نہ ہوئے

جو ضبطِ غم کے بھی قائل نہ ہوسکے اختر — وہی تو اشک کے قطرے ہوئے، گہر نہ ہوئے

ناز ہوتے نہ کہیں حُسن کے غمزے ہوتے ہم نہ ہوتے تو کہاں پیار کے چرچے ہوتے
آج نظروں میں تری ہم جو زمانے ہوتے کل فضاؤں میں بکھرتے ہوئے نغمے ہوتے
سائے زلفوں کے اگر آپ کے مہکے ہوتے پھول کاندھوں پہ لئے اپنے جنازے ہوتے
ہم جو ہوتے تری یادوں میں یقیناً شامل گوہرِ اشک تری آنکھ سے برسے ہوتے
دامنِ دل پہ انھیں ہم تو سجائے رکھتے مثلِ خنجر نہ اگر آپ کے جملے ہوتے
اُف یہ تاریک فضاؤں کا سلگتا جادو کاش بکھرے تری یادوں کے اُجالے ہوتے
بدنصیبوں پہ کبھی یوں نہ برستے اخترؔ آتشِ غم میں اگر آپ بھی تڑپے ہوتے

یہ عشق، الم، غم، زنجیریں اک خواب کی لاکھوں تعبیریں
آنکھوں سے اُترتی سی دل میں کس چاند کی ہیں یہ تصویریں
سینوں میں اندھیروں کی جھانکو ہیں لاکھوں مچلتی تنویریں
دیکھی ہیں محبت میں ہم نے آنکھوں سے بدلتی تقدیریں
ہے ان کا نصیبہ جود و کرم ہیں اپنا مقدر تعزیریں
اب عکس تمہارا ہے دل میں کس کام کی میرے، تصویریں
ہے دل کے لہو کی غمازی اخترؔ یہ تمہاری تحریریں

خواجہ امین الدین امینؔ

خواجہ امین الدین امینؔ ابن خواجہ شجاع الدین، اکولہ — تاریخ پیدائش : ۱ر جولائی ۱۹۳۴ء
رٹائرڈ کلرک میونسپل کارپوریشن، اکولہ

جانے کیا بات ہے کیوں شور مچا رکھا ہے
بات، بے بات کا افسانہ بنا رکھا ہے

کچھ نہ کچھ ہے تو کبھی آج ترے کوچے میں
جو یہ ہنگامے پہ ہنگامہ مچا رکھا ہے

جن کو پینے کا سلیقہ ہی نہیں آتا ہے
کیوں انھیں آپ نے مدہوش بنا رکھا ہے

ورنہ طوفاں نیا آنے کا سبب ہو جاتے
ہم نے جذبات کو سینے میں دبا رکھا ہے

کچھ کہو گے تو کوئی حل بھی نکل آئے گا
راز وہ کیا ہے کہ جو دل میں چھپا رکھا ہے

کوئی الزام برائی کا لگا دے نہ امینؔ
اپنے کردار کے دامن کو بچا رکھا ہے

دل پہ گذرے ہوئے حالات کسے پیش کروں
غم میں ڈوبے ہوئے لمحات کسے پیش کروں

جن سے اُمیدِ وفا تھی وہ ستمگر نکلے
اپنی بربادی کی ہر بات کسے پیش کروں

کتنے ارمان خدا جانے بھرے ہیں دل میں
آرزوؤں کی یہ سوغات کسے پیش کروں

یادِ ماضی کو بھلاؤں تو بھلاؤں کیسے
یہ گذرتے ہوئے دن رات کسے پیش کروں

اک تڑپ سی ہے جو بے چین کیا کرتی ہے
دل میں اُٹھتے ہوئے جذبات کسے پیش کروں

ہمنوا کوئی نہیں اپنا زمانے میں امینؔ
اپنے دل سوز یہ نغمات کسے پیش کروں

ہم اہلِ فن نہیں ہیں یا اہلِ سخن نہیں
کیا انجمن ہماری ، کوئی انجمن نہیں

یہ انقلاب وقت کی سازش ہے اِن دنوں
ہم باغباں بھی ہو کے ہمارا چمن نہیں

کب تک بہے گا خوں یہاں انسانیت کا دوست
یہ دشمنانِ امن کا اچھا چلن نہیں

ہم پر اُٹھائے انگلیاں دنیا ، اگرچہ ہم
پہنے ہوئے تو ایسا کوئی پیرہن نہیں

کتنی عجیب بات ہے ہم اجنبی سے ہیں
رہ کر وطن میں پھر بھی ہمارا وطن نہیں

گھبرا کے حادثوں سے کہاں جاؤ گے امینؔ
وہ کون سی جگہ ہے کہ جو پر فتن نہیں

بدلے نہ گئے ہم سے تو حالات ابھی تک
کرتے ہی رہے لوگ سوالات ابھی تک

اِک ہم کہ کہیں آشیاں تعمیر نہ کر پائے
وہ محو بہ تعمیر محلات ابھی تک

اک بار ہی دنیا سے ذرا دل جو لگایا
دامن سے ہیں لپٹی ہوئی آفات ابھی تک

کرتی رہیں انسان کو انسان سے بدظن
تہذیب نوی ، تیری خرافات ابھی تک

ملتا ہی نہیں کوئی ہمیں پوچھنے والا
سینے میں دبا رکھے ہیں جذبات ابھی تک

دل ٹوٹ سا جاتا ہے تڑپ جاتا ہوں اُس دم
یاد آتے ہیں رہ رہ کے وہ لمحات ابھی تک

اِک ہم ہی امینؔ وقت کا پیغام نہ سمجھے
ممکن ہے بدل جاتے یہ حالات ابھی تک

عظیم انجم

عبدالعظیم خاں ابن عبدالعزیز خاں، شے گاؤں ضلع بلڈانہ

سنِ پیدائش : ۱۹۳۴ء وفات : ۳ر اگست ۱۹۹۷ء

تعلیم : میٹریکیولیشن پیشہ : میکانیکل انجینئر

''دھویں کے پتلے'' (مجموعۂ قطعات) شعری مجموعہ (غیر مطبوعہ)

روح میں درد کا پیوند لگانے والا
تیرا ہر خواب ہے پلکوں کو جلانے والا

اک تصور کے سوا رات کے سناٹے میں
کون ہے بند کواڑوں کو ہلانے والا

میری حسرت ہے سلیقے سے کوئی تیر چلے
کیا یہاں کوئی نہیں ٹھیک نشانے والا

ضد ہے قاتل کو اسے بخش دیا جائے گا
جرم تسلیم کرے، دار پہ جانے والا

آج کچھ درد کی شدت میں کمی ہے شاید
سو گیا ہے مرے زخموں کا جگانے والا

مجھ کو یوں پڑھ کے بھی بھول گئے ہیں انجم
جیسے مَیں ہوں کوئی کردار فسانے والا

ساتھ چل پڑی تنہا ساتھ رہ گئی تنہا
کتنی با وفا نکلی میری بے بسی تنہا

وقت پھر مہرباں ہے کٹ گئے سبھی ساتھی
زندگی کی راہوں میں رہ گیا کوئی تنہا

آپ کی نوازش ہے آپ کی توجہ سے
سرگراں ہے برسوں سے ایک اجنبی تنہا

یہ جنوں کی پابندی یہ خرد کی تعزیریں
کس طرح نباہے گی ایک زندگی تنہا

ہر طرف مسلط ہے اک مہیب سناٹا
ہاں مگر دھڑکتا ہے دل کبھی کبھی تنہا

انجم شکستہ نے میکدے سے کیا پایا
ایک جام ٹوٹا سا ایک تشنگی تنہا

مرے وجود میں پیوست غم کے تیروں کو
خدا بنائے رکھے ہاتھ کی لکیروں کو

خود اپنے گھر میں نہیں آج عصمتیں محفوظ
نگر کے بیچ بھی خطرہ ہے راہ گیروں کو

لہو دیا ہے چلو آج دل بھی دے آئیں
دلوں کی سخت ضرورت ہے کچھ امیروں کو

ہنر نہ دیکھ سکی کوئی آنکھ بھی لیکن
ہمارے عیب نظر آئے بے بصیروں کو

خلوص چاہیئے انجم تو جھونپڑوں میں چلو
محل سے بھیک ملی ہے کبھی فقیروں کو

رونے سے کم ہُوا نہ ہمارے جگر کا بوجھ
دامن پہ آکے ٹھہر گیا چشمِ تر کا بوجھ

کل ہم نے اپنے سر پہ اُٹھالی تھی کائنات
اُٹھتا نہیں ہے آج مگر اپنے سر کا بوجھ

وہ دور اپنے بام سے جھانکا ہے پھر کوئی
اب آسماں اُتار کے پھینکے قمر کا بوجھ

وہ پوچھتے ہیں آج مری اُلجھنوں کی بات
شاید چھتیں اُٹھائیں گی دیوار و در کا بوجھ

انجم وہیں پہ ٹوٹ گئے سارے سلسلے
ان سے نہ اُٹھ سکا تری تشنہ نظر کا بوجھ

داؤد خاں رازؔ

داؤد خاں رازؔ ابن دولہے خاں، اکولہ — سن پیدائش : ۱۹۳۴ء
ایچ۔ ایس۔ ایس۔ سی — ملازم واٹر سپلائر، میونسپل کمیٹی، اکولہ

پہنا بھی کچھ زمانے نے ایسا لباس ہے ماحول پہ زمانے کے غیرت اُداس ہے
وہ بھول جائیں ہم کو تو ہے ان کا ظرف یہ ہم کو تو اب بھی اُن کی محبت کا پاس ہے
چہرے سے اپنے زلف ہٹا دیجئے ذرا بیتاب دل ہے، دید کی آنکھوں کو پیاس ہے
اب تو تمہارے غم کے سہارے ہے زندگی ہم کو خوشی زمانے کی آئی نہ راس ہے
دل توڑنے سے پہلے ذرا یہ بھی سوچئے ہر لمحہ موت زندگی کے آس پاس ہے
سمجھے گا رازؔ کون یہاں تیرے درد کو کس کی نگاہ اتنی قیافہ شناس ہے

یہ کالی گھٹا اُٹھ کے میخانوں کے سر آئی گردش یہ زمانے کی پیمانوں کے سر آئی
گلشن پہ گری بجلی اور آگ لگی جس دم یہ آگ جو پھیلی تو کاشانوں کے سر آئی
آتے ہی بہاروں کے پھر چاک ہوئے دامن پھر صحرا نوردی یہ دیوانوں کے سر آئی
دے کر بھی وفا میں جاں الزامِ جفا آیا رسوائی محبت میں، نادانوں کے سر آئی
موجوں نے ڈبویا ہے ساحل پہ سفینے کو قسمت کی برائی تھی طوفانوں کے سر آئی
اے رازؔ مجھے ملتی جو بھی تھی سزا ملتی کیوں میری خطا سارے بیگانوں کے سر آئی

بتا یہ کون سی منزل ہے، اے عمرِ رواں مجھ کو
نظر آتا نہیں خود کا بھی اب سایہ جہاں مجھ کو

یہ ہے عزمِ جواں میرا نشیمن پھر بنالوں گا
جلانے کا نہیں احساس اے برقِ تپاں مجھ کو

بچھڑ کر کارواں سے میں بھٹکتا ہی رہا ہرسو
نظر آئی نہ منزل اور نہ گردِ کارواں مجھ کو

مسیحا زہر دے دے یا علاجِ دردوغم کردے
کبھی لینے نہ دے گا چین یہ دردِ نہاں مجھ کو

عزائم لیکے اٹھا ہوں، اٹل میرے ارادے ہیں
کبھی نیچا دکھا سکتا نہیں تو آسماں مجھ کو

جہاں شرمندۂ تعبیر ہے فطرت زمانے کی
خلوصِ آدمیت رازؔ لائی ہے وہاں مجھ کو

وہ زندگی کی ہار سے پہلے گذر گئی
اک داستاں بہار سے پہلے گذر گئی

وہ بات اعتبار کے قابل نہیں رہی
جو بات اعتبار سے پہلے گذر گئی

آنکھوں سے دیکھتے رہے دل کی تباہیاں
دل کی لگی قرار سے پہلے گذر گئی

ہوتے ہیں آج تک بھی خزاں ہی کے تذکرے
آئی بھی اور بہار سے پہلے گذر گئی

زاہد کی پارسائی کا اب کچھ نہ پوچھئے
اک شئے تھی جو خمار سے پہلے گذر گئی

کیسے کہوں کہ لوٹ کے آجائے گی اے رازؔ
وہ زندگی جو پیار سے پہلے گذر گئی

جہانگیر خاں جوہرؔ

جہانگیر خاں جوہرؔ ابن منصب خاں منصبؔ، پاتور (اکولہ)
تاریخ پیدائش : ۲۲ر دسمبر ۱۹۳۲ء وفات : ۲۰۱۴ء
"حُسنِ تخیل" ۲۰۰۳ء، (شعری مجموعہ)

گریباں کو رفو کرنے لگے ہیں
نوازش خوب رو کرنے لگے ہیں

قیامت ہے، لبِ نازک سے اپنے
وہ شرحِ آرزو کرنے لگے ہیں

سرِ مقتل نہ جانے کس کا خوں ہے
فرشتے بھی وضو کرنے لگے ہیں

نہ جانے سوجھی کیا، بیٹھے بٹھائے
تمھاری آرزو کرنے لگے ہیں

نگاہوں سے کبھی جو بولتے تھے
زباں سے گفتگو کرنے لگے ہیں

ازل سے گم ہے جو پردوں میں جوہرؔ
اُسی کی جستجو کرنے لگے ہیں

جاہ و حشمت نہیں جلال نہیں
پھر بھی چھیڑے کوئی مجال نہیں

عزتِ نفس سب کو پیاری ہے
فرد یا قوم کا سوال نہیں

ہاں وہ بے حد حسیں سہی لیکن
بزمِ عالم میں بے مثال نہیں

کیسے شکوے گلے کہ مدت سے
ہجر ہی ہجر ہے وصال نہیں

میری ہستی وجود رکھتی ہے
میں کسی ذہن کا خیال نہیں

اپنے ماضی پہ صرف ناز کرے
اتنا گذرا ہُوا بھی حال نہیں

اپنے فن کے دکھایئے جوہرؔ
شعر کہنا کوئی کمال نہیں

نذرانے جذب و مستی کے، جلوؤں کی سوغات کہاں
شعر و سخن میں ندرتِ فن کی ملتی ہے بہتات کہاں
کیسے اشارے ، کیسے کنائے ، کیسا فسونِ حُسنِ بیاں
سیدھے سادے شعر ہیں اپنے اُن میں تلمیحات کہاں
کیفیتِ دل کا عالم کیا، روح کی سرشاری کیسی
ذرہ ذرہ وجد میں آئے اب ایسے نغمات کہاں
حُسن کی فطرت، عشق کی طینت، دین و سیاست موت و حیات
ان سب پر ہم لب کیا کھولیں ، اپنی یہ اوقات کہاں
شبنم جیسے اشک کے قطرے ، پھولوں جیسے گالوں پر
روکھے پھیکے شعروں میں اب ایسی تشبیہات کہاں

ممکن ہے کہاں؟ برسوں تلک شاد رہیں ہم
دنیا تو چاہتی ہے کہ برباد رہیں ہم
ہم مہر بلب ظلم و ستم پر رہیں کب تک
کب تک، ہدفِ ناوکِ بیداد رہیں ہم
تاریخ بدلنی ہے تو پھر کیسا تردّد
یہ بات الگ، چند ہی افراد رہیں ہم
کچھ ایسا کوئی کام کریں، روئے زمیں پر
لوگوں کو ہمیشہ کیلئے یاد رہیں ہم
مِٹنا تو بہت دور ہے ، لیکن تا قیامت
امکاں ہے کہ اس ملک میں آباد رہیں ہم
مستقبلِ انساں کا تقاضا ہے یہ جوہرؔ
کہ ایک نئی نسل کی بنیاد رہیں ہم

خلیل فرحتؔ

محمد خلیل فرحتؔ ابن شیخ منیر، کارنجہ (باسم)

تاریخ پیدائش: ۱۶/اپریل ۱۹۳۵ء وفات : ۱۹/اپریل ۲۰۰۷ء

"زخمِ ہنر" (مجموعۂ کلام)، "خلیل فرحت نمبر" (اسباق پونہ) سہ ماہی "اردو" امراوتی "گوشۂ خلیل فرحتؔ" (اودھ نامہ لکھنؤ)

سامنے سب مرے ہمدم و ہمنوا' سب مگر پشت پر وار کرتے ہوئے
دن میں پھولوں سے بھی نرم لہجہ مگر' رات راہوں کو پُر خار کرتے ہوئے

صاف گوئی نے غم کے سوا کیا دیا' پھر بھی ہم اپنی فطرت سے مجبور ہیں
جو قصیدہ نویسی میں ماہر تھے وہ' خوش ہیں توصیفِ سرکار کرتے ہوئے

اپنے اپنے سفر پر ہیں کب سے رواں' پھر بھی کیا بات ہے دونوں تھکتے نہیں
آپ راہوں میں کانٹے بچھاتے ہوئے ہم زمینوں کو گلزار کرتے ہوئے

جب ترنم کی میزان میں فن تلے اہلِ فن کے لئے مشورہ ہے مرا
سنگِ ادراک سے اپنا سر پھوڑ لیں آپ معیار معیار کرتے ہوئے

اپنی اپنی ضرورت انھیں کھینچ کر' پھر قصیدوں کے بازار میں لے گئی
میرے احباب کچھ دور تک ساتھ تھے' اپنے لہجوں کو تلوار کرتے ہوئے

ایک پل کی خوشی بھی میسر نہیں' زندگی کیا بخیلوں کی خیرات ہے
کٹ گئی زندگی یوں تو فرحتؔ مگر' ایک اک سانس دشوار کرتے ہوئے

دل سے مرے تنہائی کی شدت نہیں جاتی
اب تو بھی چلا آئے تو وحشت نہیں جاتی

اس دور کی تعلیم کا معیار عجب ہے
تعلیم تو آتی ہے جہالت نہیں جاتی

کیا سوچ کے امیدِ وفا باندھی تھی تم سے
اک عمر ہوئی دل کی ندامت نہیں جاتی

مفلس بھی تو خوددار ہُوا کرتے ہیں لوگو
غربت میں بھی انساں کی شرافت نہیں جاتی

لے جاتی ہیں اب تک بھی مری نیند چرا کر
اب تک بھی اُن آنکھوں کی شرارت نہیں جاتی

دے دیتا ہے اللہ مجھے حسبِ ضرورت
اب لے کے کسی در پہ ضرورت نہیں جاتی

سو بار تری جان پہ بن آئی ہے فرحتؔ
پھر بھی تری حق گوئی کی عادت نہیں جاتی

وفا نا آشناؤں میں وفا کی جستجو کب تک
دلِ سادہ مجھے رُسوا کرے گا کو بہ کو کب تک
ہُوا ہے چاک جن ہاتھوں سے امیدوں کا پیراہن
انہیں ہاتھوں کو ہم دیتے رہیں دادِ رفو کب تک
بہ ہر صورت دعاؤں پر مقدم ہے عمل زاہد
خمیدہ سر کہاں تک ، ہاتھ مصروفِ وضو کب تک
ہمیں اپنا مقدر اپنے ہاتھوں سے بنانا ہے
کہاں تک خود فراموشی ، فریبِ آرزو کب تک
بہاروں کو ترس جائے گا گلشن ہم نہ کہتے تھے
خزاں پروردہ ہاتھوں میں جہانِ رنگ و بو کب تک
کہاں تک عصمتیں نیلام ہونگی بے سہاروں کی
بہے گا شاہراہوں پہ غریبوں کا لہو کب تک
زمیں پھٹ جائے یا سر پر بلائے آسماں ٹوٹے
زباں بھی کھولئے فرحتؔ نظر سے گفتگو کب تک

نظر کی، روح کی، دل کی صعوبتیں بھی گئیں
گیا شباب تو وہ ساری اُلجھنیں بھی گئیں
گئی جوانی تو آئی شعور کی دولت
قدم قدم پہ زمانے سے رنجشیں بھی گئیں
شبِ وصال کا ارماں نہ فکرِ شامِ الم
وہ کاروبارِ جنوں کی نوازشیں بھی گئیں
سفید بال ہوئے تانک جھانک میں حائل
کہاں کا شوقِ نظارہ بصارتیں بھی گئیں
جنونِ عشق بھی رُخصت ہُوا شباب کے ساتھ
وہ رنجگوں کی پرانی روایتیں بھی گئیں
گناہ، حشر میں ٹھہری، گناہ کی حسرت
گناہ بھی نہ کئے اور جنتیں بھی گئیں
خیالِ گیسوئے جاناں ، سفید ریش میں گم
وہ چشم ولب کے تصور کی لذتیں بھی گئیں
بتوں کی چاہ نے کافر بنا دیا تھا ہمیں
خدا کا شکر ہے فرحتؔ وہ عادتیں بھی گئیں

سیّد متین الرحمٰن متینؔ

سیّد متین الرحمٰن متینؔ ابن سیّد امین الرحمٰن، اکولہ ایم۔اے(اردو)

تاریخِ پیدائش : ۶؍جون ۱۹۳۵ء وفات : ۲۸؍مئی ۲۰۰۹ء

ملازمت : پرچیز آفیسر وی لائیبل گروپ آف کمپنیز (بھوپال)

''فاصلے'' (غزلیات) ''اجنبی لڑکی'' (ناول) ''سناٹا گونجتا ہے'' (غزلیات دیوناگری) وغیرہ

۵۰؍سے زائد مضامین

ہم سے بچھڑے تو یہ دن کیسے گذارے لکھنا
کبھی پردیس سے خط نام ہمارے لکھنا

وہ جو کچھ لمحے گذارے تھے مرے ساتھ جہاں
کیسے لگتے ہیں وہ دریا کے کنارے لکھنا

چاندنی کرتی ہے سرگوشیاں اب بھی کہ نہیں
تم سے کیا کہتے ہیں جذبات تمھارے لکھنا

بھیج دینا ہمیں اک پھول' بجائے خط کے
کچھ ضروری نہیں لفظوں کے سہارے لکھنا

لوگ ہر بات کا افسانہ بنا دیتے ہیں
ڈائری میں نہ کبھی شعر ہمارے لکھنا

کل یونہی تیرا تذکرہ نکلا
پھر تو باتوں کا سلسلہ نکلا

غم ہی تقدیر کا لکھا نکلا
جس کو چاہا وہ بیوفا نکلا

عشق میں بھی سیاستیں دیکھیں
قربتوں میں بھی فاصلہ نکلا

اپنا چہرہ ہی معتبر پایا
جھوٹا ہر ایک آئینہ نکلا

غمِ دوراں کا تجربہ جو کیا
تیرا میرا معاملہ نکلا

آ گئی درمیان جب دُنیا
پھر نہ کوئی بھی راستہ نکلا

سارے آزار ہیں متینؔ وہی
شہر بھی دشتِ کربلا نکلا

دشتِ غم، تنہائی اور ویرانِ جاں رہ گیا
دوستو! بس اب یہی جینے کا ساماں رہ گیا

مختصر ہوتی گئی کچھ اس قدر شرحِ حیات
میری پلکوں پر فقط اک اشک لرزاں رہ گیا

اُڑ چکے سارے پرندے، جا چکی فصلِ بہار
زرد پتّوں سے ڈھکا ویران میداں رہ گیا

اس کی یادوں کو مٹا پایا نہ اپنے ذہن سے
جانے والے کا یہی بس مجھ پہ احساں رہ گیا

وہ ادھورے گیت کا ٹکڑا ہی بن پایا متینؔ
مَیں اُسے نغمہ بناتا، دل میں ارماں رہ گیا

اُس کے آگے، حالِ دل کا، اَن کہا رہ جائیگا
قربتوں کے درمیاں بھی فاصلہ رہ جائیگا

رُت ذرا بدلی تو اُڑ جائینگی سب مُرغابیاں
تُو اکیلا سبزہ زاروں میں کھڑا رہ جائیگا

وہ گذر جائیگا جھونکے کی طرح دہلیز سے
اور شہرِ دل میں آشوب ہَوا رہ جائیگا

تو نہ کر پائیگا اُس کو روکنے کا حوصلہ
بھیگی آنکھوں سے اُسے بس دیکھتا رہ جائیگا

ایک دن حالات اس کو دُور کر دینگے متینؔ
تیرے اِس سُونے مکاں میں رتجگا رہ جائیگا

سیّد غیاث الدین سلیمؔ

سیّد غیاث الدین سلیمؔ ابن سیّد بشیر الدین، اچلپور　　تعلیم : بی۔اے۔آر۔ایم۔پی

تاریخِ پیدائش : ۲۹؍اکتوبر ۱۹۳۵ء　وفات : ۲۶؍دسمبر ۱۹۸۹ء

ملازمت : ملٹری ہاسپٹل کامٹی (رضا کارانہ سبکدوشی)

''جادہ و منزل'' (شعری مجموعہ) ۲۰۰۲ء

شوق کی کیا ہے ادا دیکھ لے پروانے میں　جس کو تاخیر گوارا نہیں مٹ جانے میں
رُخ پہ وحشت، نمی آنکھوں میں، لبوں پر آہیں　کس کے غم سے مچی ہلچل ہے یہ دیوانے میں
وہ نظر آئیں تو پھر کون کسی کو دیکھے　امتحاں تو ہے وفا کا نہ نظر آنے میں
وجہِ تسکیں ہے اگر کچھ تو خوشنودی تیری　کیا کشش اہلِ محبت کو جزا پانے میں
ان کے قرباں کہ ہمیں راہ دکھا دی گھر کی　کیا ہلاکت کے سوا اور تھا ویرانے میں
قلب و جاں فکرِ دو عالم سے رہائی پالیں　بھر دے ساقی مئے وحدت مرے پیمانے میں
ساتھ ایمان کے پا جائیں سلیمؔ اس سے نجات　مطمئن کون ہے دنیا کے بلا خانے میں

ایسا ہے کہاں کوئی حاصل ہے سکوں جس کو　لیکن وہ جسے تیرا دیدار میسر ہے
سب کی ہے نظر ان پر مرعوب ہیں سب ان سے　امید ہے اللہ سے، اللہ کا جنھیں ڈر ہے
کیا خوف جہنم کا فردوس کی لالچ کیا　کیا اہلِ محبت کا انداز ہے تیور ہے
ہونٹوں پہ خموشی ہے نظریں ہیں جھکی پھر بھی　اظہارِ تمنا کا الزام مرے سر ہے
ہے پاسِ رضا مجھ کو پھر عرض کروں کیوں کر　معلوم سلیمؔ اس کو حالِ دلِ مضطر ہے

ہو کاش یہ شعور کہ ہیں میہماں کہیں
احساسِ میزباں پہ نہ ہم ہوں گراں کہیں

یہ بھی خیال رکھتے ہیں کچھ ذاکرانِ حق
کہتی نہ ہو کچھ اور عمل کی زباں کہیں

ہم آشنائے ذات وہ بیگانۂ صفات
یہ بات دوستی کے ہے شایانِ شاں کہیں

عرفانِ حق کے حق میں ملی ہے خرد ہمیں
دولت یہ بے پناہ نہ ہو رائیگاں کہیں

چشمِ طلب میں کوئی سمائے محال ہے
حُسنِ رضائے یار نظر آئے ہاں کہیں

راہِ وفا میں اس لیے پھرتا ہوں سر بکف
مِل جائے کب وہ دشمنِ آرامِ جاں کہیں

تیری طلب نہیں ہے مری جاں کہ جا سکے
لیتا ہے اس طرح بھی کوئی امتحاں کہیں

ہم رہروانِ شوق ہیں منزل کی فکر کیا
لے جائیں نقشِ پا ترے ہم کو جہاں کہیں

کرتے نہیں کسی پہ عیاں ہم کہ اے سلیمؔ
درمانِ زندگی ہو یہ دردِ نہاں کہیں

کیوں نہ اے دل جفا کرے کوئی
رسمِ الفت ہے کیا کرے کوئی

لاکھ نالہ کیا کرے کوئی
نہیں ممکن رہا کرے کوئی

جب نہ باقی ہو قوتِ پرواز
کیا ستم ہے رہا کرے کوئی

"مرضِ عشق کا علاج نہیں"
کیا دلِ مبتلا کرے کوئی

دیکھ لے تجھ کو پھر کہاں ممکن
خواہشِ ماسوا کرے کوئی

ضبطِ غم کا ہمیں بھی دعویٰ ہے
ہے جو ظالم ہُوا کرے کوئی

دردِ الفت ہے زندگی میری
یہ سمجھ کر دوا کرے کوئی

ذاتِ واحد ہے پیکرِ انصاف
اس کی تعریف کیا کرے کوئی

جلوہ فرما کہاں نہیں وہ سلیمؔ
دیدۂ دل تو وا کرے کوئی

عبدالحفیظ خلش تسکینی

عبدالحفیظ خلش ابن شیخ وزیر سوداگر اچلپور تاریخ پیدائش : ۱۹ ر نومبر ۱۹۳۵ء
ایم۔اے (اردو، فارسی) بی۔ایڈ
رٹائرڈ (ایکسٹینشن آفیسر) لکچرر جونیئر کالج ڈی۔ایڈ کالج، بالاپور
"پیاس کا سیلاب" "تجربوں کے چراغ" (شعری مجموعے)

وقت کے آسیب سے ڈر جائیں کیا
موت سے بھی پہلے ہم مر جائیں کیا

بیچ میں در آئے ہے میری وفا
تہمتیں اس شوخ کے سر جائیں کیا

فرق عادت میں ابھی آیا نہیں
ہم حرم، مے خانہ ہو کر جائیں کیا

ہوگئی ہے کیوں تمہاری آنکھ نم
ہم یہاں کچھ دیر رُک کر جائیں کیا

زندگی کی دلکشی کم تو نہیں
آپ کی خاطر سبھی مر جائیں کیا

آج کل ماحول اچھا ہوگیا
دل میں جو ٹھانی ہے ہم کر جائیں کیا

جن میں اُن کا قُرب حاصل تھا خلش
میری آنکھوں سے وہ منظر جائیں کیا

خدشۂ برق و شرر یاد آیا
میں جہاں بھی گیا گھر یاد آیا

بس ترا ہاتھ رہا یاد مجھے
سنگ یاد آیا نہ سر یاد آیا

ہر قدم پر تھا نشانِ منزل
تیرے ہمراہ سفر یاد آیا

اشکِ خورشید کہا تھا تجھ کو
تو بہت وقتِ سحر یاد آیا

دل مرا بحرِ الم میں ڈوبا
جب ترا دیدۂ تر یاد آیا

تھا مرے سر میں وفا کا سودا
نفع یاد آیا ضرر یاد آیا

اس قدر غم پہ نہ سوچا اے خلش
کیا کروگے وہ اگر یاد آیا

چمن کے دلنشیں خوش رنگ منظروں کے چراغ
یہ تتلیوں کی گذر گاہیں یہ گلوں کے چراغ
اندھیری رات میں برسات کی ، مری محسن
چمکتی بجلیاں یعنی یہ بادلوں کے چراغ
مرے قلم سے منور ہوں ذہن لوگو ں کے
جلاؤں بزم میں دنیا کی تجربوں کے چراغ
نظر سے چوما تھا میں نے تمہارے جلووں کو
بُھلائے جاتے نہیں ان حسیں رُتوں کے چراغ
قدم اُٹھانا کٹھن ہو گیا تری جانب
بجھا دیئے مری قسمت نے راستوں کے چراغ
انھیں بجھا ئے گی فوراً ہَوا زمانے کی
جو خواب دیکھیں گے محلوں کے جھونپڑوں کے چراغ

عشق کو پہنا رہا ہوں آہ و زاری کا لباس
تا کہ ہو مجھ کو میسّر فضلِ باری کا لباس
کب ہمارے واسطے لوٹیں گی خوشیاں زندگی
کب اُتارے گا زمانہ سوگواری کا لباس
راز میں پھر بھی ہمارا عشق رہ سکتا نہیں
زیبِ تن ہم لاکھ کرلیں پردہ داری کا لباس
میرے پیچھے پڑ گئے ہیں سیکڑوں بت، اے خُدا
کر عطا ایماں کو میرے پائیداری کا لباس
در حقیقت چھوڑ بیٹھے ہیں کبھی اب یہ چلن
اک دکھاوا ہے وفا کی پاسداری کا لباس
جان کر بازی لگانا جان پر آنے لگا
بس نمائش کے لئے ہے اب تو یاری کا لباس
لوگ اپنی عظمتوں کے گا رہے ہیں گن خلش
اور میں پہنے ہوئے ہوں انکساری کا لباس

عبداللہ خاں منظرؔ طالبی

عبداللہ خاں منظرؔ ابن منور خاں، اکولہ		سن پیدائش : ۱۹۳٦ء
تعلیم : میٹریکیولیشن
''عطائے غیب'' (شعری مجموعہ)

بجائے شبنمِ تازہ گلوں پہ خاک نہ ہو		بہار آئے مگر کوئی سینہ چاک نہ ہو
ہزار غم سے گذرنے کے بعد بھی اے دل		فسانہ اپنی محبت کا دردناک نہ ہو
بھرم کھلے نہ محبت کا اے دلِ وحشی		جنوں ہو جوش میں لیکن گریباں چاک نہ ہو
فضول ہے یہ تسلّی، تماشا، ہمدردی		مدد کا جذبہ اگر وجہِ اشتراک نہ ہو
ہماری راہ میں کانٹے کہاں سے آئیں گے		جو دشمنوں کے دِلوں پر ہماری دھاک نہ ہو
ہمارا خون تو شامل ہو غنچہ و گل میں		فضائے صحنِ چمن میں ہماری خاک نہ ہو
خدا کا شکر کہ دل میرا صاف ہے منظرؔ		مِلوں میں اور ملاقات میں تپاک نہ ہو

دیکھ لینا گردشِ ایام پھر		میرے ہاتھوں میں نہ آئے جام پھر
چڑھتے سورج کی پرستش کیا کروں		ڈوب جائیگا تو ہوگی شام پھر
پیاس کے ماروں کا ہنگامہ نہ پوچھ		میکدہ لوٹیں نہ تشنہ کام پھر
اہتمامِ گردشِ دوراں نہ پوچھ		صبح ہوتی ہے تو ہوگی شام پھر
ان کی زلفوں میں اُلجھ کر رہ گیا		آگیا ہوں کیا مَیں زیرِ دام پھر
لُوٹنے والوں نے لُوٹا میکدہ		میرے حصّے میں ہے خالی جام پھر
جس نے کی برباد منظرؔ زندگی		آپ کے ہونٹوں پہ اس کا نام پھر

رہ گیا کیا سماج مٹھی بھر لوگ کرتے ہیں راج مٹھی بھر
لوٹ لے کوئی عزت و عصمت اور دے دے اناج مٹھی بھر
سلطنت چار سمت پھیلی ہے اور سر پہ ہے تاج مٹھی بھر
پھر پلٹ کے وہ دَور آئے گا لوگ لیں گے خراج مٹھی بھر
کل زمانہ بلائے گا آواز لوگ آئے ہیں آج مٹھی بھر
فصل آئی ہے خوب کھیتوں میں نہیں گھر میں اناج مٹھی بھر
بر سرِ اقتدار ہیں منظرؔ لوگ بے تخت و تاج مٹھی بھر

کیوں حُسنِ تبسم کی تکمیل نہیں ہوتی ہر صورتِ گل ان کی تمثیل نہیں ہوتی
کرنے کو اُجالا تو کر دیتی ہے گر پڑ کر ہر برق سرِ منزل قندیل نہیں ہوتی
گُل بنتے ہوئے شاید دیکھا نہیں کلیوں کو کیا چیز جوانی میں تبدیل نہیں ہوتی
ہوتا نہ اگر دامن یہ چاک جنوں میں بھی رسوائی نہیں ہوتی ، تذلیل نہیں ہوتی
آنکھیں ہی سمجھتی ہیں آنکھوں کی زباں منظرؔ افسانۂ مبہم کی تفصیل نہیں ہوتی

حمید خاں اثرؔ

عبدالحمید خاں اثرؔ ابن احمد حسن خاں (مرحوم)، اکولہ — سنِ پیدائش : ۱۹۳۶ء

تعلیم : ایم۔اے (اردو، فارسی) بی، ایڈ — سنِ وفات : ۲۰۰۵ء

ملازمت : موظف انچارج پرنسپل ضلع پریشد اردو ہائی اسکول و جونیئر کالج اکولہ

''اشک و تبسم'' (شعری مجموعہ) ۲۰۰۵ء

جس کو احساسِ غم نہیں ہوتا — وہ کبھی چشم نم نہیں ہوتا
یوں تو عظمت میں اک فرشتے سے — کوئی انساں بھی کم نہیں ہوتا
عشق میں داغ دل خدا رکھے — چاند' سورج سے کم نہیں ہوتا
اشک مژگاں پہ ہی لرزتے ہیں — قطرہ دریا میں ضم نہیں ہوتا
مرگِ بلبل پہ آج گلشن میں — دیدۂ گل بھی نم نہیں ہوتا
چارہ سازوں کی اب تسلّی سے — صدمۂ ہجر کم نہیں ہوتا
بے وفا تو زمانہ رہتا ہے — با وفا بھی صنم نہیں ہوتا
عشق آساں نہیں کسی کا اثرؔ — کس کی زلفوں میں خم نہیں ہوتا

تیری محفل سے اٹھ کے دیوانے — چل دیئے پھر کہاں خدا جانے
کس کو معلوم تھا خوشی کیلئے — درد و غم بھی پڑیں گے اپنانے
جن سے مدّت کی تھی شناسائی — آج وہ بھی بنے ہیں بیگانے
یہ فسانے کبھی کے مٹ جاتے — بات رکھ لی مرے مسیحا نے
جن کا غم کے سوا کوئی نہ ہوا — وہ خوشی کو چلے ہیں اپنانے
پھر ہوا آج مہرباں ساقی — پھر چھلکنے لگے ہیں پیمانے
کتنی محتاط تھی مری نظریں — بن گئے پھر بھی کتنے افسانے
نہ ملا اے اثرؔ وہ بت اب تک — گو ہزاروں ملے صنم خانے

جفائیں ہیں ان کی مرا ضبطِ غم ہے
محبت کا ان کے بھی کیسا کرم ہے

سرِ بزم ان کی ہیں آنکھوں میں آنسو
لبوں پہ مرے میری رودادِ غم ہے

انہیں حسن کا اپنے احساس ہے جو
مری ہی نگاہوں کا سمجھو کرم ہے

تری بے رُخی بھی ہے گویا قیامت
ترا روٹھ جانا بھی گویا ستم ہے

نگاہیں مِلا کر عطا مجھ کو کرنا
ترا جام میرے لئے جامِ جم ہے

اثرؔ دل کی دنیا ہے سرشار اس دم
نگاہوں کے آگے دیارِ صنم ہے

ہر نفس وجہِ خوشی ہے آجکل
کیا سہانی زندگی ہے آجکل

لمحہ لمحہ کیف میں ڈوبا ہوا
میں ہوں میری میکشی ہے آجکل

بجھ گئے کب سے امیدوں کے چراغ
داغِ دل کی روشنی ہے آجکل

جس جگہ رہتی تھی بوئے گل وہیں
خاک سی کچھ اُڑ رہی ہے آجکل

کم نہیں غم سے ترے دنیا کا غم
اک مصیبت جیتے جی ہے آجکل

لوٹ لو مل کر بہارِ گلستاں
تو شگفتہ ہر کلی ہے آجکل

قاضی عبدالرؤف انجم

قاضی عبدالرؤف خاں انجم ابن عبدالحمید خاں، بارسی ٹاکلی (اکولہ)
تاریخ پیدائش : ۸/مارچ ۱۹۳۷ء
وظیفہ یاب نائب نگراں آفیسر تعلیم ضلع پریشد، اکولہ

رگِ جاں سے لپٹ کر سینۂ بسمل میں رہتا ہے
وہ بت چہرہ سہی لیکن ہمارے دل میں رہتا ہے

برتنے کا سلیقہ ہو اگر تو بات ہے بنتی
زباں کا حُسن تو الفاظ کی جھلمل میں رہتا ہے

سزا کا خوف تو گمراہ کر دیتا ہے منصف کو
ہمارا خون ناحق دیدۂ قاتل میں رہتا ہے

ہماری آنکھ میں رہتا ہے اس کا حسن کچھ ایسے
کوئی معشوق جیسے پردۂ محمل میں رہتا ہے

رکاوٹ کیوں بنے آزاد قوموں کی ترقی میں
وہ اک اندیشہ جو حالاتِ مستقبل میں رہتا ہے

مسافر جس کو اپنے عزم کا احساس ہوجائے
کبھی رستے میں رہتا ہے کبھی منزل میں رہتا ہے

انا جب سان چڑھتی ہے تو جذبے کاٹ دیتی ہے
دِلوں میں جب اُتر جاتی ہے رشتے کاٹ دیتی ہے

جلا دیتی ہے الفت کی وفا کی ساری تعمیریں
ہوس کی آگ برسوں کے تقاضے کاٹ دیتی ہے

مقرر دِل نشیں لہجہ بھی اپنائے تو کیا کہنا
ذرا سی بات لوگوں کے کلیجے کاٹ دیتی ہے

عدالت کی کسوٹی پر کسا جاتا ہے جب مجرم
قلم کی ایک جنبش سارے حیلے کاٹ دیتی ہے

ہمارا حوصلہ ہی کامیابی کی ضمانت ہے
ندی چڑھ جائے تو دونوں کنارے کاٹ دیتی ہے

مہارت بھی اگر ہوجائے شامل جذبِ صادق میں
تو کچی ڈور بھی مضبوط دھاگے کاٹ دیتی ہے

نہیں کم مائیگی کچھ باعثِ تحقیر اے انجم
کنی ہیرے کی چلتی ہے تو شیشے کاٹ دیتی ہے

اخلاص کی قدروں کا سوالی ہے تو، لا ہاتھ
ہم لوگ اسی شہر کے باسی ہیں مِلا ہاتھ

لوگوں نے شگوں ڈھونڈ لیا شہر میں جا کر
ہم ڈھونڈنے جاتے ہیں تو آتی ہے بلا ہاتھ

دریا کے تلاطم سے تڑپنے کی ادا سیکھ
جینا ہے تو منجدھار کے اندر بھی ہِلا ہاتھ

رُخصت ہوئی فرعون کے محلوں سے خدائی
نکلا جو گریبان سے اک نور بھرا ہاتھ

جینے کی تمنا تھی کہ تھا آخری پیغام
آتا تھا نظر ڈوبنے والے کا اُٹھا ہاتھ

لگتا ہے کہ مابین ہے میلوں کی مسافت
تھا اس کا مرا فاصلہ بس ہاتھ سَوا ہاتھ

تشکیک کے گرداب ڈبوتے ہیں الٰہی
ڈھونڈے ہے ترے ہاتھ کو ایسے میں مرا ہاتھ

انجم یہاں صف آرا ہیں جادوئی سنپولے
جینا ہے تو کر سحر شکن ایک عصا ہاتھ

یاد گزرے ہوئے لمحوں کی سزا ہو جیسے
پُر سکوں جھیل میں کنکر سا گرا ہو جیسے

دل نے بھولے سے ترا نام لیا ہے جب بھی
بند کمرے میں کوئی ساز بجا ہو جیسے

لمس پا کے وہ بکھرنا تری رعنائی کا
شاخ نے ساتھ ہواؤں کا دِیا ہو جیسے

مسکراہٹ ہے کہ قاصد کوئی پیغام لیے
اوٹ میں بند دریچے کی کھڑا ہو جیسے

تنگ بستر میں تعیش کا سنہری سپنا
زرد پتّوں میں کوئی پھوُل کِھلا ہو جیسے

صبح دَم وہ تری انگڑائی کا عالم توبہ
رات کا مست بدن ٹوٹ رہا ہو جیسے

دیکھ محفل میں دھواں پھیل گیا ہے انجم
مَیں نے بھولے سے ترا نام لیا ہو جیسے

یٰسینؔ براری

محمد یسین ابن محمد یعقوب، کوٹھل (ضلع بلڈانہ) تاریخِ پیدائش : ۱۲؍جولائی ۱۹۳۷ء
''فصلِ گل''''عروسِ سخن'' (مجموعہ ہائے غزلیات زیرِ ترتیب)

ماجرا الفت کا تیری اور ہم لکھیں گے کیا
پیار، تجھ سے ہوگیا ہے اس کو پھر بھولیں گے کیا

کاش تم یہ فیصلہ کر جاتے اپنے پیار کا
اپنی قسمت آزما کر بزم میں دیکھیں گے کیا

آرزوئیں ساری بر آئیں گی کیسے ؟ سوچئے
یہ سوال اپنے ہی قلب و جاں سے ہم پوچھیں گے کیا

اس کا آنا ہے یقیناً وہ تو آئے گی ، مگر
''موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھیں گے کیا''

رزق دینے والا تو ہم کو نظر آتا نہیں
جو مقدر ہو چکا ہے اُس سے اور پائیں گے کیا

حق پرستی اور صداقت کا سبق ہم نے دیا
دنیا والو سے بھلا یٰسینؔ ہم سیکھیں گے کیا

انسان سے انسان کو نفرت نہیں اچھی
احسان جتانے کی بھی عادت نہیں اچھی

بھائی کی برائی جو کیا کرتا ہے ہر دم
ہر ایسے منافق کی محبت نہیں اچھی

ذلت کے سوا اور نہ کچھ اس کو ملے گا
مکار و گنہگار کی صحبت نہیں اچھی

کرتا ہے امانت میں خیانت جو سراسر
ہر ایسے بشر سے کوئی نسبت نہیں اچھی

آئے نہ کبھی کام غریبوں کے تو اے دوست
انبار ہو دولت کا وہ دولت نہیں اچھی

گلشن کے سنورنے میں لہو ہم نے دیا ہے
حقدارِ گلستاں سے بغاوت نہیں اچھی

انصاف غریبوں کو جو منصف نہ دلائے
ہو ایسی جہاں پر، وہ عدالت نہیں اچھی

یٰسینؔ جو فطرت ہے بدلتی نہیں ، لیکن
ہے وقت بدل جو تری عادت نہیں اچھی

محبت کرنے والوں کی عنایت بھی ضروری ہے
جو ہے سچی محبت تو صداقت بھی ضروری ہے
مسلماں ہو کہ ہندو ہو، یہودی ہو کہ عیسائی
خدا کے ایک اک بندے پہ طاعت بھی ضروری ہے
گنہ کوئی اگر ہو جائے تم سے جانے انجانے
بہانا اشک تم بے حد ندامت بھی ضروری ہے
خدا کا واسطہ ظالم کو دیکر پہلے سمجھاؤ
جو نہ مانے کسی سے تو عداوت بھی ضروری ہے
زمانے بھر کے شعبوں میں سبق ایمان کا دینا
اگر ہے سرخرو ہونا صداقت بھی ضروری ہے
نکل آؤ غمِ ضبط و الم سے آج پھر یٰسینؔ
مظالم ڈھانے والوں سے بغاوت بھی ضروری ہے

یہ جو احباب ہیں میرے بھی کترانے لگتے ہیں
نہ جانے اس غریبی سے یہ کیوں گھبرانے لگتے ہیں
جو سچ کہتا ہوں میں تو کیوں برا لگتا ہے لوگوں کو
ہر اک جانب سے جو پتھر مرے گھر آنے لگتے ہیں
جو قاتل ہیں وہ پھرتے ہیں شریفوں کی طرح لیکن
ستم کیوں بے گناہوں پر ستمگر ڈھانے لگتے ہیں
امیر شہر جب دیکھو پڑا ہے عیش و عشرت میں
غریبی کے مگر دن کب اسے یاد آنے لگتے ہیں
گذاری ساتھ میں جن کے خوشی کی ہر گھڑی میں نے
نہ جانے کیوں مرے محبوب اب شرمانے لگتے ہیں
برائی اس قدر دنیا میں بڑھتی جائے ہے یٰسینؔ
جدھر دیکھو اُدھر میخانے ہی میخانے لگتے ہیں

غلام مصطفیٰ بیگ صابرؔ براری

غلام مصطفیٰ بیگ صابرؔ براری، ایوت محل تاریخ پیدائش : ۲۴؍جولائی ۱۹۳۷ء
نائب تحصیلدار (نائب وظیفہ یاب)

وہ کہہ رہے ہیں کہ یہ زیادتی ہے تھوڑی سی ابھی تو مشقِ ستم ہم نے کی ہے تھوڑی سی
مری روش میں ابھی کجروی ہے تھوڑی سی سنا ہے ایسی ہوا بھی اُڑی ہے تھوڑی سی
کہیں یہ ترکِ تعلق کی ابتدا تو نہیں اب اس کی یاد سے وابستگی ہے تھوڑی سی
قریب جو تھے مرے وہ قریب تر نہ ہوئے مرے خلوص میں شاید کمی ہے تھوڑی سی
ذرا تو اتنی ہی پی کر تو دیکھ اے واعظ جو میرے جام کی تہہ میں بچی ہے تھوڑی سی
خدا ملے گا نہ اُس وقت تک تمہیں صابرؔ جنونِ شوق میں جب تک خودی ہے تھوڑی سی

غم ہی غم ہے پوشیدہ ہر خوشی کے پردے میں موت ہی نظر آئی زندگی کے پردے میں
مُسکرا رہے ہیں وہ مجھ سے پھیر کر نظریں کچھ نوازشیں بھی ہیں بے رُخی کے پردے میں
صفحۂ ادب اس کے نام کو جگہ دے گا جو کہے بڑی باتیں، سادگی کے پردے میں
مطمئن رہو یارو، ہم کبھی کسی سے بھی دشمنی نہیں کرتے دوستی کے پردے میں
باز آگئے صابرؔ تم صنم پرستی سے یہ دروغ گوئی ہے راستی کے پردے میں

جب نظر آئے وہ مجھ کو بارِ دگر
معتبر ہوگئی اور تابِ نظر

کیوں نہ ملنے لگے پھر تمھاری خبر
میرا ذوقِ تجسس ہے معراج پر

آگہی مجھ کو ہوگی مرے حال سے
تبصرہ جب کرے گی تمھاری نظر

صرف اپنے ہی غم تک جو محدود ہو
بھیجتا ہوں میں لعنت اُس احساس پر

فکر انجام تو بعد کی بات ہے
ہو نظر پہلے مرکوز آغاز پر

عزم و ہمت کو اس وقت آواز دے
جب نظر آئے صابرؔ رہِ پُر خطر

مجھے جب شانِ ضبطِ غم دکھانے کا خیال آیا
وفورِ درد میں بھی مسکرانے کا خیال آیا

مری آہوں کو اب یہ گل کھلانے کا خیال آیا
حریمِ ناز میں ہلچل مچانے کا خیال آیا

تصور اس لئے چھوڑا ہے اُنکی چشمِ میگوں کا
مجھے توبہ پہ اپنی آنچ آنے کا خیال آیا

سہارا لے رہا ہوں اس لئے مَیں خود کلامی کا
مجھے اپنا اکیلا پن مٹانے کا خیال آیا

نہ جانے کون سے عالم میں ہوگا ان کا دیوانہ
اُسے جس وقت ان کو بھول جانے کا خیال آیا

خردمندوں کا کوئی کام شاید آ پڑا صابرؔ
اُنھیں اہلِ جنوں کے ناز اُٹھانے کا خیال آیا

ڈاکٹر محمد ذکاء الرحمٰن ذکا صدیقی

ڈاکٹر محمد ذکاء الرحمٰن صدیقی ابن حبیب الرحمٰن صدیقی، امراوتی (آبائی وطن میرٹھ)

تاریخِ پیدائش: ۱۳ ستمبر ۱۹۳ء　وفات: ۱۳ جون ۲۰۰۴ء

ایم۔اے۔(اردو، فارسی) پی۔ایچ۔ڈی　سابق صدر شعبۂ فارسی گورنمنٹ رضا کالج، رام پور

"آمدنامہ" ۱۹۷۲ء کراچی "آج کی شب پھر سناٹا" ۲۰۰۳ء کراچی (شعری مجموعے، مکاتب حبیب) (مرتب)

دل کی آواز ہے یوں، بانگِ درا ہو جیسے
اس کی سنتے ہیں، یہی راہ نما ہو جیسے

مست آنکھوں پہ جھکی پڑتی ہے یوں زُلفِ سیاہ
سرِ میخانہ دھواں دھار گھٹا ہو جیسے

ہم کو دعوائے انا الحق تو نہیں ہے لیکن
ایسا لگتا ہے یہ ہم نے ہی کہا ہو جیسے

جیے جاتے ہیں مگر جینے کا حاصل کیا ہے
زندگی بھی کسی عاشق کی دُعا ہو جیسے

واسطہ جن کو خدا سے ہے، خدا کو جانیں
اپنے بت کا تو یہ عالم ہے، خدا ہو جیسے

دین و دل رہنِ وفا کر کے ذکا یوں خوش ہیں
زندگی میں یہی اِک کام کیا ہو جیسے

سُلگتی آنکھوں میں محفل جما کے چھوڑ گیا
عجیب خواب تھا مجھ کو جگا کے چھوڑ گیا

ہماری پستیٔ دیوار کو ہے اس سے گلہ
ہوا کی زد پہ دِیا کیوں جلا کے چھوڑ گیا

عجیب شخص تھا، آیا تو ایک عالم تھا
گیا تو سب کو تماشا بنا کے چھوڑ گیا

مَیں گھر سے دشتِ جنوں کے سفر پہ نکلا تھا
تو پھر یہ کون ترے در پہ لا کے چھوڑ گیا

ہمیں کہ ہدیۂ جاں نذرِ دوست کرنا تھا
جنونِ شوق سرِ دار لا کے چھوڑ گیا

سارے دیے بجھائے گی، اب بھی ضد ہوا کی ہے
ہم اپنے گھر جلائیں گے بات اگر انا کی ہے
کلیوں کو لوٹتے ہوئے مجھ سے خزاں نے خود کہا
موسمِ گل پھر آئے گا ، رِیت یہی سدا کی ہے
رُک کے یہ کون دیکھتا ، کون کہاں بچھڑ گیا
ساری رفاقتِ سفر راہِ گریز پا کی ہے
تارے بھی کچھ دھواں دھواں ، چاند بھی کچھ بجھا بجھا
جیسے انھیں بھی کچھ خبر اس دلِ مبتلا کی ہے
آخر اُڑان کے حدود ، ایک وسیع دائرہ
ذہن میں چاہے جیسی بھی شکل کھلی فضا کی ہے
اور جلائے گی ذکاؔ ، کتنا ضرورتوں کی دھوپ
پیڑوں میں چھاؤں تک نہیں ، ہم کو طلب گھٹا کی ہے

کسی پہ ایسی بھی گذرے کبھی، خدا نہ کرے
کہ اپنے ہاتھوں کو تکتا رہے، دعا نہ کرے
کبھی کرے نہ کوئی اپنی حسرتوں کا شمار
اگر کرے بھی تو خوابوں سے ابتدا نہ کرے
ہمیشہ رہتی ہو تعبیر کی ہوس جس کو
وہ اپنی آنکھوں کو خوابوں سے آشنا نہ کرے
قفس تو ہے یہ ، مگر چمن سے گذرتی ہے
صبا سے کہہ دو کہ گلشن کا تذکرا نہ کرے
چراغ بجھنا ہی ٹھہرا تو خود بجھائیں گے ہم
ہمیں بھی ضد ہے کہ یہ فیصلہ ہوا نہ کرے
ذکاؔ یہ درد ہے اس کی عطا ، سو چارہ گری
وہی کرے تو کرے ، کوئی دوسرا نہ کرے

جوشؔ ادیب

سید مشتاق حسین جوشؔ ابن سید اصغر حسین، بارسی ٹاکلی (ضلع اکولہ)
تاریخِ پیدائش: ۱۶؍نومبر ۱۹۳۷ء
ادیب، کامل (علیگ)
"قصرِ جوش"، "شغاف"، "محبوبہ"، "کیف و کم" (شعری مجموعے)
"سویرا"، "قلم کی لرزش" (نثری کاوش)

عشق نے اپنا کرشمہ یہ دکھا کر چھوڑا
داغ دامن پہ مرے غم کا لگا کر چھوڑا

اے حیا تو نے جو گلشن میں لٹائی شبنم
میں نے ہر پھول کو پیمانہ بنا کر چھوڑا

سوزِ اُلفت کی قسم، آتشِ اُلفت کی قسم
بند کمرہ میں مجھے تو نے جلا کر چھوڑا

میری وحشت کا سبب پوچھتا پھرتا ہے وہی
مجھ کو جس شخص نے دیوانہ بنا کر چھوڑا

کون سی بزم رہی آہِ وفا سے خالی
ہر جگہ جوشؔ نے طوفان اٹھا کر چھوڑا

ہوتا ہے تجھے دیکھ کے خوش عربدہ جو بھی
اے دوست محبت کی ہری شاخ ہے تو بھی

ہر روز یہاں قتل کی سنتے ہیں کہانی
ارزاں ہے مرے شہر میں انساں کا لہو بھی

ممکن ہے عداوت میں کمی آگئی اُس کی
اب پوچھنے بیٹھا ہے مرا حال عدو بھی

اے ماہ جبیں ماہ لقا جوشؔ کے لب سے
دنیا نے سنا، سُن لے مرے حال کو تو بھی

اپنی محبت عام نہ کرنا ایسا کوئی کام نہ کرنا
اک دن تیرے ہو جائیں گے ایسا خیالِ خام نہ کرنا
کام کرو تو کام بہت ہیں ایسا ویسا کام نہ کرنا
بات عدو کی کوئی سن کر عشق کو تو بدنام نہ کرنا
لوٹ کے آنا گھر کے بدھو رستے ہی میں شام نہ کرنا
جوشؔ یہ کہدو اُن آنکھوں سے کوئی قتلِ عام نہ کرنا

وہ ہونگے اور ان کی یاد ہوگی مری دنیا مگر برباد ہوگی
جلی حرفوں میں جو چھاپی گئی ہے خبر وہ ساری بے بنیاد ہوگی
نظر آجائے گا پھر آسماں بھی مرے ہونٹوں پہ جب فریاد ہوگی
بچھڑ کر ملتے ہیں اک روز پر یہ کہانی یہ بھی تم کو یاد ہوگی
جنابِ جوشؔ کی قربانیوں کی دلِ اہلِ وطن میں یاد ہوگی

عبدالرؤف مخفی

□ عبدالرؤف مخفی ابن محمد خورشید، اکولہ تعلیم : میٹرک

تاریخ پیدائش : ۱۹۳ء وفات : ۶ رجنوری ۲۰۱۱ء

ملازمت : میونسپل کارپوریشن، اکولہ

سر دیکھے علم سرنگوں ہم ہونے نہ دیں گے
مٹ جائیں گے توہینِ حرم ہونے نہ دیں گے

وہ دن گئے جھک جاتے تھے ہم آپ کے آگے
اب تو سرِ تسلیم بھی خم ہونے نہ دیں گے

یہ حسرتِ دیدار نکل جائے نہ جب تک
اے ذوقِ نظارہ تجھے کم ہونے نہ دیں گے

ہم نظمِ گلستاں کو بدل دیں گے ستمگر
پھولوں پہ ہواؤں کے ستم ہونے نہ دیں گے

وہ حسن پہ مغرور ہیں ہوتے رہیں لیکن
ہم عشق کو محتاجِ کرم ہونے نہ دیں گے

وہ بھی نظر آتے ہیں ستمگاروں میں مخفی
جو کہتے تھے ہم ظلم و ستم ہونے نہ دیں گے

مدام جور و جفا ہے تمھاری بستی میں
ستم کا باب کھلا ہے تمھاری بستی میں

تمھارے حسن کی مقبولیت کا کیا کہنا
ہر ایک تم پہ فدا ہے تمھاری بستی میں

ستم بھلانے تم آئے تھے میری لنکا میں
بتاؤ رام یہ کیا ہے تمھاری بستی میں

غریبی بٹنے نہ پائے گرانی اور بڑھے
امیری محوِ دعا ہے تمھاری بستی میں

ہوا نہیں کبھی چنگیزی دور میں جو ستم
جنابِ من وہ ہوا ہے تمھاری بستی میں

حلال روزی سے بھوکے مرو نہ تم مخفی
حرام بھی تو روا ہے تمھاری بستی میں

زیست کی زلفیں پریشاں ہیں تو، سلجھائے گا کون
حشر کا میداں ہے دنیا، کس کے کام آئے گا کون
جان بچتی ہے کسی کی جھوٹ سے تو ٹھیک ہے
اک ذرا سی بات پر جھوٹی قسم کھائے گا کون
رہنماؤں کو بھی بھٹکا دیتے ہوں جو راہرو
اس قدر بھٹکے ہوؤں کو راہ پر لائے گا کون
قہر جب نازل ہُوا اُڑنے لگے ظالم کے ہوش
زعم تھا نادان کو اُس پر ستم ڈھائے گا کون
کہتے ہیں کہ خلد مل جائے گی تقوے سے مگر
یہ حقیقت تلخ تر ہے اس کو اپنائے گا کون
جلوۂ جاناناں تو موجود ہے تحفیؔ مگر
حضرت موسیٰ نہیں ہیں، طور پر جائے گا کون

اپنے بیمار محبت کی دوا بن جایئے
دل دُکھانا چھوڑ دیجے دلرُبا بن جایئے
قوم کو گر لوٹنا ہے با سلیقہ لوٹیئے
چھوڑیئے ڈاکہ زنی اور رہنما بن جایئے
زندگی میں جو ہُوا دے دیں گے محشر میں جواب
کعبۃ اللہ جایئے اور پارسا بن جایئے
آج کے ملّاحوں پر کیجے نہ بالکل اعتبار
جب بھنور میں آئے کشتی ناخدا بن جایئے
جو جوانی میں ہُوا اُس کو بھلا دیجے بھلا!
عالمِ پیری ہے تحفیؔ پارسا بن جایئے

محمد طالب الرحمٰن انعامدار طالبؔ

محمد طالب الرحمٰن انعامدار ابن عبدالجلیل انعامدار، بیودہ (امراوتی)

سنِ پیدائش : ۱۹۳۸ء وفات : ۱۸ر فروری ۱۹۷۶ء

"پروازِ تخیل" (شعری مجموعہ) ۱۹۶۲ء

جنوں سے کسب جو کرلی ہے بے خودی میں نے — غمِ فراق کو بخشی ہے زندگی میں نے

نہ دور میرے تصور سے جا مرے ہمدم — ترے خیال کو سمجھا ہے بندگی میں نے

نہیں یہ شیوۂ اُلفت کہ حُسن ہو رُسوا — پسند تیرے لئے کی ہے خامشی میں نے

نہیں ہے خوف مجھے تیرگی کا راہوں کی — کہ ظلمتوں میں بھی کرلی ہے روشنی میں نے

چھپا رہا تھا مگر سادگی مری طالبؔ — پتہ کی بات بھی کہہ دی ہنسی ہنسی میں نے

ہر ایک گوشہ میں رنگِ بہار دیکھا ہے — مری نگاہ نے جلوہ ہزار دیکھا ہے

کبھی تو جلوۂ جاناں کا کر رہے تھے گلہ — نگاہِ لطف و کرم کس نے یار دیکھا ہے

ہم اُن کی بزم سے مایوس اُٹھ گئے لیکن — نگاہِ حُسن کو آئینہ دار دیکھا ہے

کلی کلی میں، گلستاں میں، فطرتِ گل میں — کہاں کہاں نہ دلِ بے قرار دیکھا ہے

گواہی دیتے ہیں رہ رہ کے آج اے طالبؔ — فلک کے چاند ستاروں نے پیار دیکھا ہے

غم نہ کر اے وحشتِ دل تلملانا چھوڑ دے
مسکرا کے اشک پی آنسو بہانا چھوڑ دے
آندھیوں سے غم کی بجھنے پائے نہ دل کا چراغ
خارزاروں میں الم کی آنا جانا چھوڑ دے
ہے کفِ افسوس ملنا عین ، توہینِ وفا
زندگی کہتی ہے لیکن یہ بہانا چھوڑ دے
ہم وہ کانٹے ہیں اگر اُلجھے تو تھامیں گے وقار
گلستاں میں خوف سے دامن بچانا چھوڑ دے
قوتِ بازو سے طالبؔ توڑ دے زنداں کے باب
تنگِ ہستی ہے قفس کا آب و دانا چھوڑ دے

سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ قاتل کی ادا کیا ہے
نہ مرنے ہم کو دیتا ہے ، نہ جینے ہی وہ دیتا ہے
وہ ایامِ گذشتہ ظلمتوں میں کھوگئے لیکن
تمھاری یاد کا دل میں ابھی تک دیپ جلتا ہے
دھواں سوئے فلک اُٹھتا ہے میری آہ و سوزاں کا
الٰہیٰ خیر ہو دل کی نہ جانے بولتا کیا ہے
نہ کسی کا عکسِ گل نہ ہو فریب آمیز صحرا میں
بگولے پر نگاہِ قیس کو محمل کا دھوکا ہے
مری لغزش کو شاید بھول تو سمجھے نہیں طالبؔ
گریباں فصلِ گل میں میرا کانٹوں سے اُلجھتا ہے

ڈاکٹر محبوب راہیؔ

محبوب خاں راہیؔ ابن محمود خاں پٹیل، ماڑگاؤں (سکونت بارسی ٹاکلی)، ضلع اکولہ
تاریخ پیدائش : ۲۰ر جون ۱۹۳۹ء تعلیم : ایم۔اے (اردو) پی۔ایچ۔ڈی
رٹائرڈ پرنسپل غلام نبی آزاد آرٹس اینڈ کامرس کالج، بارسی ٹاکلی
مجموعہ ہائے غزلیات، (۶)، نعتیہ مجموعے (۶)، نثری تخلیقات (۶)، مظفر حنفی فن و شخصیت (تحقیق)
دیگر تقریباً ۲ر درجن مطبوعات موبائل : 08793407771

شعلوں میں غمِ ذات کی جھلسایا ہُوا سا
ہر پیکرِ احساس ہے مرجھایا ہُوا سا

ہر شخص ہے اوہام کے آسیب کے ہاتھوں
سہما ہُوا، سمٹا ہُوا، گھبرایا ہُوا سا

ہر ذہن جو فردوسِ تخیّل تھا کسی دن
لگتا ہے جہنم کوئی دہکایا ہُوا سا

صدیوں سے میں جینے کی سزا کاٹ رہا ہوں
سانسوں کی صلیبوں پہ ہوں لٹکایا ہُوا سا

ہر شخص ہے بے مہریٔ حالات سے ہر دم
روٹھا ہُوا، بپھرا ہُوا، جھلّایا ہُوا سا

صحراؤں میں نفرت کے بھٹکتا ہوں مسلسل
دو گھونٹ کو چاہت کے ہوں ترسایا ہُوا سا

کیا پائے گا پھر وسعتِ افکار کہ راہیؔ
روٹی کے جھمیلوں میں ہے اُلجھایا ہُوا سا

چلیں گے تھوڑا دم لیکر ذرا سورج نکلنے دو
بدلنے دو ذرا منظر، ذرا سورج نکلنے دو

صفِ ماتم بچھی ہے قتلِ شب پر بزمِ انجم میں
کہ شاید ہو بپا محشر ذرا سورج نکلنے دو

اندھیرے چند لمحوں میں بساط اپنی اُٹھالیں گے
بچھے گا نور سڑکوں پر ذرا سورج نکلنے دو

ہمیں تعبیر بھی تو دیکھنی ہے اپنے خوابوں کی
مرے ہمدم مرے دلبر ذرا سورج نکلنے دو

سنپولے تیرگی کے سرسراتے پھر رہے ہونگے
ابھی ہر سمت سڑکوں پر ذرا سورج نکلنے دو

کہاں ہیں وہ نئی صبحوں کی تعبیروں کے سوداگر
کہا کرتے تھے جو اکثر ذرا سورج نکلنے دو

ابھی کھل جائے گا راہیؔ بھلا کیا ہے، بُرا کیا ہے
وہ رہزن ہے کہ ہے رہبر ذرا سورج نکلنے دو

اک اعتدال ازل تا ابد ضروری ہے
ہر ایک شے میں توازن اشد ضروری ہے

اگر بگاڑ نہ پائے ، بناؤ گے کیوں کر
ہر اک قبول سے پہلے تو رد ضروری ہے

وہ ظلم و جور ہو یا صبر و ضبط جو بھی ہو
میاں ! سبھی کے لیے ایک حد ضروری ہے

گزارشات پہ بھی جب نوازشات نہ ہوں
مطالبات میں تب شد و مد ضروری ہے

وہ سب کہ جس کی ضرورت کبھی نہ سمجھی گئی
ہمارے دور میں وہ صد بصد ضروری ہے

سبھی کے ساتھ مناسب نہیں ہے ایک سی بات
عزیزو ! تفرقۂ نیک و بد ضروری ہے

جو چاہتے ہو کہ فن پر ہو دسترس راہیؔ
نگاہِ نقد و شعور و خرد ضروری ہے

جو اختلاف نہیں ہے تو اعتراف تو ہو
ہے اختلاف تو کچھ وجۂ اختلاف تو ہو

دلوں میں کیا ہے کچھ اس کا اتا پتہ تو چلے
کہ بات جیسی ہو، جو بھی ہو، صاف صاف تو ہو

کچھ اس سے ربط و تعلق کا سلسلہ تو لگے
نہیں ہے وہ جو موافق نہ ہو خلاف تو ہو

نہ ہو برائی مٹانے کی گر ہمیں توفیق
کم از کم اس سے تنفر تو انحراف تو ہو

نہیں سعادتِ سجدہ اگر مقدر میں
خلوص سے درِ معبود کا طواف تو ہو

وہ اہلِ نقد و بصیرت ہیں ! خیر ہو لگے بھی
درست پہلے مگر ان کا شین قاف تو ہو

نہ ہوں جو شعر حقائق کے ترجماں راہیؔ
حقیقتوں کا مگر ان سے انکشاف تو ہو

انوار احمد قریشی نشترؔ

انوار احمد نشترؔ ابن عبداللطیف قریشی، اکولہ — تاریخ پیدائش : ۷ر ستمبر ۱۹۳۹ء

تعلیم : ایم۔ اے۔ (اردو) ایم۔ ایڈ

ملازمت : موظف لکچرر کے۔ ایم۔ اصغر حسین جونیئر کالج اکولہ

''زنجیر بجائی جائے'' (شعری مجموعہ)

رات اک بدنام گھر کی ہو رہی تھی چاندنی
ایک میلی چاندنی کو دھو رہی تھی چاندنی

اک بڑے ہوٹل کی ویراں چاندنی پر لیٹ کر
جانے کیوں اپنا تقدس کھو رہی تھی چاندنی

دوستوں کے ساتھ وہ تھا میکدے میں رات بھر
اور بستر پر اکیلی سو رہی تھی چاندنی

شہر میں جلتے مکاں ، بہتے لہو کو دیکھ کر
جنگلوں میں منھ چھپاتے رو رہی تھی چاندنی

دھوپ جھلساتی رہی دن بھر جو کھیتوں کو تو کیا
رات کو اپنی شعاعیں بو رہی تھی چاندنی

رات تھی ،ویراں کھنڈر تھا، میں تھا، میرا کرب تھا
بوجھ میرے درد و غم کا ڈھو رہی تھی چاندنی

غم کا ساتھی کون ہے ، یہ سوچ کر تنہا تھا میں
ساتھ لیکن میرے نشترؔ رو رہی تھی چاندنی

جفا جُو نے کی تھی وفا اتفاقاً
بشر ہے ہوئی تھی خطا اتفاقاً

زمانہ مجھے رند کہنے لگا ہے
کبھی چکھ لیا تھا مزا اتفاقاً

مری زندگی ڈھل گئی نغمگی میں
سُنی تھی کسی کی صدا اتفاقاً

ترے ایک خط نے کیا راز افشاء
پڑا رہ گیا تھا کھلا اتفاقاً

مری بے خودی نے جہاں لا کے چھوڑا
ترے گھر کا تھا راستا اتفاقاً

دھرے رہ گئے عزم و ہمت کے دعوے
چلی تھی مخالف ہوا اتفاقاً

بڑی تیز تھی دھوپ نشترؔ غموں کی
پڑا راہ میں میکدا اتفاقاً

مرے سینے میں رہ کر خود مجھی سے دشمنی کب تک
دلِ نادان کھائے گا فریب دوستی کب تک
مرے احساس کے صحرا جلے گا تو یونہی کب تک
بجھاؤں روز اشکوں سے میں تیری تشنگی کب تک
علم بردار ہو تم لیس للانسان کے لوگو
رہوگے تم زمانے میں شکارِ بے حسی کب تک
مسائل کا تمھارے حل نہیں تقلیدِ مغرب میں
کسی گم کردہ منزل سے امیدِ رہبری کب تک
غزالیؒ رازیؒ و رومیؒ کی تخلیقات بھی دیکھو
کروگے مارکس، ہیگل، ڈارون کی پیروی کب تک
جھکاؤ سر خدا کے سامنے یہ سرکشی چھوڑو
جبینِ کبر آخر بے نیازِ بندگی کب تک
جہانِ چند روزہ میں کسی سے دشمنی کیسی
ہماری زندگی کتنی ۔ ہماری دشمنی کب تک
جفا پیشہ زمانے میں وفا کی جستجو نشترؔ
گزارے گا سرابوں کے سہارے زندگی کب تک

بول دنیا کے رسیلے ہوگئے
پھر یہ لہجے کیوں کٹیلے ہوگئے
اتنی کم بارش میں کیا ہوتا بھلا
خشک پتّے صرف گیلے ہوگئے
ایک گردہ بک گیا تو کیا ہُوا
ہاتھ تو بیٹی کے پیلے ہوگئے
چیتھڑے پہلے تھے اب اُجلا کفن
مر گئے تو ہم سجیلے ہوگئے
زہر اُگلنا جن کا شیوہ کل رہا
آج اُن کے ہونٹ نیلے ہوگئے
جانتے ہیں پر نہیں ہیں مانتے
لوگ نشترؔ کیا ہٹیلے ہوگئے

ممتاز احمد ممتازؔ

ممتاز احمد ممتاز ابن غلام احمد، اچل پور (امراوتی)
تاریخ پیدائش : یکم جون ۱۹۴۰ء وفات : ۷رمئی ۲۰۰۰ء
میٹریکولیٹ

دائرے کھینچ لیے بات سے آگے نہ گئے
تنگ نظر لوگ روایات سے آگے نہ گئے
چاہتے ہم تو بہت کچھ تھا زمانے میں مگر
تجھ کو چاہا تو تری ذات سے آگے نہ گئے
کارواں ٹھہر گئے رات گذر جانے تک
راہبر تھے کہ روایات سے آگے نہ گئے
تجھ سے بچھڑے تو کئی بار صدا آئی ہمیں
ہم گئے بھی تو خرابات سے آگے نہ گئے
ہم کو ممتازؔ تھی امید، وفا کی جن سے
وہ بھی دو چار ملاقات سے آگے نہ گئے

جس قدر زندگی کے پاس رہا
آدمی اور بھی اُداس رہا
راستوں میں تو اتنا خوف نہ تھا
جس قدر منزلوں کے پاس رہا
جب بھی سورج ملا، مِلا تنہا
چاند، تاروں کے پاس پاس رہا
کتنے پہنائے آگہی نے لباس
آدمی پھر بھی بے لباس رہا
خود سے بیگانہ ہی رہا ناداں
اور غیروں سے روشناس رہا

کانٹوں میں پھول کیسے کھلا ہم سے پوچھیے
کیا ہے مقامِ صبر و رضا ہم سے پوچھیے

گِراں ہے جو فرات کے وہ کیا بتائیں گے
ہاں تشنگیٔ کرب و بلا ہم سے پوچھیے

یہ راہبر ہیں جتنے روایت پسند ہیں
بے نام منزلوں کا پتہ ہم سے پوچھیے

ہر ایک انقلاب کی زد پر ہمیں رہے
ہر امتحاں ہمیں نے دیا ہم سے پوچھیے

ماضی کی بات اور تھی ممتازؔ آج بھی
خود ساختہ ہے کتنے خدا ہم سے پوچھیے

کیا کروں گا میں بھلا کانچ کا یہ گھر لیکر
لوگ آجائیں گے پھر ہاتھ میں پتھر لیکر

ذہن ماؤف، بدن چور ہے، دل آزردہ
آؤ سوجائیں سرھانے کوئی پتھر لیکر

نام چھپتا تھا جلی حرفوں میں کل تک جس کا
آج بیٹھا ہے وہ فٹ پاتھ پہ بستر لیکر

جب بھی حالات کے سورج کی تپش تیز ہوئی
اوڑھ لی میں نے تری یاد کی چادر لیکر

زینتِ شہر ہے ممتازؔ یہ اونچے ایوان
ہم کہاں جائیں بھلا پھوس کا چھپّر لیکر

قاضی سعید افسر

قاضی سیّد سعید الدین افسر ابن الحاج قاضی سیّد معین الدین، اچل پور

تاریخِ پیدائش : ۲۶؍مارچ ۱۹۴۱ء　　تعلیم : ایس۔ایس۔سی

شاعری کی عمر تقریباً ۶۰ رسال　　معالج ہومیوپیتھی

مجموعۂ کلام : !!!

بدلے دن رات، ہم نہیں بدلے　　بدلی ہر بات ہم نہیں بدلے
وقت ہی کو بدل دیا ہم نے　　وقت کے ساتھ ہم نہیں بدلے

گلے ملیں تو بنا رہتا ہے گماں دیوار　　یہ اور بات کہ ہوتی نہیں عیاں دیوار
طواف کرتے ہو اپنا تمھیں نہیں معلوم　　میانِ مرحلۂ آگہی ہے جاں دیوار
رواں دواں جو اٹھے ہم کشاں کشاں لوٹے　　زمیں تھی ایک رکاوٹ تو آسماں دیوار
ہے سوچ سایہ خیال و نظر پہ چھایا ہوا　　ہیں ریزہ ریزہ فصیلیں دھواں دھواں دیوار
بڑھوں تو کیسے بڑھوں کس کے در پہ دستک دوں　　قدم قدم پہ احاطے جہاں تہاں دیوار
چھپائے رکھتے ہیں بے چہرگی کسی صورت　　اُٹھائے پھرتے ہیں ذہنوں کے درمیاں دیوار

وہ اک صدی کا بنائے تھا انتظام تمام　　کہ ایک پل میں ہوئی عمر ناتمام تمام
ابھی میں کر بھی نہ پایا تھا ایک جام تمام　　ندا یہ آئی کہ بس ہو چکی یہ شام تمام
میں اپنی آگ میں جلتا ہوں میرا حال نہ پوچھ　　مرا نفس کیا کرتا ہے میرا کام تمام
ہَوا ہی ایسی چلی تھی اُکھڑ گئے خیمے　　نہ کر سکے تھے ابھی عرصۂ قیام تمام
خوشی ہماری بجا ہے مباح فخر ہمیں　　لکھی ہے مملکتِ غم ہمارے نام تمام
ٹھکانے لگ گئیں افسر بچی کھچی سانسیں　　چلو کہ ہو ہی گیا آج یہ بھی کام تمام

تازہ دم پُر عزم شعلہ بار دن
شام کو ثابت ہُوا بے کار دن

زرد کرنیں، سرد جھونکے، گرد، ہم
کس طرح کاٹیں یہ شب آثار دن

صبح کو رہتے ہیں ہم فالج زدہ
رات کو ملتا نہیں عیّار دن

بھوک لیکر خوان میں آئی ہے شام
آئے گا کل تشنگی بردار دن

عمر یعنی لاش کا لمبا سفر
زندگی کی عمر بس دو چار دن

رات ہی کو چل دیا وہ قافلہ
اب کریدے راکھ کا انبار دن

کس بناء پر کوئی سمجھوتہ کریں
تم نمودِ شب، مرا اظہار دن

آپ بیتی کیا لکھوں کیونکر لکھوں
ہیں کہاں کچھ قابلِ اظہار دن

رات بھر اس سوچ میں جاگا کئے
اب کہاں کاٹیں گے اِک بیکار دن

نیکیاں رہ گئیں ہیں نام طلب
عجز بھی اب ہے احترام طلب

سیریٔ دل کسی طرح نہ ہوئی
سیر دنیا کی تھی قیام طلب

دستِ مفلس سوال کو نہ اُٹھا
چشمِ منعم رہی سلام طلب

عظمتِ مردمی ہے بے طلبی
ذلّتِ مردمی کا نام، طلب

دھند کی اک دبیز چادر میں
صبح تو آئی بھی تو شام طلب

ذہن اُلجھے ہوئے فضا بوجھل
اب یہ محفل ہے اختتام طلب

ہم کو مطلب ہی سادگی سے رہا
اور دنیا تھی اہتمام طلب

فرصتِ خاص! عرصۂ ہستی
عرصۂ حشر! یعنی عام طلب

رہنا تیار اس طرح افسرؔ
جانے کرلیں وہ کب غلام طلب

حسین خاں دانشؔ

حسین خاں دانشؔ ابن اسمٰعیل خاں، اکولہ — تاریخ پیدائش : یکم رجولائی ۱۹۴۱ء

''آئینے صداقت کے'' (شعری مجموعہ)

اگر میں حرفِ غلط ہوں تو رائیگاں کردے — مَیں جس وَرَق پہ ملوں اسکی دھجیاں کردے

کرم نواز اگر ہے تو اتنی زحمت کر — مجھے زمیں سے اُٹھا اور آسماں کردے

اے چارہ گر وہ دَوا ڈھونڈھ علمِ حکمت میں — جو میرے شعلۂ غم کو دھواں کردے

اَنا پرستی کے جو توڑ دے گھروندوں کو — مجھے خلوص کی وہ موجِ بیکراں کردے

زبان دی ہے تو پھولوں سی گفتگو بھی دے — جلا کے راکھ نہیں تو مری زباں کردے

مَیں تھک چکا ہوں بہت دھوپ کا سفر کرتے — دعا کا ماں تو' مرے سر پہ سائباں کردے

پڑھے زمانہ بڑے شوق سے مجھے دانشؔ — مرے وجود کو اِک ایسی داستاں کردے

بات ہم جب بھی صاف کرتے ہیں — لوگ کیوں اختلاف کرتے ہیں

قابلِ احترام ہیں وہ لوگ — دشمنوں کو معاف کرتے ہیں

بولتے جب ہیں پھول سے لہجے — پتھروں میں شگاف کرتے ہیں

رَشک آتا ہے ایسے چہروں پر — جن کا شیشے طواف کرتے ہیں

حوصلہ خوب ہے چراغوں کا — جنگ ہَوا کے خلاف کرتے ہیں

مَیں نے بخشی ہے زندگی فن کو — اہلِ فن اعتراف کرتے ہیں

دل ہے دانشؔ فقیر کا حجرہ — غم یہاں اعتکاف کرتے ہیں

وہ مصیبت میں بھی لاچار نہیں ہو سکتا
حوصلہ ریت کی دیوار نہیں ہو سکتا

مَیں کوئی جگنو نہیں ہوں جو پکڑ میں آؤں
مَیں تو جھونکا ہوں گرفتار نہیں ہو سکتا

جو ہے مجرم اُسے سولی پہ چڑھا دو لیکن
ہر مسلمان تو غدّار نہیں ہو سکتا

سونے چاندی کے ترازو میں نہ تولو مجھ کو
مَیں کبھی بکنے کو تیار نہیں ہو سکتا

مَیں نے آئینے کی تاریخ پڑھی ہے یارو
جھوٹ کا وہ تو طرفدار نہیں ہو سکتا

مَیں نے سچائی پہ سجدے میں کٹا دی گردن
میرا سجدہ کبھی بیکار نہیں ہو سکتا

ایسے ڈرپوک سفینے کو جلا دو دانشؔ
ڈر کے موجوں سے جو اُس پار نہیں ہو سکتا

منتشر ہو گئے افسوس جگر کے ٹکڑے
لوگ تقسیم ہوئے ، ہو گئے گھر کے ٹکڑے

حدِّ پرواز سے آگے اے پرندے نہ نکل
شوقِ پرواز نہ کر دے ترے پَر کے ٹکڑے

گھر سے نکلوں گا تو منزل پہ رُکوں گا جا کر
مجھ کو منظور نہیں اپنے سفر کے ٹکڑے

کس نے آئینے میں یہ برقِ تجلّی رکھ دی
آئینہ دیکھوں تو ہوتے ہیں نظر کے ٹکڑے

یہ مرے شعر نہیں نور کی قندیلیں ہیں
مَیں نے کاغذ پہ سجائے ہیں قمر کے ٹکڑے

مَیں نے برسوں جو اُسے خون پلایا اپنا
تم سے ہو سکتے نہیں میرے ہنر کے ٹکڑے

ناخدا سے کہو اُکسائے نہ دانشؔ مجھ کو
ضد پہ آؤں گا تو کر دوں گا بھنور کے ٹکڑے

ظہیر احمد ظہیرؔ

ظہیر احمد ظہیرؔ ابن بشیر احمد، بالاپور (اکولہ) موبائل : 09145722981
تاریخ پیدائش : ۱ر جولائی ۱۹۴۱ء
سابق سینئر کلرک، انجمن ہائی اسکول و جونیئر کالج، بالاپور

خودی کو صبر و تحمل سے آشنا رکھنا
بڑی ہے بات بڑا دل کا حوصلہ رکھنا

اسی سے ہے یہ مری زندگی میں رعنائی
مرا چراغ محبت ہوا جلا رکھنا

نہیں ہے شان اُٹھا کر، اکڑ کے چلنے میں
ہمیشہ سر کو ادب سے جھکا ہوا رکھنا

نہ جانے کون سا لمحہ ہو اُس کی آمد کا
خیال ذہن میں ہر وقت موت کا رکھنا

سنبھال لینا بلندی پہ آسماں کی مجھے
مری اُڑان کی تو آبرو ہوا رکھنا

تو اپنے رحم و کرم سے نواز دینا ہمیں
ہماری لاج تو محشر میں اے خدا رکھنا

ظہیرؔ شکر خدا کا ہر ایک پل لازم
لبوں کو شام و سحر طالب دعا رکھنا

حوصلے جینے کے دل کو بے بسی دیتی رہی
آرزو پژمردگی کو تازگی دیتی رہی

میں نے اپنے آگے اُن کو سر اُٹھانے نہ دیا
حادثوں کو مات میری سرکشی دیتی رہی

رہ گیا میں ناز برداری میں اس کی عمر بھر
زندگی مجھ کو فریب زندگی دیتی رہی

خونِ دل دیتا رہا میں شمعِ ہستی کو سدا
اور یہ اوروں کو اپنی روشنی دیتی رہی

اک طرف دیتی رہی مجھ کو اجل اپنا پیام
اک طرف آواز مجھ کو زندگی دیتی رہی

گر پڑے قدموں پہ آ کے تاج شاہوں کے ظہیرؔ
یہ وقار اور شانِ عظمت سادگی دیتی رہی

کسی سے خوف کھاتے ہیں نہ دب کر بات کرتے ہیں
صداقت کے پیمبر جب بھی حق پر بات کرتے ہیں
نہیں ہے حوصلہ جن میں حقیقت پیش کرنے کا
نہ آتے روبرو ہیں وہ ، نہ کھل کر بات کرتے ہیں
بتا دیتے ہیں احوالِ دل رازِ نہاں چہرے
خموشی ہو لبوں پر لاکھ ، تیور بات کرتے ہیں
نہیں شیوہ ہمارا پھر مکرنے کا بدلنے کا
جو دل میں ہے زباں سے ہم وہ کھل کر بات کرتے ہیں
سبب خود آپ ہی بنتے ہیں وہ اپنی تباہی کا
حسد کی آگ میں جو لوگ جل کر بات کرتے ہیں
ہمارا ہی جگر ہے یہ ' ہمارا حوصلہ ہے یہ
ہو دل پہ زخم گہرا بھی تو ہنس کر بات کرتے ہیں
ظہیرؔ الزام کیوں اوروں پہ بے رُخ ہیں وہ سنگدل ہیں
اگر ہے عاجزی ہم میں تو پتھر بات کرتے ہیں

موت سے وہ نہ زندگی سے ملے
روز و شب کی جو بیخودی سے ملے

ہم نے جانا فریب کھانے پر
کیا صلے ہم کو زندگی سے ملے

بے دلی سے ملے ہمیں احباب
ہم رقیبوں سے بھی خوشی سے ملے

اُن کے قدموں پہ جھک گئی دنیا
جو محبت سے عاجزی سے ملے

لاش پر آج آئے رونے کو
عمر بھر سارے بے رُخی سے ملے

دل میں حسرت ہے موت کی اے ظہیرؔ
یوں تو ملنے کو ہم کبھی سے ملے

محمد اسدؔ

محمد اسدؔ ابن محمد ہاشم، اکولہ (المعروف اسدؔ ناندوری)

تاریخِ پیدائش : ۱۹۴۱ء　　تعلیم : درجہ ہفتم

نہ کھا جاؤں دھوکا مجھے بھی یہ ڈر ہے　یہ رنگین دنیا فریبِ نظر ہے

ضروری نہیں کچھ کہوں میں زباں سے　مرے حالِ دل کی اُسے سب خبر ہے

مری سمت پتھر وہ پھینکے گا کیسے　پتہ ہے مجھے اُس کا شیشے کا گھر ہے

غریبوں کا ساتھی نہیں کوئی یارو　زمانہ اُدھر ہے جدھر مال و زر ہے

جہاں میں وہ ڈرتا نہیں ہے کسی سے　اسدؔ جس کے دل میں الٰہی کا ڈر ہے

سانچے میں اک خلوص کے ڈھل کے تو دیکھیے　"نفرت کے دائروں سے نکل کر تو دیکھیے"

پیغامِ شادمانی بھی آئے گا ایک دن　پہلے غموں کی آگ میں جل کر تو دیکھیے

مظلوم پر تو آپ بہت کر چکے ستم　اب ظالموں کے سر کو کچل کر تو دیکھیے

بگڑا ہُوا نصیب سنور جائیگا وہاں　در پہ رسولِ پاکؐ کے چل کر تو دیکھیے

آئے ہو ہر قدم پہ پھسلتے ہوئے اسدؔ　کچھ زندگی میں آپ سنبھل کر تو دیکھیے

دل سے اپنے ظرف کا اظہار ہونا چاہیے
ہے وہ دشمن بھی تو اُس سے پیار ہونا چاہیے

کیوں سزا دیتے ہو اربابِ وفا کو ظالمو!
جب سزا کا مستحق غدّار ہونا چاہیے

ہو مسرت ہی مسرت تو مزا جینے میں کیا
زندگانی پر غموں کا بار ہونا چاہیے

صرف مال و زر نہیں کافی ہیں عزت کیلئے
''آدمی کو صاحبِ کردار ہونا چاہیے''

ہو خفا جس سے خدا، یا پھر نبیؐ ناراض ہوں
ایسے کاموں سے ہمیں انکار ہونا چاہیے

چوڑیاں پہنے ہوئے بیٹھے ہوئے ہیں آج وہ
جن کے ہاتھوں میں اسدؔ تلوار ہونا چاہیے

ہم نے اپنا لہو بہایا ہے
گلستاں کو مگر بچایا ہے

عقل کچھ خوش نہیں، خوشی پا کر
دل تو غم میں بھی مسکرایا ہے

میں تو مثلِ حباب ہوں، جس نے
سر پہ طوفاں کے گھر بنایا ہے

پل کے ڈستا ہے آستیں میں وہ
دودھ ہم نے جسے پلایا ہے

غیر کا کیا کریں اسدؔ شکوہ
دھوکا اپنوں سے ہم نے کھایا ہے

راشد اللہ خاں جوہرؔ

راشد اللہ خاں جوہرؔ ابن ذکاء اللہ خاں پیپل گاؤں راجہ (بلڈانہ) بی۔اے۔ڈی۔ایڈ
تاریخ پیدائش : ۱۹۴۲ء وفات : ۲۳ جولائی ۱۹۷۸ء
تدریس انجمن ہائی اسکول و جونیئر کالج کھامگاؤں "نور و نکہت" (شعری مجموعہ) سنہ ۱۹۸۰ء

یہ امتحانِ وفا ہے اے دل، گلہ نہ کر اُن کی بے رُخی کا
تڑپ سے مطلب! فغاں سے حاصل، وقار کھو دے گا عاشقی کا
ہوئے جو سحورِ حسن رنگیں تو ذوقِ شعری نے چٹکیاں لیں
فریبِ الفت میں آگئے ہم تو لگ گیا روگ شاعری کا
نہ بیخودی ہے نہ ہوشیاری، عجیب کچھ کیفیت ہے طاری
خبر ہے اُن کی نہ ہوش اپنا، یہ کون سا رُخ ہے زندگی کا؟
شباب غم کی چوٹ ایسی پڑی کہ بیدار ہوگیا دل
سنور گئی زندگی جو اپنی یہ فیض ہے دردِ عاشقی کا؟
ملا رہی ہیں ہمیں بہاریں وہ گنگناتی ہوئی پھواریں
چلو کریں مل کے سیرِ گلشن کبھی تو مانو کہا کسی کا
نظر رہی سب کی رنگ و بو پر گزر گیا ہم پہ حشر جوہرؔ
کسی نے دیکھا نہ شیشۂ دل چمن میں ہنستی ہوئی کلی کا

دعائے نیم شب، آہِ سحر، سوزِ دروں دل کا
مسیحا بھی ہے، مونس بھی ہے، مرہم بھی ہے بسمل کا
الٰہی میری غرقابی میں کس کا ہاتھ ہے آخر
سفینہ کا، ہوا کا، فتنہ زا موجوں کا، ساحل کا
ہے میرا ذوق رندی قیدِ ہر موسم سے بالاتر
نہ میں پابند ساقی کا نہ شیشے کا نہ محفل کا
خدا پر ہے مرا ایماں، قیامت خیز طوفاں میں
بھروسہ ناخدا کا ہے نہ کشتی کا نہ ساحل کا
دِیا کرتے ہیں اکثر دعوتِ فکرِ سخن مجھ کو
سحر، شبنم، شفق، تارے، تبسم ماہِ کامل کا
خرد والے ذرا خود ٹھنڈے دل سے غور فرمالیں
فغاں، فریاد، ماتم، نالہ، حل ہے کیا مسائل کا؟
جسے کہتے ہیں منزل امتحاں ہے اصل میں جوہرؔ
امنگوں کا، جنوں کا، حوصلوں کا، عزمِ کامل کا

آنکھ جب تر نہ تھی، دل شکستہ نہ تھا، زندگی میں تھی لذّت کہاں دوستو
وہ تو کہیے کہ سوزِ جگر مل گیا، خونِ دل ہوگیا ناگہاں دوستو
تم تو دیوانہ ٹھہرا رہے تھے ہمیں، دے رہے تھے دشنامِ دیوانگی!
تیرگی میں چراغاں یہ کس نے کیا، کس نے بدلا چمن کا سماں دوستو!
عمر کلیوں کی کتنی جو بتلا سکیں کس کے خونِ جگر سے ہے حُسنِ چمن
خاکِ گلشن سے پوچھو بہاروں میں ہے کس کے خوں سے یہ گلکاریاں دوستو
جب نسیمِ سحر کی زبانی سُنی میری رودادِ غم، صحنِ گلزار میں
ضبطِ شبنم سے آنسو نہ پھر ہو سکے، قلبِ گل ہوگیا، خونچکاں دوستو
کس قدر ہم نے کھائے ہیں تیرِ ستم، گردشِ وقت کے کیا گنائیں کرم
ان کا دامن چھٹا، خونِ ارماں ہُوا، فصلِ گل میں جلا آشیاں دوستو
کیسے ٹُوٹا ہے دل کس نے توڑا ہے دل، سانحہ کس طرح یہ ہُوا رونما
یوں نہ رہ رہ کے چھیڑو خدا کیلئے محترم ساتھیو، مہرباں دوستو
چاک سینے میں اپنے بھی کچھ کم نہ تھے، ہم نے زخموں کی لیکن نمائش نہ کی
یہ الگ بات ہے مثلِ گُل ہم رہے گلستاں میں تبسم فشاں دوستو
جن سے ملنے کو بیتاب رہتے تھے ہم ان سے خلوت میں جب سامنا ہوگیا
کس نے دیکھا انھیں، کون اُن سے مِلا، آگئی بیخودی درمیاں دوستو
بات کیا ہے ہمیں بھی تو ہو کچھ خبر، کیوں وہ گھر سے نکلتا نہیں آج کل
ذکر کس شخص کا آج یہ چھڑ گیا؟ کون جوہرؔ! وہ شیوہ بیاں دوستو

محوِ رعنائی نگار میں ہے	یا نظر پھول کے کنار میں ہے
گُل بھی زخمی، صبا بھی آوارہ	کون آسودہ لالہ زار میں ہے
میری آشفتہ قسمتی کی جھلک	کچھ اگر ہے تو زُلفِ یار میں ہے
اے خرابِ تلاشِ خضر و مسیح	زندگانی فریبِ یار میں ہے
عشق سے حُسن آگیا ورنہ	شاعری اپنی کس شمار میں ہے
ہائے وہ آنکھ جو نہ ہو مشتاق	آہ وہ دل جو اختیار میں ہے
کون جانے اسے کہ بیچارہ	جوہرؔ خوشنوا 'برار' میں ہے

مصطفیٰ جمیل

غلام مصطفےٰ جمیلؔ ابن غلام حسین صابرؔ، بالاپور (اکولہ)　موبائیل : 09145722981
تاریخِ پیدائش : ۶ رمئی ۱۹۴۳ء
موظف مدرّس نگر پریشد پرائمری اسکول، بالاپور
''عکسِ جمیل'' ۲۰۰۳ء ''عکس در عکس'' (شعری مجموعہ) ۲۰۱۵ء

وہ لوگ وقت کو اپنا غلام کرتے ہیں
جو حادثوں کو ادب سے سلام کرتے ہیں

تمہارے شہر میں تصویریں بولتی ہوں گی
ہمارے گاؤں میں پتھر کلام کرتے ہیں

مری سنو تو یہ بوڑھا درخت مت کاٹو
سنا ہے اس پہ پرندے قیام کرتے ہیں

ہم اپنے فرض سے غافل کبھی نہیں رہتے
وفا کی رسم کو دنیا میں عام کرتے ہیں

انھیں قبیلوں پہ فاقوں کی بارشیں برسیں
جو اپنے کھیتوں میں دن رات کام کرتے ہیں

وقارِ غیرتِ قومی کو شرم آتی ہے
وطن میں ایسے بھی کچھ لوگ کام کرتے ہیں

یہ مصطفیٰؐ کا کرم ہے جمیلؔ پر اپنے
تمام لوگ مرا احترام کرتے ہیں

سجدوں میں عاجزی کا مزہ ہم سے پوچھیے
بے لوث بندگی کا مزہ ہم سے پوچھیے

لوگو بڑے خلوص سے لُوٹے گئے ہیں ہم
رہبر کی رہبری کا مزہ ہم سے پوچھیے

ترکِ تعلقات پہ آنسو نکل پڑے
برسوں کی دوستی کا مزہ ہم سے پوچھیے

ہو کر جدا وہ مجھ سے مرے ساتھ ساتھ ہے
اس ربطِ باہمی کا مزہ ہم سے پوچھیے

ہم نے اسے قریب سے دیکھا ہے بارہا
کم بخت مفلسی کا مزہ ہم سے پوچھیے

انسانیت زمانے میں مفلوج ہوگئی
تہذیب کی غمی کا مزہ ہم سے پوچھیے

جب ذکرِ مصطفیٰؐ میں تھے مصروف ہم جمیلؔ
اُس وقت کی خوشی کا مزہ ہم سے پوچھیے

خوشبو ہمارے پیار کی ہر سو بکھر تو جائے ۔۔۔ بستی سے اختلاف کا طوفاں گزر تو جائے

میرا یقین ہے اسے مل جائے گا سکوں ۔۔۔ طوفان میری کشتی میں دو پل ٹھہر تو جائے

تنقید و تبصرہ کوئی کچھ بھی کرے تو کیا ۔۔۔ میری غزل جناب کے دل میں اُتر تو جائے

اس سے لپٹ کے روئیں گی ساری اُداسیاں ۔۔۔ شامِ غمِ فراق کبھی میرے گھر تو جائے

پھر جائے وہ خلاؤں میں تحقیق کیلئے ۔۔۔ اپنے بدن کے غار میں پہلے اُتر تو جائے

ہے اُن کی تربیت پہ نظر اس لئے مری ۔۔۔ بچوں میں میری ذات کا تھوڑا اثر تو جائے

سمجھا نہ اس کی پیاس کو اب تک کوئی یہاں ۔۔۔ دریا کی تہہ میں کاش کسی کی نظر تو جائے

یہ یاترا بھی امن کی دشمن نہ ہو کہیں ۔۔۔ لوگوں کے دل سے پہلے یہ خوف و خطر تو جائے

کہتے تھے یہ جمیلؔ سے کل مصطفیٰ جمیل ۔۔۔ میری نظر سے آگے کسی کی نظر تو جائے

وہ لاکھ پوچھے اگر تجھ سے خیریت میری ۔۔۔ نہ کہنا اس سے صبا تو یہ کیفیت میری

میں ایک لمحہ ہوں گزرے ہوئے زمانے کا ۔۔۔ تمھیں خبر ہی نہیں کیا ہے اہمیت میری

میں ڈوبا رہتا ہوں فکرِ سخن کے دریا میں ۔۔۔ کوئی تو دیکھے ذرا آ کے محویت میری

تمھارے پیار نے مشہور کر دیا ورنہ ۔۔۔ میں اک غریب بھلا کیا ہے حیثیت میری

پیئے ہیں شکر ادا کر کے صبر کے ساغر ۔۔۔ ہوئی ہے سایۂ صابرؔ میں تربیت میری

میں اپنی ماں کے قدم چوم کر نکلتا ہوں ۔۔۔ اسی لئے تو چمکتی ہے شخصیت میری

ضرور مجھ میں چھپا ہے جمیلؔ وہ آکر ۔۔۔ بنی ہے رشک کے قابل جو شخصیت میری

افسر سلیم افسر

افسر سلیم افسر، اچل پور (امراوتی) تاریخِ پیدائش : یکم جولائی ۱۹۴۳ء

"جانِ جاناں (شعری مجموعہ)

خیالوں میں تم کو بسانے لگا ہوں
میں خود سے بہت دور جانے لگا ہوں

خوشی ایک چاہی تو انجام یہ ہے
کہ خوشیوں سے دامن بچانے لگا ہوں

گئے جب سے تم دور نظروں سے میری
تمھیں دل کے نزدیک پانے لگا ہوں

کہیں پھر نہ دیکھے وہ نظرِ کرم سے
سکوں بے رُخی میں جو پانے لگا ہوں

تفکّر ہے چہرے پہ پھر باغباں کے
کہ پھر سے نشیمن بنانے لگا ہوں

نئے غم نئی آرزوئیں ہیں افسرؔ
نئی اک غزل گنگنانے لگا ہوں

ہر تمنّا کا چہرہ بگاڑا گیا
شہرِ دل انتقاماً اُجاڑا گیا

تیر سینہ میں اک اور گاڑا گیا
عہدِ ماضی کا مدفن اُکھاڑا گیا

جو ہماری وفا کی تواریخ تھیں
اُن کتابوں کو چُن چُن کے پھاڑا گیا

یہ بھی کیا شہر ہے سازشوں کو جہاں
ہر عمارت کے پائے میں گاڑا گیا

وار چھپ چھپ کے کرنا دلیری ہوئی
جس میں ہو سامنا وہ اُکھاڑا گیا

میرا ملبوس بوسیدہ مدّت سے ہے
صرف برسات کیا، اس میں جاڑا گیا

بات کرنی بھی اس بزم میں جُرم ہے
جس نے کھولی زباں وہ لتاڑا گیا

کوئی افسرؔ کو عاشق سمجھتا نہ تھا
اک تمھاری رَوِش سے ہی تاڑا گیا

ہزاروں سر کسی کے پاؤں پر دیکھے نہیں جاتے
نظامِ زر کے یہ زیر و زبر دیکھے نہیں جاتے

احاطے یہ رواجوں کے یہ دیواریں ساجوں کی
دلوں کے شہر میں پتھر کے گھر دیکھے نہیں جاتے

اُلٹ دو ان نقابوں کو یہ پردے چاک کر ڈالو
گھٹاؤں کے لپیٹے میں قمر دیکھے نہیں جاتے

مسرت جن سے برگشتہ اذیت جان کا حصّہ
یہ لاشے زندگی کے دوش پر دیکھے نہیں جاتے

کسی کا ذکر ہی چھیڑو کہ دل کے داغ روشن ہوں
یہ منہ کالے اندھیرے رات بھر دیکھے نہیں جاتے

لفافہ صرف بدلا ہے ابھی مضموں نہیں بدلا
وہی رہبر یہ اندازِ دگر دیکھے نہیں جاتے

نظر سے جب نظر ملتی ہے عالم اور ہوتا ہے
اُتر آتے ہیں وہ دل میں مگر دیکھے نہیں جاتے

کسی کا دل ہتھیلی پر تمھاری، کیا قیامت ہے
یہ ٹکڑے کانچ کے یوں آنچ پر دیکھے نہیں جاتے

کبھی آنکھیں، کبھی ہم دل، کبھی جاں تک بچھاتے ہیں
گلوں کے پاؤں افسرؔ خاک پر دیکھے نہیں جاتے

شاید وہ پڑھ سکیں گے نہ لکھا ہوا تمام
خط میرا آنسوؤں میں ہے بھیگا ہوا تمام

روداد دردِ عشق سنانے چلا تھا میں
تم سے ملی نگاہ تو قصّہ ہوا تمام

دل میرا حسرتوں کی ہے دنیا لئے ہوئے
آنکھوں میں سیلِ اشک ہے ٹھہرا ہوا تمام

اونچی عمارتیں ہیں مگر پستہ قد ہیں لوگ
یہ تیرا شہر، میرا ہے دیکھا ہوا تمام

تیور کچھ اب کے اور ہیں فصلِ بہار کے
غنچہ کوئی کھلا بھی تو بکھرا ہوا تمام

اب یہ چمن بھی دوستو کچھ غیر سا لگے
ہر چند اپنے خوں سے ہے سینچا ہوا تمام

ان مہ رُخوں کے عشق میں افسرؔ مرا کلام
آتا ہے بامِ عرش سے نکھرا ہوا تمام

مرزا رفیق شاکر

مرزا رفیق شاکر ابن مولوی حمید مرزا، کھامگاؤں (بلڈانہ) تعلیم : ایم۔اے۔ایم۔ایڈ

تاریخِ پیدائش : ۱۴؍ جولائی ۱۹۴۳ء وفات : ۲۰۱۳ء

درس وتدریس ایجوکیشن ایکسٹینشن آفیسر (رضا کارانہ سبکدوشی)

''بادِ صبا'' (قطعات) ''سرو سنگ'' (غزلیات) ''بارانِ رحمت'' (دیوانِ نعت) و متعدد کتب

وہ دل میں روز نیا درد لے کے آتا ہے
پہ تتلیوں کے تعاقب میں بھول جاتا ہے

جو منھ چھپا کے دریچے سے بھاگ جاتا ہے
دل و جگر کا ہر اک زخم مسکراتا ہے

فرشتے اُس کی کمائی پہ ناز کرتے ہیں
وہ فاقہ مست پسینے میں جب نہاتا ہے

وہ جس کی زد سے لرزتے تھے قیصر و کسریٰ
نہ جانے کیسے پیادوں سے مات کھاتا ہے

وہ ایک زخم جو سوغات ہے محبت کی
جگر پہ داغ ہے جگنو سا جگمگاتا ہے

اُسی کی آنکھ میں ملتا ہے لطف جینے کا
اُسی کی آنکھ میں پیراک ڈوب جاتا ہے

کبھی کا توڑ دیا اُس نے آئنہ شاکر
پھر آج کرچیاں پلکوں سے کیوں اُٹھاتا ہے

جس کی دنیا میں کبھی کچھ ہے سوائے کانٹے
پھول کے ساتھ وہ جوڑے میں لگائے کانٹے

زندگی میں مجھے ہر دور میں بھائے کانٹے
جب بھی آئے مرے دامن میں تو آئے کانٹے

عیش و عشرت میں بھی ذہنوں میں بسائے کانٹے
تو سمجھ لو کہ جہنم سے بچائے کانٹے

مجھ کو دشمن سے شکایت نہ رقیبوں سے گلہ
میرے اپنوں نے مری رہ میں بچھائے کانٹے

میری اک عرض پہ غصہ سے دکھائی آنکھیں
میرے محبوب نے بھی مجھ کو دکھائے کانٹے

کوئی تو ہو کہ جو دشمن کو بٹھائے سر پر
یعنی میری طرح پلکوں سے اُٹھائے کانٹے

آگئی جن میں قلندر کی صفت اے شاکر
پھینک کر تاج جبینوں پہ سجائے کانٹے

شوخ چنچل ہوا کتنی گستاخ تھی اُس کی زلفیں جو چہرہ پہ بکھرا گئی
پھیل جائے دھواں جیسے لوبان کا، یا کہ کالی گھٹا چاند پر چھا گئی

شاخِ گل جھوم کر پھر لچکنے لگی، سبز پتے بجانے لگے تالیاں
اُس کی مخمور آنکھیں اُٹھیں جس طرف جام پر جام ہر سمت چھلکا گئی

اُس کی نظریں جو میری نظر سے ملیں پھر نظر ہی نظر میں ہُوا فیصلہ
اک نظر تھی کہ دونوں کو للچا گئی پھر ہُوا یہ کہ وہ خود ہی شرما گئی

غنچۂ دل پہ تتلی تھرکنے لگی، پھوٹ نکلی کرن گل مہکنے لگے
جان و دل سے وہ مجھ پر فدا جب ہُوا میری دنیا میں جیسے بہار آ گئی

چاندنی پر مری چاندنی رات میں میرے دلبر کے پُر شوخ انداز پر
برق لہرا گئی نور بکھرا گئی رنگ برسا گئی ذہن مہکا گئی

آفت و قہر، فتنے، مصیبت، الم، درد، تکلیف، کرب و بلا، رنج و غم
اک توجہ ہٹائی جو اُس نے ذرا دیکھ لو خود پہ کیسی گھڑی آ گئی

اُس نے برگد کے پتے پہ اتنا لکھا کیا یہاں پر تمہیں رزق ملتا نہیں
بس اُسی ایک پتے سے شاکر مجھے اپنے آنگن کی ہریالی یاد آ گئی

کر دیا اُس نے مجھے رُسوا بہت
اور پھر کچھ سوچ کر رویا بہت

شہر میں آ کر وہ بونا ہو گیا
گاؤں میں اپنے جو تھا اونچا بہت

اس میں صحبت کا اثر آیا نہیں
سانپ صندل سے مگر لپٹا بہت

خون میں تر ہے مگر گنبد پہ ہے
گو کبوتر پر ہُوا حملہ بہت

آج پھر ہے چاک پر کچا گھڑا
آج پھر منہ زور ہے دریا بہت

مُلک میں عدلِ جہانگیری نہیں
مُنصفوں میں ہے یہی چرچا بہت

ظرف معیاری ہے گر شاکر ترا
مات دینے کو یہی مُہرہ بہت

عبدالرزّاق دِلؔ

عبدالرزّاق دلؔ ابن محمد شبیر ،کھولاپور (امراؤتی) تاریخ پیدائش :۱۹۴۳ء

ایس۔ایس۔سی

"شکرپارے" "اسکول کی رونق" "گیت سنائے کمپیوٹر" اور "شاید کوئی دل" (شعری مجموعہ زیرِ طبع)

یوں حسرتوں کی بھیڑ ہے تنہائیوں کے پاس
جیسے محل میں داسیاں شہزادیوں کے پاس

بچ جلس نہ جائیں جہالت کی آگ میں
رکھیے نہ اس کپاس کو چنگاریوں کے پاس

جن رہبروں کے دل میں ہر اک کا خیال تھا
وہ نو رتن نہیں رہے درباریوں کے پاس

وہ سادگی ، وہ ناز و ادا خواب ہوگئے
بس خود نمائی رہ گئی انگڑائیوں کے پاس

دورِ جدید آج ترقّی کی آڑ میں
سب دے چکا برائیاں آبادیوں کے پاس

تنہا سمجھ رہے ہیں اُسے اس جہاں کے لوگ
لیکن ہے دِلؔ خیال کی گہرائیوں کے پاس

کنارے معتبر ہوتے محافظ ناخدا ہوتا
نہ کشتی ڈوبتی کوئی نہ ہر پل سانحہ ہوتا

یہاں حق بات یارو فائلوں میں نہ دبی ہوتی
عمر فاروقؔ جیسا گر ہمیں منصف ملا ہوتا

حسد و بغض و کینہ خودنمائی ہیں سبھی فتنے
یہ نہ ہوتے اگر شیطاں نے اِک سجدہ کیا ہوتا

تِلک پتھر میں گر ہوتی تو پھر پتھر نہ کہلاتا
وہ دبتا پر اُبھر جانے کا اس میں حوصلہ ہوتا

نہ یوں ماں باپ اپنی ناخلف اولاد کو روتے
اگر ہر ایک دن ان کا نہ فاقوں میں ڈھلا ہوتا

نئی تہذیب میں زندہ اگر شرم و حیا ہوتی
تو یوں نہ راستوں پر زیورِ عصمت لٹا ہوتا

الفاظ صبر و شکر کے بولی میں آگئے
جنّت کے پھل غریب کی جھولی میں آگئے

پہلی سی اب نہ راتیں، نہ نیندیں نہ خواب ہیں
سپنے ہمٹ کے نیند کی گولی میں آگئے

رنگوں کا کیا منائیں گے تہوار آج لوگ
اُن کو مزے تو خون کی ہولی میں آگئے

کٹیا سے بالاتر رہے خوف و ہراس و غم
خطرے حویلیوں میں رنگولی میں آگئے

شائد ہوس کا ناگ بھکارن کو ڈس گیا
بیجا اُبھار دامن و چولی میں آگئے

کیوں جانے چل کے شہرِ نگاراں سے آج دِلؔ
دیوانہ وار گاؤں کی ٹولی میں آگئے

عکس بلّی کا جب نظر آیا
اِک پرندہ نہ پیڑ پر آیا

بیخودی ہے شعور پر غالب
لُٹ نہ جائے حیا کا سرمایا

ایک بندر کو چاند، پانی میں
رات، ڈوبا ہُوا نظر آیا

یہ کرشمہ ہے اُس کی قدرت کا
کیوں نہ ہر پیڑ پر ثمر آیا

اس کو بھولا نہ ہم کہیں گے جو
شام ہوتے ہی اپنے گھر آیا

بن گئی ظلم کا نشانہ وہ
جب کبھی شاخ پر ثمر آیا

فائلوں میں ہی دب گئی حق بات
کوئی منصف نہ معتبر آیا

دِلؔ تھا تنہا کہ آس کا پنچھی
جانے اب لے کے کیا خبر آیا

مستان کاشفؔ

شیخ مستان کاشفؔ ابن محمد ابراہیم، ایوت محل　　　　تعلیم : ایچ۔ایس۔ایس۔سی
تاریخ پیدائش : ۲۶؍اکتوبر ۱۹۴۴ء
موظف مدرس

تنگ کرے گھر بھی چھوٹے کیا ہُوا تازہ لگے
ہم چلے جتنا بھی جھک کر سر کو دروازہ لگے
کیا ہے طوفاں، کیا ہے بارش، آندھیاں ہوتی ہیں کیا
گھاس کی چھت میں رہو تو پھر یہ اندازہ لگے
جب کریں سڑکوں پہ مزدوری ابھاگن لڑکیاں
پیاری پیاری صورتوں پہ دھول کا غازہ لگے
دشتِ تنہائی میں کاشفؔ چھوڑ کر وہ کیا گئے
بکھرا بکھرا زندگی کا اپنی شیرازہ لگے

یاد تازہ تیری کرنے کچھ وسیلے رہ گئے
گر گئی دیوار سے تصویر کیلے رہ گئے
حلق تر بھی نہ ہُوا تھا منہ سے ساغر چھن گیا
ہم وہ پیاسے ہیں کہ جن کے ہونٹ گیلے رہ گئے
پھول چُن کر لے گیا سب کوئی اپنا مہرباں
باغ میں اُمید کے کانٹے نکیلے رہ گئے
عمر کی وادی میں دُکھ کی ریت پھیلانے کے بعد
درد کے صحرا میں پھر دو چار ٹیلے رہ گئے
خنجرِ ابرو نے کاشفؔ زندگی کردی تمام
زخم کھا کر آرزوؤں کے قبیلے رہ گئے

اک ایسے چارہ گر سے بھی رشتہ رہا مرا
جتنا تھا زخم اُتنا ہی گہرا رہا مرا
میں کیا اکیلا چھانتا تیری گلی کی خاک
وہ درد تھا جو ہاتھ بٹاتا رہا مرا
وہ پیڑ کٹ کے ایک عمارت میں لگ گیا
سائے میں جس کے کارواں ٹھہرا رہا مرا
اب کے ہوائیں گھر سے مرے چھت بھی لے گئیں
موسم نیا مذاق اُڑاتا رہا مرا
کاشفؔ کل ایک لاش سرِ راہ دیکھ کر
مجھ سے ضمیر آنکھ چُراتا رہا مرا

سامنے جب ہم نہیں ہوں گے تو کیا رہ جائے گا
دیکھنے صورت تمھاری آئینہ رہ جائے گا
اے کھلونے بیچنے والے ادھر سے مت گذر
آج بھی بچّہ مرا روتا ہُوا رہ جائے گا
کانچ کے ٹکڑے چُنے اور ہاتھ زخمی کر لئے
راستوں کو یاد اپنا حوصلہ رہ جائے گا
دھوپ میں چل کر بہت ہم چھاؤں میں پہنچے تو کیا
پاؤں میں کوئی نہ کوئی آبلہ رہ جائے گا
آج بھی کاشفؔ اُسے نظریں بچا کر دیکھنا
اب تعلق نہ سہی یہ سلسلہ رہ جائے گا

آفتاب احمد خاں نسیمؔ

آفتاب احمد خاں نسیمؔ ابن عبدالرحمٰن خاں — سن پیدائش : ۱۹۴۴ء

ایم۔اے۔یو۔لاء

سابق سپرنٹنڈنٹ لا اینڈ جوڈیشری، اکولہ

''گل لہو'' (شعری مجموعہ، زیرِ ترتیب)

بھنور کشتی ڈبوتا ہے سمندر کچھ نہیں کہتا
وہ ہونے دیتا ہے سب کچھ مقدر کچھ نہیں کہتا

لبوں کو مصلحت سے بند ہی رکھتا ہے یہ ظالم
اُدھر جلتے ہیں گھر اور میرا رہبر کچھ نہیں کہتا

گداگر چار پیسے پا کے اونچا بولتا ہے اب
زر و دینار رکھ کر بھی تونگر کچھ نہیں کہتا

ثمر تک ہاتھ نہ پہنچے تو بونا خوب روتا ہے
پھلوں کا دان کرتا ہے قد آور کچھ نہیں کہتا

ہتھیلی بولتی ہے یا بتا دیتی ہے پیشانی
ستارے بولتے ہیں سب مقدر کچھ نہیں کہتا

نسیمؔ اک معجزہ ہے سرورِ عالم کا دنیا میں
علیؓ لیٹے ہوئے ہیں اور بستر کچھ نہیں کہتا

آندھیوں کو پتہ چلا کیسے
گھر کا چھپّر ترے اُڑا کیسے

کس نے ان بجلیوں کو دعوت دی
آشیاں تیرا ہی جلا کیسے

جب ہَوا خود ترے مخالف تھی
پھر دیا تیرا بجھ گیا کیسے

بھیڑیا میمنے کو لے اُچکا
سگ یہ سب دیکھتا رہا کیسے

رُک گیا تھا نظامِ ہستی جب
حادثہ پھر بھلا ہُوا کیسے

کس کا الزام تیرے سر ہے نسیمؔ
چرچا تیرا ہے جا بجا کیسے

تو اپنے مرتبے کی شان رکھ دے
ضمیر اپنا اٹھا لے، جان رکھ دے

کہانی پھونک دے، عنوان رکھ دے
مرے قاتل، تری پہچان رکھ دے

اُٹھا مت! میرا لاشہ اپنے سر پر
تباہی کا ہے یہ سامان رکھ دے

مشقت کھینچ لے فاقے کی، سو جا
رزالت جس میں ہو وہ نان رکھ دے

کسی کم ظرف سے لقمہ نہ لینا
اگرچہ اپنا دستر خوان رکھ دے

صدا آنے لگی ہے رب کے گھر سے
نسیمؔ! اب پیٹ اور دوکان رکھ دے

سراپا مہربانی ہو گیا کیا
فرشتہ آسمانی ہو گیا کیا

بہایا جا رہا ہے روز اس کو
ہمارا خون پانی ہو گیا کیا

مرا لاشہ اُٹھا کے سر پہ اپنے
ترا پتہ بھی پانی ہو گیا کیا

مرا بھائی لئے پھرتا ہے خنجر
اسیر بدگمانی ہو گیا کیا

مہرباں ہو گئی، کچھ زر کی دیوی
تو پھر وہ خاندانی ہو گیا کیا

نسیمؔ اپنا بھی اِک کردار جو تھا
وہ اب قصہ کہانی ہو گیا کیا

عظیم اللہ خاں وقارؔ

عظیم اللہ خاں وقارؔ ابن رحیم خاں (مدرّس)، اکولہ　　تاریخ پیدائش : ۱۳ر دسمبر ۱۹۳۴ء

ایچ۔ ایس۔ ایس۔ سی

ملازمت : لینڈ ڈیولپمنٹ ڈپارٹمنٹ، اکولہ

سختیوں سے گزر رہا ہوں میں　　گویا قسطوں میں مر رہا ہوں میں
دوستوں کی نوازشیں توبہ　　اپنے سایہ سے ڈر رہا ہوں میں
ظلمتوں کا غرور ٹوٹے گا　　نور بن کر اُبھر رہا ہوں میں
ایک عالم تو یوں بھی گزرا ہے　　آپ سے بے خبر رہا ہوں میں
کوئی آکر سمیٹ لے مجھ کو　　ریزہ ریزہ بکھر رہا ہوں میں
تیرا چہرہ ہے آئینے جیسا　　روبرو ہوں، سنور رہا ہوں میں
چن کے کانٹے وقارؔ نفرت کے　　اپنے دامن میں بھر رہا ہوں میں

جو گھر کی بات باہر بولتا ہے　　وہ میرا ہی برادر بولتا ہے
اُجالے اب ہمیں ڈسنے لگے ہیں　　سکوتِ شب کا منظر بولتا ہے
جلیں گے اُن غریبوں کے مکاں پھر　　یہاں کا ہر ستمگر بولتا ہے
موثر ہو جو اندازِ تخاطب　　پڑا راہوں میں پتھر بولتا ہے
کسی کا قتل ہوگا پھر یقیناً　　چھپا ہاتھوں میں خنجر بولتا ہے
رویہ ہو تمہارا مخلصانہ　　مری ملّت کا رہبر بولتا ہے
وقارؔ حق نوا کی بات سن لو　　ہزاروں میں وہ کھل کر بولتا ہے

کیوں یہ حُسنِ نظر دیا تونے / وقفِ آلام کردیا تونے

مندمل جو کبھی نہ ہو پائے / ایسا زخمِ جگر دیا تونے

کون منصور جو چڑھے سولی / یوں تو سب کو جگر دیا تونے

ڈوبتی نبض ، کرب ، سناٹے / اور حکمِ سفر دیا تونے

زندگی چھاؤں کو ترستی ہے / کیسا جلتا سفر دیا تونے

تاج بنتے ہی ہاتھ کٹتے ہیں / کیسا دستِ ہنر دیا تونے

اس جہاں کا ہر ایک غم لا کر / میرے دامن میں بھر دیا تونے

سب کے ہاتھوں میں دے دیے پتھر / مجھ کو شیشے کا گھر دیا تونے

جس نے مجھ کو وقارؔ بخشا ہے / وہ غمِ معتبر دیا تونے

اب تحفظ نہیں ہے جانوں کا / یہ ہے احسان حکمرانوں کا

بھوک ، افلاس ، اور بیماری / مسئلہ ہے کئی گھرانوں کا

ساری بستی نگل گیا طوفاں / کیا چلے گا پتہ مکانوں کا

ہو گیا کتنا لالچی انساں / بن گیا سانپ وہ خزانوں کا

تولتے ہیں پَروں کو وہ اپنے / علم جن کو نہیں اُڑانوں کا

صرف باقی رہا کتابوں میں / ذکر اب شاہی خاندانوں کا

چاہتے ہو وقارؔ آزادی / فدیہ دینا پڑے گا جانوں کا

عبدالصمد خاں قیصرؔ

عبدالصمد خاں قیصرؔ ابن سیف الدین خاں، گھاٹن جی (ایوت محل)

ایم۔اے (اردو، عربی، سیاسیات) بی۔ایڈ — تاریخ پیدائش : ۱۰ر مارچ ۱۹۳۵ء

موظف مدرّس عثمان آزاد اردو ہائی اسکول اکولہ و

ایم۔اے۔کے آزاد ہائی اسکول و جونیئر کالج، ناگپور

دل کی لگی کے ساتھ، عجب دل لگی رہی
ظالم سے دوستی میں بھی اکثر ٹھنی رہی

وہ دور ہو گئے تو یہ اُلجھن بنی رہی
شاید مرے خلوص میں کوئی کمی رہی

محفل میں اُن کی پاسِ ادب بھی ضرور تھا
خاموش تھی زبان، نظر بولتی رہی

اوصاف عاجزی کے تکبّر نے کھا لئے
کردارِ نسلِ نو میں کہاں عاجزی رہی

دیتا رہا جہاں کو ہر اک سانس کا حساب
کیسی عذابِ جاں یہ مری زندگی رہی

گم کردہ راہِ شوق رہا مَیں تمام عمر
منزل اگرچہ راہ مری دیکھتی رہی

قیصرؔ اُٹھو کہ آگ لگی ہے مکان میں
جل جاؤ گے جو تم میں یونہی بے حسی رہی

مجھے نہ ڈھونڈ چمن کی حسیں بہاروں میں
سفیرِ دشت ہوں، رہتا ہوں خارزاروں میں

ہر ایک بات کی تشریح تو نہیں ہوتی
کبھی تو بات کو سمجھا کرو اشاروں میں

وہ کیسا جوش تھا، بچّوں میں بھی شہادت کا
اُچک رہے تھے جو پنجوں کے بَل قطاروں میں

خوشا! کہ میری بصیرت ابھی سلامت ہے
پرکھ رہا ہوں نگینوں کو سنگ پاروں میں

بجا کہ تجھ کو ہے شوقِ شناوری لیکن
ہے فرق جھیل، ندی، بحر کے کناروں میں

اُسے یہ خوف کہ مَیں با اثر نہ ہو جاؤں
وہ میرا نام بھی لیتا نہیں اشاروں میں

ریا پسند مزاجوں میں دین کیا قیصرؔ
نہیں ہے جوہرِ ایماں ہی دینداروں میں

مجھے منزلوں کی ہے جستجو، نہ کسی ڈگر کی تلاش ہے
جو مری نظر کو سمجھ سکے، مجھے اس نظر کی تلاش ہے

مجھے پاسِ دیر و حرم نہیں، میری بندگی ہے وہ بندگی
جہاں خود بخود مرا سر جھکے، اسی سنگِ در کی تلاش ہے

یہ جہانِ رنج و الم تو ہے، یہاں روز و شب یہی غم تو ہے
نہ ہو جس کی پھر کوئی شامِ غم، مجھے اس سحر کی تلاش ہے

مَیں بھٹک رہا ہوں اِدھر اُدھر، کوئی ہمسفر ہے نہ راہبر
مری منزلوں سے جو خود ملے، اسی رہگزر کی تلاش ہے

مَیں پریشاں حال ہوں اس قدر، کہ ہے چشم تر تو حزیں جگر
جہاں چل کے دل کو سکوں ملے، اُسی بام و در کی تلاش ہے

مَیں مثالِ شمعِ مزار ہوں، مَیں ظفر کا اُجڑا دیار ہوں
مَیں وہی ہوں قیصرِؔ غمزدہ، مجھے پھر ظفر کی تلاش ہے

کاغذ، قلم، کتاب سے محروم ہو گئے
ہم جیتے جی جہان میں مرحوم ہو گئے

حاکم بنے تو کھو گئے دنیائے عیش میں
ساقی، شراب جام کے محکوم ہو گئے

مقتول ہی پہ آ گیا الزامِ خود کشی
قاتل نگاہِ عدل میں معصوم ہو گئے

غربت میں ساتھ چھوڑ دیا تو نے بھی مرا
معنی ترے خلوص کے معلوم ہو گئے

کس سے ملیں کہ ذہن نہیں ہے کسی کا صاف
سارے ہی لوگ شہر کے مسموم ہو گئے

جب زندگی میں دین تھا، خوشیاں تھیں چار سو
غافل ہوئے تو دہر میں مغموم ہو گئے

مطلب پرست رہ گئے قیصرؔ جہان میں
جو پیکرِ خلوص تھے، معدوم ہو گئے

عزیز خان عزیزؔ

عزیز خاں عزیزؔ ابن سکندر خاں، شے گاؤں (بلڈانہ) موبائیل : 09822706435
ایچ۔ ایس۔ سی۔ ڈی۔ ایڈ تاریخ پیدائش : یکم اپریل ۱۹۴۵ء
موظف مدرّس
''لفظوں کی مالا'' (نظم، گیت) ''دھواں دھواں بدن'' (شعری مجموعہ، زیر ترتیب)

زہر دو یا دوا ضروری ہے — بہر صورت شفا ضروری ہے
پیار ہے تو گلہ ضروری ہے — تلخ و شیریں مزا ضروری ہے
بے اصولی میں اطمینان کہاں — زیست میں ضابطہ ضروری ہے
حل مسائل کا ڈھونڈنے کے لیے — باہمی مشورہ ضروری ہے
دوسروں کو سمجھنے سے پہلے — خود کو ہی جاننا ضروری ہے
شر سے بچنے کے واسطے یارو — خیر کا راستا ضروری ہے
لوگ ملتے ہیں سب محبت سے — دوستی ہو یہ کیا ضروری ہے
دوستوں کے علاوہ اپنے پاس — دشمنوں کا پتا ضروری ہے
دل سے کرتا عزیزؔ کچھ بھی نہیں — اس کو تیری رضا ضروری ہے

کون کہتا ہے خار ہیں ہم لوگ — گلستاں کی بہار ہیں ہم لوگ
خاکساری ہمارا شیوہ ہے — اصل میں تاجدار ہیں ہم لوگ
ہم کو ہتھیار کی ضرورت کیا — جب محبت شعار ہیں ہم لوگ
تخت والے تو ہو گئے معزول — برسرِ اقتدار ہیں ہم لوگ
سائلوں کی دعائیں لیتے ہیں — کس قدر مالدار ہیں ہم لوگ
حال و ماضی ہمارے ہیں شاہد — قابلِ اعتبار ہیں ہم لوگ
ہم کو دنیا عزیز لگتی ہے — نام کے دیندار ہیں ہم لوگ
کون ہیں جو ہمیں عزیزؔ نہیں — دشمنوں کے بھی یار ہیں ہم لوگ

کون ہے قوم کا معمار چلو دیکھیں گے
کس میں ہے جذبۂ ایثار چلو دیکھیں گے

جن کے سائے میں بڑا دل کو سکوں ملتا تھا
کیا سلامت ہیں وہ اشجار چلو دیکھیں گے

وقت کی دھند میں ممکن ہے بچھڑ جائے گا
آدمی جو ہے ملنسار چلو دیکھیں گے

قدرداں اس کے ہنر کے ہیں ہزاروں پھر بھی
کیوں پریشان ہے فنکار چلو دیکھیں گے

ایک ہی گھر میں رہا کرتے تھے دونوں بھائی
کیوں کھڑی ہوگئی دیوار چلو دیکھیں گے

در و دیوار عمارت کے تو فولادی تھے
ہوگئی کیسے وہ مسمار چلو دیکھیں گے

اس کی گفتار میں شامل ہے صداقت کی مہک
کون ہے صاحبِ کردار چلو دیکھیں گے

پیٹھ پہ وار نہیں کرتا سپاہی کوئی
کون ہے فوج کا سالار چلو دیکھیں گے

جس کی عظمت کا بیاں تم نے سنا ہے اے عزیزؔ
اپنی آنکھوں سے وہ دربار چلو دیکھیں گے

بے وفا پائے گئے حسن کے پیکر کتنے
پھر بھی وابستہ رہے ان سے مقدر کتنے

اُٹھ گئے محفلِ دنیا سے سخنور کتنے
ان میں گذرے ہیں صداقت کے پیمبر کتنے

آج بن بیٹھے ہیں بت خانوں کی عظمت کے نشاں
میرے ہاتھوں کے تراشے ہوئے پتھر کتنے

غیر ممکن نہیں تسخیرِ زمانہ لیکن
آپ کے پاس ہیں اخلاق کے زیور کتنے

نیکیاں کرکے بھلا دینا ہے شیوہ جن کا
دیکھئے بستی میں ایسے ہیں تونگر کتنے

دور کردیتے ہیں احباب و اقارب کو ندیم
منہ سے نکلے ہوئے الفاظ کے نشتر کتنے

امتحاں لے کے کئی بار فلک نے دیکھا
خاک کے پتلے میں پوشیدہ ہیں جوہر کتنے

رہنمائی کا کبھی دعویٰ کیا کرتے تھے
بیچ طوفان کے ہمراہ تھے رہبر کتنے ؟

پُرسکوں دور کی حسرت میں خدا جانے عزیزؔ
دیکھنے ہونگے ہمیں خون کے منظر کتنے

رشید خاں رضاؔ

عبدالرشید خاں رضاؔ ابن ابراہیم خاں، اکولہ تاریخ پیدائش : ۱۱؍ اکتوبر ۱۹۴۵ء
''احساسِ رضاؔ (شعری مجموعہ زیرِ ترتیب)

سکونِ قلب پانا ہے تو سجدہ ریز ہوجاؤ
بنانا ہے مقدر کو تو پھر تبریزؒ ہوجاؤ
جہاں میں کس کی چنگیزی رہی سوچو ذرا یارو
یہ کس نے کہہ دیا تم سے کہ تم چنگیز ہوجاؤ
ہمیں ہم سے جدا کرنے کی جرأت ہے یہاں کس میں
لڑاؤ اور جہانبانی کرو انگریز ہوجاؤ
کہیں کھیتی ہری اخلاق کی بنجر نہ ہوجائے
خلوص و پیار کا پیکر بنو زرخیز ہوجاؤ
بجھانے تشنگی اپنی زمانہ چل کے آئے گا
رضاؔ پہلے سمندر کی طرح لبریز ہوجاؤ

جو شجر دھوپ میں جلے ہوں گے
کیا ثمر دینگے کیا پھلے ہوں گے
وہ جو فٹ پاتھ پر پلے ہوں گے
آخر انساں ہیں کچھ بھلے ہوں گے
مَیں نے مانا کہ ہوں گے مہر بلب
اشک آنکھوں سے تو ڈھلے ہوں گے
گردشِ وقت پھر مخالف چل
پھر جواں میرے حوصلے ہوں گے
تہہ میں ڈھونڈیں گے تو ملیں گے گہر
آزمائش کے مرحلے ہوں گے
اُن گلوں کو چبھن کا کیا احساس
ساتھ کانٹوں کے جو پلے ہوں گے
درد سینے میں لازمی ہے رضاؔ
جب زمیں ہے تو زلزلے ہوں گے

ایسا ہے تیرے پیار کا سایہ جیسے فصلِ بہار کا سایہ
اُن کے آنے کی خبر دیتا ہے کارواں کے غبار کا سایہ
بے سبب تو نہیں ہے آنکھوں پر دیکھیے یہ خمار کا سایہ
اس کو جنّت سے کم نہیں دنیا جس پہ ہے ماں کے پیار کا سایہ
مجھ کو جینے دے اور نہ مرنے دے یہ ترے انتظار کا سایہ
کیا بگاڑے گا یہ جہاں اپنا سر پہ ہے کردگار کا سایہ
آج کیوں اُٹھ گیا زمانے سے اے رضاؔ اعتبار کا سایہ

تباہی رقص کرتی ہے سدا جن کے اشاروں پر
انہی کا باغِ عالم میں تسلّط ہے بہاروں پر
بلندی راس نہ آئے جنھیں وہ نیچے گرتے ہیں
یہی نظارہ ملتا ہے ہمیشہ آبشاروں پر
نشہ کوئی بھی ہو کچھ سوچنے دیتا نہیں رُک کر
بڑا مشکل ہے رُک جانا ڈھلانوں پر اتاروں پر
وہی پاتے ہیں گوہر جو اُترتے ہیں سمندر میں
ملے گا کیا انھیں جو بیٹھ جاتے ہیں کناروں پر
جو گل ہوں تو اندھیرا ہو، جو بھڑکیں آگ لگ جائے
بھروسہ کر لیا ہم نے کچھ ایسے ہی شراروں پر
فضائے عالمِ ہستی معطّر ہے ہمیں سے آج
ہمارا ہی سدا سے قرض ہے آتی بہاروں پر
نہیں ہے اے رضاؔ فرزانگی کچھ علم پر موقوف
کہ غالب آ گئے دیوانے اکثر ہوشیاروں پر

مخلصؔ مصوری

خواجہ معین الدین مخلصؔ ابن خواجہ رحیم الدین، پوسد (ایوت محل) تاریخِ پیدائش: ۵ ۱۹۳ء
وظیفہ یاب مدرّس موبائل : 9423434654
''حرف حرف موتی'' (شعری مجموعہ)

رنگ لایا ہے عمرؓ تیرا مسلماں ہونا
ورنہ مشکل تھا بہت گُل کا گلستاں ہونا

کون پھر اس کو بہاروں کی قبا پہنائے
جس کی تقدیر میں لکھا ہو بیاباں ہونا

ہم نے دیکھا ہے فقیروں کی دعاؤں کا اثر
ہم نے دیکھا ہے مقدر کا پشیماں ہونا

ہر پریشانی وہاں آکے پریشان ہوئی
جانتا ہی نہیں جو کیا ہے پریشاں ہونا

کیوں نہیں جانتے اس بات کو دنیا والے
وجہِ افلاس بھی ہے چاک گریباں ہونا

تیری قدرت کا کرشمہ ہے سمجھ سے باہر
یعنی اک بیج سے پودے کا نمایاں ہونا

جج کی پائی ہے ضرور اُس نے سعادت مخلصؔ
جس کی قسمت میں لکھا پاکیٔ عصیاں ہونا

انسان جب سے زر کا پرستار ہوگیا
دنیا میں گرم قتل کا بازار ہوگیا

کیسے کہوں کہ اعلیٰ ہے اُس کا حسب نسب
کم اصل کو جو آئینہ بردار ہوگیا

پھیلا رہا ہے ہاتھ رعایا کے سامنے
مجبور کیسا وقت کا مختار ہوگیا

صحبت کسی فقیر کی ملنے کی دیر تھی
گمراہ شخص صاحبِ کردار ہوگیا

قاتل کو مل بھی جائے سزا موت کی تو کیا
ویران تو غریب کا گھر بار ہوگیا

بٹوارہ گھر کا ہوتے ہی قسمت بھی بٹ گئی
کوئی غریب اور کوئی زردار ہوگیا

جب شاعری کی شین سے واقف تلک نہیں
مخلصؔ کا پھر بھی طرّہ کہ فنکار ہوگیا

بجلیوں کو پالا ہے میں نے اک زمانے سے
روشنی نکلتی ہے میرے آشیانے سے

جانتا ہوں اُس کو میں ہے وہ مصلحت اندیش
ہاتھ تو ملا لے گا دل رہا ملانے سے

کس قدر یہ بہتر ہے قولِ اہلِ دانش کا
جرم اور بڑھتے ہیں جُرم کے چھپانے سے

یہ حدیث بھی دیکھو حق ہے ہر زمانے میں
عمر گھٹتی جاتی ہے جھوٹی قسمیں کھانے سے

چاپلوس لوگوں کی کر رہے ہیں سرداری
شاید ان کا رشتہ ہے مطلبی گھرانے سے

کتنی ہی بلندی پر بیٹھ جائیں گدھ سارے
اعلیٰ ہو نہیں جاتے اونچی کرسی پانے سے

ذہنِ اہلِ دانش میں پائی ہے جگہ مخلصؔ
ہر ادب کی محفل میں صرف آنے جانے سے

جب تلک غم جواں نہیں ہوتا
صبر کا امتحاں نہیں ہوتا

چھیڑ مت جذبۂ مجاہد کو
یہ کبھی ناتواں نہیں ہوتا

جانتا ہوں قریب سے اُس کو
بے غرض مہرباں نہیں ہوتا

ایسے انداز سے وہ ملتا ہے
دشمنی کا گماں نہیں ہوتا

ہو محل یا غریب کی کٹیا
غم کبھی بے مکاں نہیں ہوتا

ہم میں شامل کوئی منافق ہے
دوست یوں بدگماں نہیں ہوتا

لاکھ تعلیم یافتہ ہی سہی
کم نظر نکتہ داں نہیں ہوتا

بند کر اب تو شغلِ نسل کشی
دیکھ وقت ایک ساں نہیں ہوتا

عزم کو آزما لیا مخلصؔ
رائیگاں امتحاں نہیں ہوتا

ضیاء زخمی

ضیاء اللہ شاہ زخمی ابن عطا اللہ شاہ، کھامگاؤں (بلڈانہ) تاریخ پیدائش : ۱۶رفروری ۱۹۴۶ء
تعلیم : بی۔اے۔ڈی۔ایڈ موبائیل : 9970013917
درس وتدریس
''زخموں کے چراغ''، ''تنہائی کی بھیگی رات'' (شعری مجموعے) ''رختِ سفر'' (غیر مطبوعہ)

اس طرح کرب کی شدت کو چھپا رکھا ہے
میں نے پلکوں پہ تبسم کو سجا رکھا ہے

وہ مرے گھر کی طرف لوٹ کے آئے گا کبھی
بس اسی آس پہ اک دیپ جلا رکھا ہے

میں اندھیروں سے بھلا خوف بھی کھاتا کیسے
میرے ماں باپ نے تو نام ضیاء رکھا ہے

اور کیا دوں میں تجھے اپنی محبت کا ثبوت
تیرے قدموں پہ زمانے کو جھکا رکھا ہے

ہاتھ رسما ہی ملایا تھا کسی سے میں نے
آسماں تم نے مگر سر پہ اٹھا رکھا ہے

کھوئے کھوئے ہوئے رہتے ہیں ہمیشہ آخر
تم نے کیا حال ضیاء زخمی بنا رکھا ہے

گھٹتی ہیں تمنائیں انفاس کے آنگن میں
دل غم سے سلگتا ہے جب آس کے آنگن میں

صدیوں سے ہے یہ پیاسا چاہت کے رسولوں کا
برگد کوئی سوکھا سا افلاس کے آنگن میں

جلووں کی تمازت نے پھولوں کی نزاکت نے
کیا کیا نہ کھلائے گل الماس کے آنگن میں

ہنسنے کو ترستے ہیں تقدیر پہ روتے ہیں
غنچے مری حسرت کے ہیں یاس کے آنگن میں

روندا ہے تخیل کے پھولوں کو ضیاء زخمی
اک مہر درخشاں نے عکاس کے آنگن میں

ابھی اپنے موافق ہی نہیں حالات ویسے بھی
وگرنہ اے ستمگر کیا تری اوقات ویسے بھی
نہیں میں ہاں کا پہلو بھی نظر آتا تو ہے لیکن
ہمارے بیچ حائل ہیں کئی خدشات ویسے بھی
گلہ کرتا بھی کیا غیروں سے ان کی بے وفائی کا
کہاں کم ہیں مرے اپنوں کے احسانات ویسے بھی
کسی بھی سمت سے سورج نکل آئے تو کیا حاصل
لکھی ہے اپنی قسمت میں اندھیری رات ویسے بھی
پشیماں کیوں نہ ہو آخر حسد والے ضیا زخمی
تعارف کی کہاں محتاج تیری ذات ویسے بھی

وفا شعار کوئی ہمسفر ملے تو سہی
تجھے بھی اپنا بنا لیتے ایک ہی پل میں
اسے میں اپنا کلیجہ نکال کر دے دوں
کوئی دریچوں سے جھانکے تو دوں صدا اس کو
تمہیں بتائیں گے حالاتِ حاضرہ کا مزاج
اسے گلے سے لگائیں گے ہم ضیاء زخمی

مجھے گریز نہیں معتبر ملے تو سہی
تری نظر سے ہماری نظر ملے تو سہی
یہ شرط ہے کہ کوئی دیدہ ور ملے تو سہی
بہت تلاش کیا تیرا گھر ملے تو سہی
کہیں سے کوئی بھی اچھی خبر ملے تو سہی
کوئی ہماری طرح چشمِ تر ملے تو سہی

سبحان انجم

سیّد سبحان انجم ابن سیّد احمد، شے گاؤں (بلڈانہ)　　تاریخ پیدائش : ۲؍مارچ ۱۹۴۶ء
تعلیم : ایس۔ ایس۔ سی۔ سول ڈرافسمین (ڈپلومہ)
ابتدائی علم عروض ۱۹۷۰ء شعر و تقطیع کا چارٹ ۱۹۷۱ء شاعری کا فن (دیوناگری) ۲۰۰۰ء
محکمۂ آبپاشی سے وظیفہ یاب　　موبائل : 09371146170

کوئی پیاسا نہ رہے آج وہ کہہ کر نکلا
ابر بن کر مری بستی سے سمندر نکلا
لوگ بادل کی طرح راہ میں آئے ورنہ
میں تو سورج کی طرح گھر سے برابر نکلا
جس نے چومے تھے مرے پاؤں بڑے پیار کے ساتھ
خواب ٹوٹا تو وہی آگ کا بستر نکلا
عمر بھر ریت کے ساگر میں چلائی کشتی
اور ڈوبا تو خلاؤں کے بھی اوپر نکلا
کیا تعلق تھا کسی شہر کے لوگوں سے مگر
جو بھی انجم سے ملا آج وہ رو کر نکلا

ہم حق پہ ہیں تو کیسے سر دار کون ہے　　احباب پارسا ہیں گنہ گار کون ہے
تم ہی بتاؤ دوست وفادار کون ہے　　مشکل میں آج اپنا مددگار کون ہے
پتھراؤ ہو رہا ہے مسلسل مکان پر　　اب کیا بتائیں ہم پسِ دیوار کون ہے
سورج کو ساتھ لے کے بھی آئیں تو کیا ملے　　کرے ہیں سب کے بند پرستار کون ہے
انجم ہمارے پاس فقط پیار ہی تو ہے　　لیکن محبتوں کا خریدار کون ہے

کرم فرما تری یادوں کے لشکر ٹوٹ جاتے ہیں
نگاہوں میں جو رہتے ہیں وہ منظر ٹوٹ جاتے ہیں
خوشی کو بانٹنے والے بھی اکثر ٹوٹ جاتے ہیں
حدودِ ضبط سے آگے سمندر ٹوٹ جاتے ہیں
اگر خاموش رہتے ہیں تو دل پر بوجھ رہتا ہے
اگر ہم بولتے ہیں کچھ تو کہہ کر ٹوٹ جاتے ہیں
محبت ہو تو رشتے اور بھی مضبوط ہو جائیں
کوئی بجلی گرے دل پر تو پھر گھر ٹوٹ جاتے ہیں
عقیدت جن سے ہوتی ہے انہیں پوجا بھی جاتا ہے
جنھیں نسبت نہیں ملتی وہ پتھر ٹوٹ جاتے ہیں
تری قربت میں پلتے ہیں تری چاہت میں چلتے ہیں
تری فرقت میں ہم دل کے برابر ٹوٹ جاتے ہیں
وفا میں جینے والوں کی عجب ہے داستاں انجم
کہیں وہ ڈوب جاتے ہیں کہیں پر ٹوٹ جاتے ہیں

گرم ہے عشق کا بازار چلو دیکھیں گے
کون ہے اپنا خریدار چلو دیکھیں گے
کون ہے قوم کا سردار چلو دیکھیں گے
وہ بھی کس کا ہے طلب گار چلو دیکھیں گے
سبز باغوں کی زیارت تو بہت اچھی ہے
کون ہمدرد ہے سرکار چلو دیکھیں گے
ہم نے کلیوں کو جہاں خون دیا تھا پہلے
کس مصیبت میں ہے گلزار چلو دیکھیں گے
ہم کو کل تک تو رُلایا ہے بری خبروں نے
آج کیا کہتا ہے اخبار چلو دیکھیں گے
وقت آنے دو سبھی لوگ بچھڑ جائیں گے
کون ہوتا ہے وفادار چلو دیکھیں گے
راستے پاؤں کی زنجیر بنے جاتے ہیں
منزلیں کتنی ہیں دشوار چلو دیکھیں گے
اپنے بچوں کے لئے دھوپ میں جھلسے ہم بھی
ہم سے کتنا ہے انھیں پیار چلو دیکھیں گے
اپنے ہاتھوں سے تراشا ہے جسے انجم نے
اپنی آنکھوں سے وہ شہکار چلو دیکھیں گے

انور خاں انورؔ

انور خاں انورؔ ابن زورآور خاں، اکولہ　　تاریخ پیدائش : ۱۱/اپریل ۱۹۴۶ء
میٹرک ڈی۔ایڈ　　موظف مدرس

اپنے کردار سے گرتے ہوئے بندے دیکھے　　میں نے انسان کی صورت میں درندے دیکھے
پہلے مجرم کو ہی ملتی تھی گناہوں کی سزا　　اب تو معصوم کی گردن میں ہی پھندے دیکھے
جن کے دم سے ہے فلک بوس مکانوں کا وجود　　اُن کے ہیں کون سے بازار میں دھندے دیکھے
آج اُجڑے ہوئے لوگوں کی پناہ گاہوں میں　　مَیں نے مُردوں کی طرح سینکڑوں بندے دیکھے
سربسر فرقہ پرستوں کے وطن میں انورؔ　　رہنما ہم نے سدا اپنے گزندے دیکھے

ہے ذکر یہی ہر سو اب عمر درازوں میں　　کھوئی ہوئی دنیا ہے یہ شعبدہ بازوں میں
اس لَے سے ترنّم سے میں کیسے بہل جاؤں　　آواز نہیں باقی جب دل کے ہی سازوں میں
سجدے ہوں نمائش کے پھر کیسے اثر ہوگا　　مالک پہ دعاؤں کا بندے کی نمازوں میں
میت میں امیروں کی اک جشن سا رہتا ہے　　لوگوں کی کمی کیوں ہے غرباء کے جنازوں میں
کہہ دیں گے سرِ محشر اعضائے بدن انورؔ　　اعمال خدا سے سب، کچھ ہوگا نہ رازوں میں

اندازِ گفتگو کو بھی تکرار مت بنا
ہر گز زباں کو تیر و تلوار مت بنا

اس زندگی کو ڈر کے مصائب کی دھوپ سے
راحت کی چھاؤں کے لئے غمخوار مت بنا

زر، زن، زمین اصل میں تینوں ہیں فتنہ گر
حرص و ہوس کا دل کو طلبگار مت بنا

نادان دل کو، ظرف سے خالی دماغ کو
اپنا رفیق اپنا مددگار مت بنا

انورؔ نشاط و عیش میں دنیا کی ڈوب کر
ملکِ عدم کی راہ کو پُرخار مت بنا

بھلا ہی دعاؤں سے ہوتا ہے سب کا
"دعا کھٹکھٹاتی ہے دروازہ رب کا"

بلاؤں سے رہتا ہے محفوظ ہر دم
سکوں دے جو ماں باپ کو روز و شب کا

مخالف ہوئے لوگ اردو کے پھر بھی
جہاں بھر میں رتبہ ہے اردو ادب کا

کریں قتل و غارت گری ظلم جو بھی
انھیں پاس کب ہے حسب کا نسب کا

کرے گا جو مظلوم پر ظلم انورؔ
نشانہ بنے گا وہ رب کے غضب کا

خواجہ رفعت حسین نیرؔ

خواجہ رفعت حسین نیرؔ ہاشمی، اکولہ — تاریخ پیدائش : ۱؍ جولائی ۱۹۴۶ء
ایم۔اے (اردو)
رٹائرڈ ڈویژنل اکاؤنٹنٹ ایم۔ایس۔ای۔ٹی، اکولہ

پیار، الفت، محبت، وفا لے گئی
نسلِ نو ساری قدریں بہا لے گئی

روئی ہیں بیٹیاں جہیز کی مانگ پر
ان کے ہاتھوں سے رنگِ حنا لے گئی

رشتے ناتوں میں اب وہ مروّت کہاں
غیریت اپنے پن کی ادا لے گئی

بگڑے حالات، خودداریاں بھی گئیں
مفلسی میری ساری انا لے گئی

وقتِ رُخصت نہ آنکھوں سے آنسو گرے
مُسکراہٹ غموں کو چھپا لے گئی

پھول شاخوں پہ ہی تلملاتے رہے
چھین کر اُن کی خوشبو ہُوا لے گئی

خواب نیرؔ نے دیکھے تھے کیا کیا مگر
ان کی تعبیر نیندیں اُڑا لے گئی

کوئی پہلو میں صنم ہو تو غزل ہوتی ہے
حُسن مائل بہ کرم ہو تو غزل ہوتی ہے

دل میں پنہاں کوئی غم ہو تو غزل ہوتی ہے
زندگی غم سے رقم ہو تو غزل ہوتی ہے

ہم لئے زادِ سفر درد کی سوغات چلے
ہم سفر کوئی الم ہو تو غزل ہوتی ہے

دور رہ کر نہیں کھل سکتے تمنا کے گلاب
فاصلہ کچھ ذرا کم ہو تو غزل ہوتی ہے

چاند سے مکھڑے پہ بکھری ہوں جو کالی زلفیں
اور کسی زلف میں خم ہو تو غزل ہوتی ہے

کچھ تجلّی رُخِ دلدار سے آنکھوں کو ملے
روبرو روئے صنم ہو تو غزل ہوتی ہے

وہ اگر روٹھے ہیں نیرؔ تو نہیں ہوتی غزل
ان کا الطاف و کرم ہو تو غزل ہوتی ہے

انداز فکر اپنا بدل کر تو دیکھئے
نفرت کے دائروں سے نکل کر تو دیکھئے

ہم ہیں وفا پرست یہ آجائے گا نظر
عینک کو آپ اپنی بدل کر تو دیکھئے

منزل ضرور چومے گی قدموں کو آپ کے
عزمِ سفر کے ساتھ نکل کر تو دیکھئے

سو جائیں گے سکون سے ہر رات آپ بھی
مزدور جیسا دھوپ میں جل کر تو دیکھئے

ہر دلعزیز آپ بھی بن جائیں گے حضور
خولِ انا سے اپنے نکل کر تو دیکھئے

خودمٹ کے فیض اوروں کو دینے کے لطف کو
نیّر شمع سا آپ بھی جل کر تو دیکھئے

ہوں خطا وار کوئی سزا دیجئے
پیار کا کچھ تو مجھ کو صلہ دیجئے

بے وفائی کا الزام دے کر مجھے
یوں نہ محفل سے اپنی اُٹھا دیجئے

نفرتیں دل میں رکھنے سے کیا فائدہ
اختلافات باہم مٹا دیجئے

ہم بنائیں گے پھر اک نیا آشیاں
آپ توڑیں اسے یا گرا دیجئے

جستجو کیجئے اک نئے دور کی
نا امیدی کو دل سے مٹا دیجئے

آشیاں پھر بنایا ہے ہم نے فلک
شوق سے آپ بجلی گرا دیجئے

شاد رہتا ہے نیّر تو اے حاسدو!
آگ خوشیوں میں اس کی لگا دیجئے

ڈاکٹر زینت اللہ جاویدؔ

شیخ زینت اللہ جاویدؔ ابن شیخ رحمت اللہ جاگیردار، ہتروں (اکولہ)
ایم۔اے۔پی۔ایچ ڈی (اردو) ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی (فارسی)
تاریخ پیدائش : ۱۱ ستمبر ۱۹۴۶ء
پروفیسر اینڈ ہیڈ نواب شیر محمد خاں انسٹیٹیوٹ (پنجابی یونیورسٹی) مالیر کوٹلہ (پنجاب) (وظیفہ یاب)
''نئی اردو شاعری'' ''شعری رویئے'' (تنقید) ''اردو میں انشائیہ کا قیام''
''آئینے کا گھر'' (غزلیات)، دیگر متعدد کتب

جہاں زمین کا ٹکڑا مکان ٹھہرے گا
وہیں تو قافلۂ جسم و جان ٹھہرے گا

جو سر خمیدہ ہو گردن اسی کی جائے گی
جو سر اٹھائے وہی حکمران ٹھہرے گا

مَیں چپ رہوں بھی تو الزام آئے گا مجھ پر
وہ سب کہے گا مگر بے زبان ٹھہرے گا

نشانہ ایک ہے، اور ساتھ ساتھ چلتا ہے
یہی تو رشتۂ تیر و کمان ٹھہرے گا

بلند بانگ کا لہجہ، تھی بات بھی سچّی
ہر ایک لفظ مرا اب اذان ٹھہرے گا

ہمارے دور میں بھی جی کے دیکھیو غالبؔ
زمیں کے سامنے کیا آسمان ٹھہرے گا

ہے مجھ میں بھی کوئی نگہبان جیسا
مَیں اپنے میں رہتا ہوں میزان جیسا

ہمیشہ ہی اک پھول کھلتا رہے گا
مری شاخِ دل پر بھی ایمان جیسا

تہِ خاک ہونا ہے گلزار ہونا
بظاہر یہ سودا ہے نقصان جیسا

کسی اژدہے کا نہ سایہ ہو اس پر
ہرا پیڑ ہو کر ہے ویران جیسا

بہر حال ہم زندگی جی کے دیکھے
یہ مضموں نہیں اپنے عنوان جیسا

سُنا اَن سُنا کر دیا ہے سبھی نے
میں لوگوں میں ہوتا ہوں اعلان جیسا

میں کیا قتل کرتا کہ جاویدؔ اس میں
کوئی چھپ کے بیٹھا تھا انسان جیسا

اپنی دانشوری سے ڈرتا ہوں
جاہلوں کو سلام کرتا ہوں

کیسا ناداں ہوں زندگی میں بھی
تیری چاہت میں روز مرتا ہوں

اس میں پستی بھی ساتھ دیتی ہے
جب بلندی سے میں اُترتا ہوں

جانے کس وقت موت آجائے
بس یہی سوچ کر سنورتا ہوں

مجھ کو محسوس کر، کہ مَیں تجھ سے
خوشبوؤں کی طرح گذرتا ہوں

آسماں تک یہیں سے رستہ ہے
دل کی گہرائی میں اُترتا ہوں

جب یقیں ہو چکا کہ ہُوں جاوید
اپنے ہونے سے اب مکرتا ہوں

در پہ آئیں بھی ترے ہم تو وہ زنجیر کہاں
تیرا انصاف کہاں عدلِ جہانگیر کہاں

شاہِ عالم تو کنیزوں پہ نظر رکھتے ہیں
ہم کو وہ یاد کریں اپنی یہ تقدیر کہاں

دل یہ کہتا ہے کہ اک دن وہ نمایاں ہوگا
لوگ کہتے ہیں کہ اس دور میں شبیرؑ کہاں

اپنی آنکھیں ہی منافق ہوں تو منظر کیسے
خواب بِک جائیں تو پھر خوابوں کی تعبیر کہاں

اب تو سونے کے پیالوں ہی میں خیرات ملے
ہم فقیروں کی ہو اس دور میں توقیر کہاں

ہم نے آیاتِ غمِ عشق سنائیں رو کر
خشک آنکھوں سے بیاں ہوتی بھی تفسیر کہاں

وقت کے ساتھ مکانوں کے بھی نقشے بدلے
گھر میں جاوید پُرانی کوئی تصویر کہاں

ڈاکٹر ایم۔آئی۔ساجدؔ

ڈاکٹر اسمٰعیل شاہ ابن عثمان شاہ، کھامگاؤں (بلڈانہ)
تاریخِ پیدائش : ۱۱ر اکتوبر ۱۹۳۶ء وفات : ۱۹۱۴ء
تعلیم : ایم۔اے (اردو، فارسی) پی۔ایچ۔ڈی
سبکدوش لکچرر نورتن مراٹھا کالج، یاول (جلگاؤں)
"اوراقِ گل" "انحراف" (شعری مجموعے) بچوں کے لیے ۳ مطبوعات، ودربھ میں اردو شاعری (تحقیقی مقالہ)

گلیوں میں مری گاؤں کا ڈر بول رہا ہے
لگتا ہے سیاست کا اثر بول رہا ہے

چھالے ہیں مرے پاؤں میں پُرخار ہے رستہ
آساں نہیں منزل، یہ سفر بول رہا ہے

تنہائیاں رکھتی نہ کہیں کا ہمیں لوگو!
بچوں کے چہکنے سے یہ گھر بول رہا ہے

سازش کے سبب آگ لگائی گئی ہر سو
بستی میں اُجالوں کا سفر بول رہا ہے

ایسے بھی کیا جاتا ہے سچائی کو ظاہر
نیزے پہ لٹکتا ہُوا سر بول رہا ہے

کل تک جو ریاکاروں کے چنگل میں پھنسا تھا
اب میری حمایت میں نگر بول رہا ہے

ہو تاج محل یا کہ اجنتا کی گپھائیں
فنکار کے ہاتھوں کا ہنر بول رہا ہے

دشمن ہے وہ راون کی طرح وار کرے گا
ہر سمت فسادات کا ڈر بول رہا ہے

اک تم ہی نہیں بولنے والے یہاں ساجدؔ
کہنے دو اُسے وہ بھی اگر بول رہا ہے

سوزِ شعورِ عشق عطا ہو تو بات کر
تیرے بھی دل میں خوفِ خدا ہو تو بات کر

خوشبو کی طرح مجھ سے جدا ہو نہ اس طرح
سرزد جو مجھ سے کوئی خطا ہو تو بات کر

پھر تو سمجھ سکے گا محبت ہے کیا بلا
تیرے بھی دل میں درد اُٹھا ہو تو بات کر

میں نے سہی ہیں اپنے پرائے کی تلخیاں
شیشہ انا کا ٹوٹ گیا ہو تو بات کر

تپتے لبوں پہ ایک تبسم سا کھِل اُٹھے
لہجے میں تیرے ایسی صدا ہو تو بات کر

شیشے مرے مکان کے سب چُور ہو گئے
پتھر ترے بھی گھر میں گرا ہو تو بات کر

ساجدؔ جو سب کے دل میں اُتر جائے تیر سا
تو نے بھی ایسا شعر کہا ہو تو بات کر

اندھیارے آنکھ آنکھ میں پہنا گئی ہے شام ۔۔۔ اک چادرِ سیاہ کو پھیلا گئی ہے شام

راہوں میں کھو گئی ہیں محبت کی دیویاں ۔۔۔ جیسے ہر ایک موڑ پہ بہکا گئی ہے شام

مغرب کی سمت جب کبھی سورج اُتر گیا ۔۔۔ گھر میں دیا جلانے چلی آ گئی ہے شام

سمتوں میں بٹ گئے ہیں اُجالوں کے ہمنوا ۔۔۔ بے سمت دیکھ کر مجھے صحرا گئی ہے شام

جس سمت دیکھتا ہوں شعاعوں کے زخم ہیں ۔۔۔ کس کی نگاہِ ناز سے ٹکرا گئی ہے شام

اپنے وجود سے میں بچھڑ کر بھٹک گیا ۔۔۔ تنہائیوں کے زخم سے مہکا گئی ہے شام

شہروں کے آسماں پہ پرندوں کا شور ہے ۔۔۔ منظر کوئی حسین سا دِکھلا گئی ہے شام

برسوں سے چل رہی تھی یہ موسم کے ساتھ ساتھ ۔۔۔ میری گلی میں آن کے سُستا گئی ہے شام

ساجدؔ اُٹھو یہاں سے کہ موسم اُداس ہے ۔۔۔ سورج بچھڑ گیا ہے چلو آ گئی ہے شام

یہاں غموں کی ہے بہتات اور خوشی کم ہے ۔۔۔ چلے بھی آؤ کہ اپنی بھی زندگی کم ہے

ذرا سی دیر ٹھہر جاؤ جگنوؤ! آ کر ۔۔۔ ہمارے گھر میں چراغوں کی روشنی کم ہے

نکل چکے ہو جو گھر سے کہیں ٹھہر جاؤ ۔۔۔ ہمارے شہر میں امن و اماں ابھی کم ہے

تمہارے آنے سے پھیلے گی خوشبوئیں ہر سو ۔۔۔ چلے بھی آؤ گلابوں میں دلکشی کم ہے

وہ نفرتوں کا کھلاڑی ہے اُس کے چہرے پر ۔۔۔ فریب چھایا ہے شدت سے سادگی کم ہے

تمہارے ہونٹ بھی خالی ہیں مسکراہٹ سے ۔۔۔ ہمارے سوکھے لبوں پہ بھی اب خوشی کم ہے

ضمیر بیچ کے کرتے ہیں عیش یہ ہر دم ۔۔۔ ہمارے دَور کے لوگوں میں اب خودی کم ہے

کبھی کو اپنے ہی حالات نے بدل ڈالا ۔۔۔ ملا تو کرتے ہیں آپس میں دوستی کم ہے

سکھا دیا ہے زمانے نے یہ ہنر ساجدؔ ۔۔۔ ہمارے لہجے میں پہلے سے بے رُخی کم ہے

ڈاکٹر سیّد صفدرؔ

سیّد صفدر ابن سیّد اصغر ، اچل پور سن پیدائش : ۱۹۳۶ء

تعلیم : ایم ۔ اے (اردو) بی ۔ ایڈ ، پی ۔ ایچ ۔ ڈی ملازمت : موظف مدرّس

"قلقلِ آبِ وضو" "لفظوں پہ رم" (غزلیات، منظومات) "شاعری و شیوۂ پیغمبری"

"بے آمیز" (تنقید)

قرینوں سے ہماری دوستی ہے
حسینوں سے ہماری دوستی ہے

نڈر ہو کر لکیریں بولتی ہیں
جبینوں سے ہماری دوستی ہے

بہت سادہ بہت پُرکار لیکن
نگینوں سے ہماری دوستی ہے

ہلائے یا ہلائے ہاتھ اور بس
مشینوں سے ہماری دوستی ہے

عوض سگریٹ کے سگریٹ، چائے کے چائے
مہینوں سے ہماری دوستی ہے

ہمارے گھر جھجکتے ہیں یہ کہتے
مکینوں سے ہماری دوستی ہے

میرے موتی ہیں خذف ، خاک ہے میرا سونا
میری تحریر کو آیا نہ قصیدہ ہونا

کب تلک سانپ کے پہرے کا تماشا اے دل
میرا گھر ہے مرے اجداد کا چاندی سونا

آخری داؤ لگانے کی گھڑی آ پہنچی
بس بہت کھیل چکے ، کھیل میں پانا کھونا

مَیں خداؤں کی صفوں کے ہوں مقابل تنہا
دیکھ لے میرے خدا ، یہ مرا بندہ ہونا

ایسی اک چیخ جو زندہ ہیں کھڑے ہو جائیں
سونے والوں کو تو ہے حشر کے دن تک سونا

اشک دریا سے یہ سیراب ہے پھر بھی خالی
میرے مالک مری مٹی میں تحمل بونا

ہَوا کے بدن سے اُلجھتی ہو جوالا　کھلے کوئی منظر بنے کچھ اُجالا
اندھیرے کے رتھ سے وہ لے گا نشانہ　مرے سر کے پیچھے بنا چاند ہالا
مگر بھوک کے بال و پر آ گئے ہیں　جہاں دانے دیکھے وہاں ہوگا جالا
ابھی پیش منظر میں ہے آگ بَن کی　نہ طاؤس دیکھا نہ ہم نے غزالہ
سرکتی ہیں تصویریں کچھ مسئلوں کی　زباں پھیلتی ہے لڑھکتی ہے مالا
نہ روشن ضمیروں کے پیش آئیں بونے　کہ ہم کھینچ لیتے ہیں سر سے ہمالہ
گلابوں کی کرتا رہا آبیاری　ہتھیلی پہ میری اُگا زرد چھالا

نرمیاں ہیں تمھاری بولی میں　اور پتھر پڑے ہیں جھولی میں
سج گئی میری سوچ کی دھرتی　رنگ اُس نے بھرے رنگولی میں
یوں ہُوا پھر پگھل گیا منظر　صبح سورج اُگا جو کھولی میں
دھرم جاتی سے آپ کی پہچان　آدمی ہے ہماری ٹولی میں
میرے دامن کے داغ دیکھے کون　سب یہاں ہیں نہائے ہولی میں
چار جانب اُجالا پھیلا ہے　چاند چمکا کسی کی چولی میں
بوریئے بچھ گئے محبت سے　آپ آئے ہماری کھولی میں

صمد رضاؔ

□ عبدالصمد رضاؔ ابن عبدالکریم، امراوتی — موبائیل : 8275557031
درجۂ ثانیہ — تاریخ پیدائش : ۱۱ اپریل ۱۹۴۷ء

خراشیں اور شکن آلود چہرہ بول سکتا ہے
سمجھنے والا کوئی ہو تو گونگا بول سکتا ہے
ہم اپنے سے بہت چھوٹے کو بھی چھوٹا نہیں کہتے
زباں اُس کی ہے وہ دریا کو قطرہ بول سکتا ہے
عطائے رب الگ شئے ہے، یہ بندوں کا دیا ہے کیا؟
سکھاؤ جتنا طوطے کو بس اُتنا بول سکتا ہے
شرافت خون میں ہوتی ہے، لہجے میں نہیں ہوتی
بُرا انساں کسی کو کیسے اچھا بول سکتا ہے
یہاں چلتے ہیں سارے کام نظروں کے اشارے پر
یہ بزمِ ناز ہے اس میں کوئی کیا بول سکتا ہے
رضاؔ جس کو ابھی رکھتے ہو تم جاں سے عزیز اپنا
عداوت میں ذرا دیکھو وہ کیا کیا بول سکتا ہے

حرفِ حق میری زباں سے جو نکل پڑتا ہے
سامنے والے کی پیشانی پہ بل پڑتا ہے
ان دنوں دل کا عجب حال ہُوا ہے ہمدم
بات بے بات پہ کم بخت اُچھل پڑتا ہے
وعدۂ وصل ہے پرسوں کا مگر یاد رہے
درمیاں اپنی ملاقات کے کل پڑتا ہے
چاند پر جاؤ کہ مریخ پہ پہنچو لیکن
اُس سے آگے کی نہ سوچو کہ زُحل پڑتا ہے
بددعا لاکھ کرو تم مرے حق میں لوگو!
میرے کاموں میں کہاں اس سے خلل پڑتا ہے
تم سے تنہائی میں ملنے کی تمنا ہے مگر
میرے ہمراہ میرا سایہ بھی چل پڑتا ہے
تم بڑے ہو تو رضاؔ ظرف سمندر سا رکھو
کیوں کہ تالاب تو بارش میں اُبل پڑتا ہے

رنگ لائے گی میری وفا دیکھنا
مٹ ہی جائے گا ہر فاصلہ دیکھنا

دعوتِ دید دیتے ہیں منظر کئی
سامنے تم اگر ہو تو کیا دیکھنا

میرا ملنا کوئی مسئلہ بھی نہیں
شرط ہے کر کے کوشش ذرا دیکھنا

جا رہے تو ہو تم گاؤں کو چھوڑ کر
شہر کی پہلے آب و ہوا دیکھنا

ہر جگہ مجھ کو پاؤ گے اپنے قریب
تم کہیں سے بھی دیکر صدا دیکھنا

میری خواہش یہی میرا ارماں یہی
ہر گھڑی تم کو ہنستا ہوا دیکھنا

اُس کے پتے رضاؔ زرد ہونے لگے
مَیں نے چاہا تھا جس کو ہرا دیکھنا

طلبگارانِ تخت و تاج ، ذی جاہ و حشم نکلے
ہوس کے بندے سب منت کشِ دیر و حرم نکلے

شہادت مل گئی یا فتح و نصرت پا کے لوٹے ہیں
جہادِ فی سبیل اللہ میں جب بھی قدم نکلے

بساطِ جنگ اُلٹ کر رہ گئی تاریخ شاہد ہے
عمامے باندھ کر اپنے سروں سے جب بھی ہم نکلے

کبھی تشنہ لبی کی بات ہونٹوں تک نہ آنے دی
تمھاری بزمِ رنگیں کا سدا رکھ کر بھرم نکلے

نہ جانے کس نے درد و غم کو یہ رستہ بتایا تھا
یہ مہماں گھر سے جب نکلے تو لیکے میرا دم نکلے

وہ کیوں شانوں پہ یوں زلفِ پریشاں کو جھٹکتے ہیں
جگر کے زخم شاید اُن کے اندازے سے کم نکلے

رضاؔ چلئے کہ توہینِ طلب سے بچ گئے ہم بھی
توقع جن سے تھی وہ خود ہی محتاجِ کرم نکلے

سیّد نیاز علی نیازؔ

سیّد نیاز علی نیازؔ ابن سیّد امام، بالاپور (اکولہ) تاریخ پیدائش : ۳؍اپریل ۱۹۴۲ء

درس وتدریس، ملازمت سے رضا کارانہ سبکدوش ۲۰۰۲ء

ہم وطن تھا ، آشنا تھا ، رات دن ملتا تھا وہ
اُس میں کچھ تھی ایسی باتیں اجنبی لگتا تھا وہ
لب تبسم ریز ، آنکھوں میں نمی ، دل داغ داغ
باتوں باتوں میں کسی دن ، گر کبھی کھلتا تھا وہ
معترف ہیں محفلیں ، وہ محفلوں کی جان تھا
لوگ کیا جانیں کہاں ، کس حال میں رہتا تھا وہ
آج اس کی خیریت بھی پوچھتا کوئی نہیں
سُو طرف سے ہاتھ اُٹھتے ، راہ جب چلتا تھا وہ
شخصیت میں تھی نیازؔ اس کی عجب سی اک کشش
منہ سے اُس کے پھول جھڑتے ، بات جب کرتا تھا وہ

شاخ سے پھول جُدا کرتے ہو، کیا کرتے ہو
پھر بہاروں کی دعا کرتے ہو، کیا کرتے ہو
جب یہ معلوم ہے ہر وقت دغا دیتے ہیں
ایسے لوگوں سے وفا کرتے ہو، کیا کرتے ہو
یہ جو تلوار ہے ، مظلوم کو بخشی جاتی
تم تو ظالم کو عطا کرتے ہو، کیا کرتے ہو
اس طرح بات کا مفہوم بدل جائے گا
لفظ سے لفظ جُدا کرتے ہو، کیا کرتے ہو
شخصیت جتنی ہے اُتنا ہی نظر آئے گا
قد سے آئینہ بڑا کرتے ہو، کیا کرتے ہو

ہم پہ وہ گردشِ حالات نہیں ہے پھر بھی
تم تو ملتے ہو، ملاقات نہیں ہے پھر بھی

آج بھی رکھتا ہے مدہوش وفاؤں کا خیال
حالانکہ شدتِ جذبات، نہیں ہے پھر بھی

ایک مدت سے سنا ہے کہ زمانہ ہے خلاف
غم کی روداد مری بات نہیں ہے پھر بھی

شام سے میں بھی جلا رکھتا ہوں خوابوں کے چراغ
میرے حصے میں کوئی رات نہیں ہے پھر بھی

وہ مرے ساتھ ہواؤں کی طرح رہتا ہے
ساتھ ہو کر بھی مرے ساتھ نہیں ہے پھر بھی

دل میں آتا ہے کہ ہر حال میں واپس کردوں
نذرِ احباب ہے، خیرات نہیں ہے پھر بھی

پھول تو پھول ہیں، کانٹوں پہ نظر ہے میری — ایک مدت سے بہاروں پہ نظر ہے میری
عکس در عکس نظاروں پہ نظر ہے میری — ڈوبتے چاند ستاروں پہ نظر ہے میری
دیکھنا یہ تھا مجھے کون سہارا دے گا — تم نے سمجھا کہ سہاروں پہ نظر ہے میری
کیا بھروسہ ہے چراغوں کا جلیں یا نہ جلیں — جھلملاتے ہوئے تاروں پہ نظر ہے میری
سر پھری تیز ہواؤں کا مجھے کیا ڈر ہے — بادباں تیرے اشاروں پہ نظر ہے میری
برگ و گل شاخ و ثمر ہو گئے محفوظ نیازؔ — باغ میں جب سے شراروں پہ نظر ہے میری

رضوان ناظم

رضوان اللہ ناظم ابن امیر اللہ انجم، اچل پور

بی۔اے۔ڈی۔ایڈ

تاریخ پیدائش : یکم جولائی ۱۹۴۷ء

وظیفہ یاب صدر مدرّس

پیار میں پہلے پہل ، پہلی غزل کیسی لگی
آپ کی تعریف میں لکھی غزل کیسی لگی

آپ نے کتنی پڑھی ، کتنی سُنی ہے شاعری
آپ کو میری قسم ، میری غزل کیسی لگی

میں نے دیکھا آپ کو اور لکھ دیا "جانِ غزل"
دشمنوں نے داد دی اچھی غزل کیسی لگی

چودھویں کا چاند کہتا ہے زمانہ آپ کو
چاندنی میں نے کہا میری غزل کیسی لگی

آپ سے دل کو لگانے کا ملا ہے یہ صلہ
مل گئی شہرت مجھے پیاری غزل کیسی لگی

آپ تو محفل میں آ کر مسکرا کر چل دیئے
آپ کو معلوم ہے میری غزل کیسی لگی

میں نے ناظم عاشقی میں جاں لٹائی ، دل دیا
کیا پتہ معشوق کو ایسی غزل کیسی لگی

تم سے مل کر خوشی سی لگتی ہے
زندگی زندگی سی لگتی ہے

تم جو آئے ہو آج گھر میرے
ہر طرف چاندنی سی لگتی ہے

کیسے کہہ دوں کہ تم سے پیار نہیں
شہر میں کھلبلی سی لگتی ہے

پاس سے جب بھی تم گذرتی ہو
ایک خوشبو بھلی سی لگتی ہے

اپنے آنچل کو ٹھیک کر لیجے
یہ ہوا منچلی سی لگتی ہے

یہ تمہاری نظر کا ہے جادو
ہر نظر میکشی سی لگتی ہے

تم سراپا غزل ہو ناظم کی
ہر ادا شاعری سی لگتی ہے

ہمارے پیار کا ہم کو صلہ نہیں ملتا
وفا کریں تو کوئی با وفا نہیں ملتا

ہر اک مقام پہ مطلب پرست ملتے ہیں
کوئی رفیق کوئی رہنما نہیں ملتا

کسی کے سامنے دستِ طلب سے کیا حاصل
خدا سے مانگ کے دیکھو تو کیا نہیں ملتا

وفا ، خلوص ، کتابوں میں رہ گئے باقی
جہاں میں دیکھئے اِن کا پتہ نہیں ملتا

یہ مال و زر سے تو دنیا خرید سکتے ہیں
سکونِ قلب و جگر مول کا نہیں ملتا

غریب لوگوں کی بستی جلائی جاتی ہے
بجھانے والا کوئی دیوتا نہیں ملتا

غرض کے واسطے ناظم ہزار ملتے ہیں
کوئی حبیب ، کوئی آشنا نہیں ملتا

مرے دوستوں کو شاید مرا کچھ پتہ نہیں ہے
کئی دن ہوئے کسی نے مجھے خط لکھا نہیں ہے

کوئی بدگماں ہے مجھ سے تو مرا قصور کیا ہے
مرا دل کسی کے حق میں بخدا برا نہیں ہے

ترے دل میں بات کیا ہے، یہ خدا ہی جانتا ہے
مرے دل میں تجھ سے بہتر کوئی دوسرا نہیں ہے

کبھی مسجدوں میں بیٹھا، کبھی میکدوں سے گذرا
تری انجمن سے اُٹھ کر کہیں دل لگا نہیں ہے

نہ کوئی غزل ہوئی ہے نہ تو گیت ہی لکھا ہے
کئی دن گذر گئے ہیں ترا سامنا نہیں ہے

یہ خلوص ، یہ نوازش ، یہ کرم ہے دوستوں کا
مرے شہر میں ہی مجھ کو، کوئی جانتا نہیں ہے

وہی آئینہ ہے ناظم جسے دیکھتی تھی دنیا
ذرا گرد آگئی تو کوئی دیکھتا نہیں ہے

محمد افسر رونقؔ

محمد افسر خاں ابن محبوب خاں رونقؔ، اکولہ — موبائیل : 9373679555
تاریخ پیدائش : یکم جولائی ۱۹۴۷ء
ایچ۔ایس۔ایس۔سی۔ڈی۔ایڈ — موظف صدر مدرس میونسپل کارپوریشن، اکولہ

اک جرمِ محبت کی کیا اور سزا ہوگی — تنہائی کے غم ہوگے مرنے کی دعا ہوگی
جب حسن کے ہاتھوں سے تکمیلِ وفا ہوگی — وہ صبح بھی کیا ہوگی وہ شام بھی کیا ہوگی
جائے تو کہاں جائے اب چھوڑ کے رسوائی — اس کی بھی گذر کیسے اب میرے سوا ہوگی
اک جشنِ مسرت میں کچھ ڈوبتی آوازیں — ٹوٹے ہوئے شیشوں کی پُر درد صدا ہوگی
ہر عکس گرفتارِ آئینہ ہے اے افسرؔ — پرچھائیں بھی انساں کی آئینہ نما ہوگی

کب وہ کسی حسین سے کم تر دکھائی دے — مجھ کو نہ اُس کا کوئی بھی ہمسر دکھائی دے
ہے بیوفا کوئی تو کوئی خوگرِ ستم — مہر و وفا کا کوئی تو پیکر دکھائی دے
کیا پُرسکوں نظام تھا کل تیری بزم کا — ہر سمت آج اک نیا محشر دکھائی دے
اُس کے ہزار رنگ ہیں اُس کے ہزار روپ — قاتل دکھائی دے کبھی دلبر دکھائی دے
پائی گئی ہے محفلِ شعر و سخن اُداس — رونقؔ سا اب نہ ہم کو سخنور دکھائی دے
کس حال میں ہیں کیسے گذرتے ہیں رات دن — یہ پوچھنا ! جو آپ کو افسرؔ دکھائی دے

تو ادا شناسِ وفا نہیں تو مَیں دل لگا کے کرونگا کیا
تو نہ نغمہ سازِ حیات ہے ترے گیت گا کے کرونگا کیا
اسی رہگذر پہ ملے تھے ہم ، یہیں ساتھ ساتھ چلے تھے ہم
یہیں میری منزلِ شوق ہے ، مَیں یہاں سے جا کے کرونگا کیا
تو ہے ہر نفس مری زندگی ، یہ ہے میرا مسلکِ بندگی
تیری یاد جُزوِ حیات ہے تجھے مَیں بھلا کے کرونگا کیا
وہ فضا ہی جیسے بدل گئی مری حسرتوں کو مَسل گئی
نہ وہ شاخِ گل ہے نہ آشیاں مَیں چمن میں جا کے کرونگا کیا
یہی افسؔر اپنا مقام ہے کہیں سجدہ کرنا حرام ہے
ہے انھیں کا در ہی حرم مجھے ، کہیں سر جھکا کے کرونگا کیا

غم ہے اک بوجھ جسے دل پہ اُٹھائے رکھئے
عظمتِ عشق کی توقیر بڑھائے رکھئے
ٹوٹ کر آنکھ سے مٹّی میں نہ مل جائیں کہیں
اشکِ غم ہیں انھیں دامن پہ سجائے رکھئے
بے رُخی ان کی محبت میں بدل جائے گی
شمعِ اُمید ابھی دل میں جلائے رکھئے
دامنِ ضبط نہ چھٹ جائے کہیں ہاتھوں سے
اشکِ غم کو یونہی پلکوں میں چھپائے رکھئے
اُن کا بخشا ہُوا ہر زخم ہے نعمت افسؔر
ان کے ہر تیر کو سینے سے لگائے رکھئے

جمیل احمد خاں جمیل

جمیل احمد خاں جمیلؔ ابن اسمٰعیل خاں، اکولہ　　تاریخ پیدائش : یکم جولائی ۱۹۴۳ء
ایم۔اے۔ڈی۔ایڈ
موظف صدر مدرّس ضلع پریشد اسکول، کھدان اکولہ

جیسے بھی جس طرح بھی بسر کر رہے ہیں لوگ　　دن پورے زندگی کے مگر کر رہے ہیں لوگ
کچھ بھی نہیں نگاہ جدھر کر رہے ہیں لوگ　　رُسوا فضول ذوقِ نظر کر رہے ہیں لوگ
تاروں کو نقشِ پائے بشر کر رہے ہیں لوگ　　کیا معرکہ حیات کا سر کر رہے ہیں لوگ
شیطانیت عروج پہ ہے بات صاف ہے　　انسانیت کا خون اگر کر رہے ہیں لوگ
محلوں ہی میں بسر نہیں ہوتی یہ زندگی　　فٹ پاتھ پر بھی اپنی بسر کر رہے ہیں لوگ
ایک رب کے در پہ سجدے کی فرصت نہیں جمیلؔ　　سجدے ہزاروں در پہ مگر کر رہے ہیں لوگ

یہ ناتمام فسانہ تمام ہو تو سہی　　ہمارے ساتھ تمہارا بھی نام ہو تو سہی
مرے لئے بھی خوشی کا پیام ہو تو سہی　　اندھیرے گھر میں اُجالے کا نام ہو تو سہی
جہانِ نو کے یہ محمود بھی قدم چومے　　ایاز جیسا کہیں بھی غلام ہو تو سہی
ملے جو ہم سے تو پتھر بھی موم ہو جائے　　کوئی بہانہ برائے کلام ہو تو سہی
سکونِ دل ہو میسر ہمیں کسی صورت　　ہماری ایسی کوئی صبح شام ہو تو سہی
ہمارے لب پہ تمہارا ہی نام کیا معنی　　تمہارے لب پہ ہمارا بھی نام ہو تو سہی
بہت ہی درد میں ڈوبے ہیں رہبرانِ کرم　　کسی کے ہاتھ سہی اپنا کام ہو تو سہی
میں اپنی صبح بھی کردوں نثار اُس پہ جمیلؔ　　کسی کے زُلف کے سائے میں شام ہو تو سہی

کیوں کھٹکتا ہے مرا تیری نظر میں رہنا
گردِ پیروں کی بھی یہ چاہے کہ سر میں رہنا

دلِ پُرشوق مبارک ہو نظر میں رہنا
کس کی تقدیر میں ہے پریم نگر میں رہنا

دلِ برباد میں حسرت بھی نہیں ہے کوئی
کس کو منظور ہے اُجڑے ہوئے گھر میں رہنا

گر کے نظروں سے نہ مل جائے تو مٹی میں کہیں
اشکِ غم تجھ کو قسم دیدۂ تر میں رہنا

مجھ پہ کیا وقت یہ آیا ہے وطن میں لوگو
گھر میں رہتے ہوئے آساں نہیں گھر میں رہنا

عشق گر راس نہ آیا تو کہاں حسنِ جمیلؔ
کیا میسّر ہو حسینوں کے نگر میں رہنا

ہاتھ پھیلانے نہیں دیتی شرافت میری
پوری کردیتا ہے معبود ضرورت میری

میری شہرت سے ہوئے خوش مرے احباب مگر
راس آئی نہ رقیبوں کو یہ شہرت میری

مشکلوں میں بھی رکھو صبر سلامت اپنا
"مجھ سے ہر لمحہ مخاطب رہی غیرت میری"

دار پہ کھینچو یا سولی پہ چڑھا دو مجھ کو
پھر بھی سچ کہنے سے باز آئے نہ فطرت میری

یہ عمل کردے گا رسوائے زمانہ تم کو
دشمنو! کرتے رہو شوق سے غیبت میری

خدمتِ خلق کا شاید یہ ہے انعام جمیلؔ
ہر کوئی کرنے لگا شہر میں عزت میری

ظفر عزیز

عزیز الرحمٰن خاں ظفر ابن رحیم خاں، اچل پور
تاریخ پیدائش : ۱؍جولائی ۱۹۴۳ء
تعلیم : ایس۔ایس۔سی
موبائیل : 09893505607
ٹرانسپورٹ مینیجر

وہ بھی ہو گئے شامل میرے نکتہ چینوں میں
میں نے جن کو پالا تھا اپنی آستینوں میں

آئینے پرکھنے کا تجربہ ہمیں بھی ہے
ایک عمر گذری ہے اپنی مہ جبینوں میں

بارہا محبت کے بیج بو کے دیکھا ہے
نفرتیں ہی اُگتی ہیں آج کل زمینوں میں

کیا بچاتے جاں اپنی ہر طرف ہی قاتل تھے
اور جو محافظ تھے مل گئے کمینوں میں

سامنا تو ہونے دو خود ہی جان جاؤ گے
تم کو ہم نے دیکھا ہے صرف دوربینوں میں

نظریہ بدل جائے ، یا نظر بدل جائے
بال آہی جاتے ہیں دل کے آبگینوں میں

اب کہاں ظفرؔ صاحب حُسن میں سلیقہ ہے
عشق بھی نہیں ملتا اب کہیں قرینوں میں

نئی راہوں پہ چلنا چاہتا ہے
زمانہ پھر بدلنا چاہتا ہے

یہ بادل کیوں پریشاں کر رہے ہیں
اگر سورج نکلنا چاہتا ہے

زمانہ تنگ ہو جاتا ہے اُس پر
وہ جب خود کو بدلنا چاہتا ہے

بھڑکتی ہے غریبی آگ بن کر
خوشی سے کون جلنا چاہتا ہے

گراتے ہیں اسے حالات اس کے
اگر کوئی سنبھلنا چاہتا ہے

ظفرؔ اب شام کی چادر تو اوڑھو
تھکا سورج ہے ڈھلنا چاہتا ہے

لڑکیاں گھر میں نکھر آئی ہیں پھولوں کی طرح
وقت ٹھہرا ہے مگر سوکھی ببولوں کی طرح

دل تو کہتا ہے کہ ہر ہاتھ پہ بیعت کر لیں
لوگ یوں راہ میں ملتے ہیں رسولوں کی طرح

چھت کو تھامے رہو اس شہر میں انسان ابھی
سر اٹھائے ہوئے پھرتے ہیں بگولوں کی طرح

تیری شرطوں پہ مجھے زندگی منظور نہیں
میں نے چاہا ہے تجھے اپنے اصولوں کی طرح

دیکھ لینا بری تصویر کو حسرت سے سہی
یاد آؤں جو کبھی میں تجھے بھولوں کی طرح

کل کی تاریخ تمھیں ایسی سزا دے گی ظفرؔ
گھر میں لٹکا دیئے جاؤ گے مقولوں کی طرح

جوش ہر موج میں اُچھال کا تھا
حوصلہ ہم میں بھی کمال کا تھا

لوگ کیوں اپنی سمت بھول گئے
سوئی کا رُخ اگر شمال کا تھا

ہوگئے میرے راستے روشن
یہ اُجالا ترے جمال کا تھا

میں نے بھی اپنے پھن نکال لئے
اُس کا انداز اشتعال کا تھا

مسجدوں میں دعائیں ٹھہر گئیں
وقت شاید ابھی زوال کا تھا

نامِ محبوبؐ پر ہی جاں دے دی
عشق تو حضرتِ بلالؓ کا تھا

ہم بھی رکھتے تھے سر پہ تاجِ ظفرؔ
جب کرم ربِّ ذوالجلال کا تھا

جمیل احمد رازؔ

جمیل احمد رازؔ، بالاپور (اکولہ) میٹریکیولیشن
تاریخِ پیدائش : ۱؍اکتوبر ۱۹۴۲ء وفات : ۲۹؍دسمبر ۲۰۰۲ء
سپرنٹنڈنٹ نگر پریشد، بالاپور

کب ملا کوئی رہبر ترے گاؤں میں
خوب بھٹکے ہیں در در ترے گاؤں میں

ظلم سہہ کر بھی تیری تمنا کرے
ہے کوئی ہم سا دلبر ترے گاؤں میں

آدمی ! اور حیوان کے روپ میں
یہ بھی دیکھا ہے منظر ترے گاؤں میں

یہ ہمارا ہی دل ہے کہ ہنستا رہا
چوٹ پر چوٹ کھا کر ترے گاؤں میں

کون دُکھڑا سُنے کون کھائے ترس
دل سبھی کا ہے پتھر ترے گاؤں میں

کوئی دل کو بچا کر چلے کس طرح
ہر قدم پر ستمگر ترے گاؤں میں

رازؔ اپنے سُخن پر تو نازاں نہ ہو
اور بھی ہیں سُخن ور ترے گاؤں میں

میخانے میں ہم نے یہ کردار بنایا ہے
خود پیاس سے تڑپے ہیں اوروں کو پلایا ہے

خاموش نہیں بیٹھے کچھ کر کے دکھایا ہے
جب برق گری ہم نے گلشن کو بچایا ہے

اس دور کے لوگوں کا انصاف ذرا دیکھو
مظلوم کو پکڑا ہے ظالم کو بچایا ہے

کیا ہم کو زمانہ یہ تہذیب سکھائے گا
خود ہم نے زمانے کو قانون سکھایا ہے

اے رازؔ بہت ڈریئے، بچ بچ کے ذرا چلیے
دنیا نے بہت اونچا لیجا کے گرایا ہے

ہر بشر بے وفا نہیں ہوتا
ہر ثمر بے مزا نہیں ہوتا

راہزن اپنا کام کرتے ہیں
"جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا"

ایسی بنیاد رکھ رہے ہو کیوں
جس میں سب کا بھلا نہیں ہوتا

ہر کسی سے ملے جو خوش ہو کر
اُس پہ کوئی خفا نہیں ہوتا

اپنے کردار پر نظر رکھیئے
کوئی چھوٹا ، بڑا نہیں ہوتا

عزم محکم نہیں تو کچھ بھی نہیں
آپ چاہیں تو کیا نہیں ہوتا

موت کیا ہے، بس ایک پردہ ہے
آدمی کچھ فنا نہیں ہوتا

رازؔ طوفان ہے دعا کیجے
ناخدا کچھ خدا نہیں ہوتا

کیا جرم ہمارا ہے بتا کیوں نہیں دیتے
اس آپسی جھگڑے کو مٹا کیوں نہیں دیتے

پیمانے میں کچھ زہر ملا کیوں نہیں دیتے
بیزار ہیں ہم سے تو پلا کیوں نہیں دیتے

نفرت بھرے انداز میں کیوں یاد ہماری
ہم اتنے برے ہیں تو بھلا کیوں نہیں دیتے

اتنا ہی کھٹکتا ہے تو کیا سوچ رہے ہو
یہ میرا نشیمن ہے جلا کیوں نہیں دیتے

فتنوں کو اُبھرتے ہوئے کیوں دیکھ رہے ہو
اِن آگ کے شعلوں کو بجھا کیوں نہیں دیتے

دو چار تو محفل میں طرفدار ملیں گے
اے رازؔ کھری بات سنا کیوں نہیں دیتے

عنایت اللہ خان سوزؔ

عنایت اللہ خاں سوزؔ ابن عصمت اللہ خاں، ایوت محل
موبائیل : 09422167383
ایم۔اے۔(اردو، تاریخ) ڈی۔ایڈ
تاریخ پیدائش : ۵ر دسمبر ۱۹۴۲ء
موظف مدرس نگر پریشد اردو ہائی اسکول عمر کھیڑ، ایوت محل

اپنی نظیر آپ رہے ہم جہاں رہے
زور آزما اگرچہ زمان و مکاں رہے

رستے ہمارے پاؤں سے لپٹے رہے سدا
ہم تیری جستجو ہی میں اے مہرباں رہے

جس کو ترے حضور میں ملتی نہ ہو جگہ
وہ کس کے دَر پہ جائے وہ آخر کہاں رہے

تو اے بہار ہم کو مٹانے پہ تل گئی
ہم تو تمام عمر ترے رازداں رہے

اُس وقت جب کہ لوگ مسرت نواز تھے
"ہم ہی غمِ حبیب ترے پاسباں رہے"

وہ پیکرِ خلوص ہے وہ آرزوئے دل
اے سوزؔ اُس کا نام ہی وردِ زباں رہے

وفا کی لاج ہوں مَیں پیار کا سمندر ہوں
یہ تجھ سے کس نے کہا راستے کا پتھر ہوں

دِلوں پہ جن کے شجاعت کا نقش ہے میری
وہ اعتراف کریں گے کہ مَیں سکندر ہوں

بہار ڈھونڈتی پھرتی ہے جس کو عالم میں
اہالیانِ چمن میں وہی تو منظر ہوں

پڑا ہُوا ہوں ابھی پتھروں کے بیچ مگر
مجھے بھی دیکھ زمانے کہ مَیں بھی گوہر ہوں

وہ آج ڈھونڈ رہا ہے اِدھر اُدھر مجھ کو
اُسے خبر ہی نہیں مَیں زمیں کے اندر ہوں

یہ غم تو سوزؔ کا دامن پکڑ، کے کہتا ہے
تو مجھ سے دور نہ جائیں ترا مقدر ہوں

میں ایک اکیلا ہوں لیکن ظالم کا زمانہ ساتھی ہے
وہ ظلم کرے میں ظلم سہوں یہ رسم ابھی تک باقی ہے
جب خونِ جگر جم جاتا ہے دامن پہ اندھیروں کے جاکر
تب رات کے پردے جلتے ہیں تب جاکے سحر ہو پاتی ہے
ساون ہو کہ پت جھڑ ہو یارو کچھ فرق نہیں ہے اپنے لیے
ہر رُت جو بدل کر آتی ہے وہ غم کے تحائف لاتی ہے
دنیا میں ہمیں اکثر یارب اپنی یہ حیاتِ فانی ہی
دوزخ کے بھیانک منظر بھی لا لا کے یہاں دِکھلاتی ہے
وہ کھلتے رہیں کلیوں کی طرح وہ ہنستے رہیں پھولوں کی طرح
اے سوزؔ ہمیں جینے کے لیے یہ زخمِ جگر ہی کافی ہے

لاکھ دیا خوشیوں نے پہرا
دُکھوں کا سیلاب نہ ٹھہرا
اُس کی تہہ کو کیسے پاؤں
جتنا اُتروں اُتنا گہرا
ڈھونڈ رہا ہے درپن اب بھی
تیرا چہرہ میرا چہرہ
بن پانی کا بادل دیکھو
سوکھی دھرتی پر جا ٹھہرا
میں جب تجھ کو ہاتھ دکھاؤں
آنچل اپنا تو بھی لہرا
سوزؔ کیسے پہچانیں آخر
جس کو دیکھو وہ بے چہرہ

دلنواز خاں دلنوازؔ

دلنواز خاں دلنوازؔ ابن ابراہیم خاں خلیل، ملکاپور (بلڈانہ)

درس وتدریس

یہ کیسے درد نے قصہ کا اختتام کیا
مجھے مٹانے کا ایک ذوق ناتمام کیا

وہ سبزہ سوکھا وہ پیڑوں سے گر پڑے پتے
ہماری موت کا کس کس نے احترام کیا

اُٹھا جنازہ تو آنسو بہا کے بادل نے
وضو کا کتنا یہ بروقت انتظام کیا

بہشت اور جہنم کے درمیاں رکھتا
مرے گناہوں نے اتنا تو ایک کام کیا

ہے دلنوازؔ یہ دنیا کا ایک کھیل نیا
کسی نے لوٹا ہمیں اور کسی کا نام کیا

اب ترے غم کے اندھیروں میں اُتر جاؤں گا
خود ہی بن کے میں وہاں شمس وقمر جاؤں گا

اک نظر پیار سے دیکھو تو نوازش ہوگی
پھر نہ آؤں گا کبھی ایسے نگر جاؤں گا

پھر سے بے ساختہ ہچکی جو مجھے آئے گی
نام تیرا ہی سدا لوں گا جدھر جاؤں گا

مل گئی تیرے خیالوں سے تجلی دل کو
تلخ راہوں پہ بھی بیخوف وخطر جاؤں گا

ہر ڈگر ٹیڑھی ہے ترچھی ہے زمانہ بے دل
ضد ہے مجھ کو کہ تجھے ڈھونڈ کے گھر جاؤں گا

میری ہستی نہیں اخبار کہ ہر کوئی پڑھے
میں رسالہ ہوں سرِ اہلِ نظر جاؤں گا

دلنوازؔ آج تلک کیوں مجھے منزل نہ ملی
کیا یوں ہی عمر کی راہوں سے گذر جاؤں گا

اشک آنکھوں سے ڈھلتے دیکھا ہے
زندگی کو مچلتے دیکھا ہے
گردشِ وقت کب رُکی، لیکن
اُس کو پہلو بدلتے دیکھا ہے
دَم پہ ان کے کرم کی یورش میں
کس نے دَم کو نکلتے دیکھا ہے
آس کی جوت دل کی گرمی میں
سارے احساس پلتے دیکھا ہے
جن کو دنیا کی ہر خوشی ہے ملی
ہاتھ اُن کو بھی مَلتے دیکھا ہے
بند آنکھوں میں تیرا حُسنِ خیال
تجھ کو ہر سمت چلتے دیکھا ہے
دلنوازؔ آتشِ طلب ہی تو تھی
جس میں تم کو بھی جلتے دیکھا ہے

گرائیں دل کے نشیمن پہ بجلیاں اُس نے
اُمید و پیار کی بھڑکا دیں بستیاں اُس نے
مرے خلوص سے پائیں یہ شوخیاں اُس نے
خوشی کے پاؤں کو دیں غم کی بیڑیاں اُس نے
غمِ حیات کی دیکھی نہ جھلکیاں اُس نے
سہم سہم کے بظاہر لیں سسکیاں اُس نے
سُنی بغور جونہی دل پہ بیتیاں اُس نے
اُٹھائی میرے ارادوں کی ارتھیاں اُس نے
مرے وقار کا پیدا یہاں سوال ہُوا
مری طرف جو اُٹھائی ہیں انگلیاں اُس نے
اُڑا کے بند جو کی دستِ ناز سے کھڑکی
بنائیں ایسے مرے خط کی تتلیاں اُس نے
وفا کے بعد بھی اے دلنوازؔ حیرت ہے
اُڑا دیں رہ کے مرے دل کی دھجیاں اُس نے

ڈاکٹر سرفراز خان وقارؔ

ڈاکٹر سرفراز خاں وقارؔ ابن ابراہیم خاں خلیل، ملکا پور (بلڈانہ)

تاریخِ پیدائش : ۱۰ر دسمبر ۱۹۴۷ء ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی (اردو عالم حیدرآباد)

"پاسبانِ ادب" (تحقیق) "گلدستۂ اطفال" "میٹھے گیت" "بازیچۂ اطفال (منظوماتِ اطفال)

اے مری جانِ غزل تُو ہے ارمانِ غزل
یہ ترے حُسنِ ادا بالیقیں شانِ غزل
یہ ترا عکسِ حسیں قصر و ایوانِ غزل
زُلف ہے کالی گھٹا یا ہے زندانِ غزل
چاند سا روپ ترا حُسنِ تابانِ غزل
پھول سا تیرا بدن لطفِ عنوانِ غزل
ہیں ترے فن پہ وقارؔ حبِّ یارانِ غزل

مثلِ رُخسارِ صنم رنگِ حنا ہاتھ میں طرفہ ستم رنگِ حنا
خون کے آنسو رُلائے زندگی سُرخ موسم درد و غم رنگِ حنا
پتھروں کے بیچ پس جانا پڑے جب کہیں پائے صنم رنگِ حنا
برف سے ہاتھوں میں کھلتا ہے بہت آپ کے سر کی قسم رنگِ حنا
ابر کے آنچل میں ماہِ نو کھِلا ہے تیرا لطف و کرم رنگِ حنا
جان پر میری ستم ڈھائے وقارؔ بھیگا موسم، آنکھ نم، رنگِ حنا

جان لیوا ہے پیار کا سایہ
آپ کے انتظار کا سایہ

اور دیتا ہے میرے غم کو ہوا
ہمنشیں غمگسار کا سایہ

ہو رہی ہے جو دل میں چبھن
پڑ گیا ہوگا خار کا سایہ

جنم دیتا ہے نور والوں کو
تیرگی کے حصار کا سایہ

درد بھر دے دِلوں میں لوگوں کے
ہے ستمگر کہار کا سایہ

دور کردے قریب والوں کو
برتری کے خمار کا سایہ

رُخ بدل دے خزاں کے موسم کا
چھائے جب بھی بہار کا سایہ

نام روشن کرے زمانے میں
علم و فن کے نکھار کا سایہ

شخصیت کو ذلیل کرتا ہے
جھوٹے فن کے غبار کا سایہ

نور لائے ادب کی دنیا میں
بن کے سورج وقارؔ کا سایہ

ہمراز ہے، اے میرے صنم رات کا سایہ
پوشیدہ دل میں رکھتا ہے غم رات کا سایہ

فرقت میں چتا غم کی سلگتی ہے تمھارے
اور کتنا سہے ظلم و ستم رات کا سایہ

اُمید کی پھوٹی ہے کرن دل میں ہمارے
دیتا ہے سویرے کو جنم رات کا سایہ

وعدے سے مکر جانا حسینوں کی ادا ہے
سنتا ہے کبھی قول و قسم رات کا سایہ

ظلمت کو حقارت کی نگاہوں سے نہ دیکھو
کرنوں کی اداؤں میں ہے ضم رات کا سایہ

تارے بھی نظر آتے نہیں دامنِ شب میں
سناٹا ہے اور اُس پہ ستم رات کا سایہ

دل کو ہے وقارؔ ایک تبسم کی تمنا
بیتاب ہے دل اُس پہ کرم رات کا سایہ

تمکین الرحمٰن تمکینؔ

سیدتمکین الرحمٰن تمکینؔ ابن سیدامین الرحمٰن، اکولہ
تاریخِ پیدائش :۲۲؍اگست ۱۹۴۷ء
موبائیل : 02227669978

"زہراب"(شعری مجموعہ)

شعر و سُخن کا یہ گلدستہ تیرے نام
خونِ جگر کا یہ نذرانہ تیرے نام

منزل منزل دھوپ کی چادر پھیلی سی
یادوں کا یہ ٹھنڈا سایہ تیرے نام

موسمِ گل کا کیف ، مہکتی سبز فضا
میری بہاروں کا یہ تحفہ تیرے نام

دِل کے 'اک تارے' پر جس کو گایا تھا
وہ پُرسوز ادھورا نغمہ تیرے نام

تیرے ساتھ جو لمحے گذرے خواب ہوئے
ماضی کا ہر خواب سنہرا تیرے نام

دُنیا کے پُرشور سمندر میں لکھ دوں
خاموشی کا ایک جزیرہ تیرے نام

لفظوں کے "زہراب" میں ڈوبی کچھ یادیں
یہ تمکینؔ کا کُل سرمایہ تیرے نام

بھولے سے پھر بجھی ہوئی شمع جلا نہ دے
ماضی کا خواب آنکھ کا کاجل بہا نہ دے

سانسوں کے ارتعاش نے بے دم سا کر دیا
دشمن کو بھی خدا کبھی ایسی سزا نہ دے

دامن سنبھال کر چلو اب کے برس، بہار
پھولوں کے اہتمام میں کانٹے سجا نہ دے

بھولے سے یاد کرتے نہیں خود کسی کو وہ
اور چاہتے ہیں دوسرا اُن کو بھلا نہ دے

شعلے کی زباں چاٹ چکی میرے بدن کو
یہ غم کی آگ روح کی بستی جلا نہ دے

میں اپنے جسم سے باہر کھڑا ہوں
خود اپنے آپ ہی کو ڈھونڈتا ہوں

میں کس کی گونج ہوں کس کی صدا ہوں
یہ اکثر سوچتا ہوں میں کہ کیا ہوں

میں سنگِ راہ ہوں یا نقشِ پا ہوں
کئی پیروں تلے روندا گیا ہوں

بہت پیاسا ہوں ساحل پہ کھڑا ہوں
نگاہوں سے سمندر ناپتا ہوں

سکھاتی ہے پرّوں کو دھوپ جس پر
میں وہ اِک زرد پتّہ بن گیا ہوں

پہن کر لفظ و معنی کے لبادے
بہت دن سے کتابوں میں پڑا ہوں

کئی چہرے نظر آتے ہیں جس میں
میں وہ ٹوٹا ہُوا سا آئینہ ہوں

ہر اک شئے نیند میں ڈوبی ہوئی ہے
بس اِک میں ہی یہاں پر جاگتا ہوں

اُلفت مجھے نہ دو، وفائیں مجھے نہ دو
ناکردہ جُرم کی تو سزائیں مجھے نہ دو

میں سوگیا ہوں وقت کی چادر کو تان کر
ماضی کے دھندلکوں سے صدائیں مجھے نہ دو

خاکسترِ حیات میں چنگاریاں کہاں
دامن سے اپنے تیز ہوائیں مجھے نہ دو

میں اپنی گونج ہی میں گرفتار ہوں ابھی
اب اور پاس آ کے صدائیں مجھے نہ دو

طولِ شبِ فراق نے پتھر بنا دیا
تم اب تو زندگی کی دعائیں مجھے نہ دو

اکبر شارؔد

محمد اکبر شارؔد ابن محمد ابراہیم، ایوت محل
تعلیم : ایم۔اے۔بی۔ایڈ
تاریخِ پیدائش : یکم جنوری ۱۹۴۸ء
موبائیل : 9422844212
سابق صدر مدرس

خوشی کے موقع پر اُن کی کمی اچھی نہیں لگتی
عزیزوں کے بنا کوئی خوشی اچھی نہیں لگتی

عداوت، دشمنی، نفرت، حسد انساں کی فطرت ہے
مگر شدّت کسی بھی بات کی اچھی نہیں لگتی

کسی کے واسطے جب بدگمانی دل میں آجائے
تو اچھی بات بھی اس کی کبھی اچھی نہیں لگتی

سلیم الطبع فطرت دی ہے قدرت نے جنھیں اُن کو
کسی بے بس کی آنکھوں میں نمی اچھی نہیں لگتی

یہ کیسا دورِ بے کیفی ہے شارؔد زندگانی کا
کہ تہواروں پہ بھی اب روشنی اچھی نہیں لگتی

بدلیں گے حالات کے تیور صبر کرو
معرکہ ہوگا ہر اک سر پر صبر کرو

آج گلا اپنا ہے خنجر اُن کا ہے
اک دن بدلے گا یہ منظر صبر کرو

دشمن میرے پیچھے چھپ کر بیٹھا ہے
بول اُٹھے گا اک اک پتھر صبر کرو

حق تو حق ہے آخر غالب آئے گا
باطل کا جھک جائے گا سر صبر کرو

شافعِ محشر کی ہے یہ تعلیم ہمیں
غصّے کو پی جاؤ اکبرؔ صبر کرو

رنج نہیں کوئی بھی اگر مَیں ٹوٹا ہوں
بیوی بچّے بھائی بہن میں بکھرا ہوں

اندر اندر ٹوٹ رہا تھا روز وہ شخص
کوئی پوچھے تو کہتا تھا اچھا ہوں

رندوں سے بھی رسم و راہ رہی اپنی
اہلِ وَرع کی صحبت میں بھی رہتا ہوں

سچ مچ بے بس ہیں یا بے حس ہیں ہم سب
تم بھی سوچو میں بھی سوچا کرتا ہوں

شارؔد ایسی بات ہے آخر کیا مجھ میں
آج بھی اُن آنکھوں کا محور ہوتا ہوں

رکھیں ہر بات میں ہم صاف نیت
گھروں میں آئے گی تب جا کے برکت

عبادت ہے یقیناً یہ عبادت
خدا کے بندوں سے کرنا محبت

ہمارے نوجوانوں کو عطا کر
خدایا ! جذبۂ شوقِ شہادت

منافق دوستوں کے درمیاں ہوں
مرے مالک مری کرنا حفاظت

نہیں طالب کسی منصب کا شارؔد
نہ کوئی آرزوئے عزّ و شہرت

منّے خاں عازمؔ

منّے خاں عازمؔ، امراپور (بلڈانہ)
سن پیدائش: ۱۹۴۸ء
ایچ۔ایس۔ایس۔سی۔ڈی۔ایڈ
درس وتدریس ضلع پریشد بلڈانہ
"قطرہ آنسو شبنم" (شعری مجموعہ)

اس گردشِ مدام سے گھبرا گیا ہوں میں
رفتار ایک سی ہے تو اُکتا گیا ہوں میں

ہر پل ہجومِ یاس کا پیکر بنا ہُوا
اکثر اس ایک حال میں دیکھا گیا ہوں میں

پژمردہ زندگی سے تو بہتر یہ چھٹے کہ بس
ہر دن خوشی کی آس میں مرتا گیا ہوں میں

اپنوں کو اپنا کہتے ہوئے آئے شرم سی
کس کس نظر سے دوستو دیکھا گیا ہوں میں

مَیں نے ندیم رکھ تو لیا حسن کا بھرم
پر عشق کی چتا میں جلایا گیا ہوں میں

لے کر اُٹھا ہوں پھر سے میں اِک اور عزمِ نو
عازمؔ کے نام سے بھی تو جانا گیا ہوں میں

جن کو ہم مہرباں سمجھتے ہیں
دل کی حالت کہاں سمجھتے ہیں

ہم تو گلشن پرست ہیں لیکن
تجھ کو ہم باغباں سمجھتے ہیں

اتنا حساس دل ہے سینے میں
خامشی کی زباں سمجھتے ہیں

ہم نے ان کا بھی وقت دیکھا ہے
خود کو جو آسماں سمجھتے ہیں

جن کو اپنا پتا نہیں معلوم
سب انھیں غیب داں سمجھتے ہیں

غم بہاتا ہے اشک آنکھوں سے
لوگ بس داستاں سمجھتے ہیں

جو کہ ہیں مارِ آستیں عازمؔ
ہم انھیں رازداں سمجھتے ہیں

لاکھوں غم چھپائے ہیں، اِک خوشی کے پردے میں
درد ہی کے سائے ہیں، ہر ہنسی کے پردے میں

کیا یقیں کریں یارو اپنے ہوں کہ بیگانے
دشمنی ہی پاتے ہیں، دوستی کے پردے میں

یہ بھی تو حقیقت ہے تلخ ہی سہی لیکن
موت ہی کے سائے ہیں، زندگی کے پردے میں

حسرتوں کی بستی میں ہے جنازہ ارماں کا
کلفتیں ہی پاتے ہیں، دل لگی کے پردے میں

وہ جفا کے خوگر ہیں، ہم وفا کے پروردہ
الجھنیں بھی پاتے ہیں، برہمی کے پردے میں

اپنی کم نصیبی کا کیا کریں گلہ عازمؔ
تیرگی ہی پاتے ہیں، روشنی کے پردے میں

ماحول ہے عجیب مرے آس پاس کا
ہر شخص ہے شکار جو خوف و ہراس کا

اپنے وجود کی بھی حقیقت نہ پا سکا
مرکز ہوں دائرے کا میں یا نقطہ راس کا

کیا کیا یہ مرحلے ہیں ابھی میرے سامنے
ہر دم رہا ہے ساتھ مجھے غم کا یاس کا

وہ سُرخ رو لگے ہے یوں اُجلے لباس میں
اِک جل رہا ہو جیسے کہ جنگل کپاس کا

وہ کون ہے جسے نہ ہو خوشیوں کی آرزو
ہر شخص پاس رکھتا ہے آئینہ آس کا

ہر چند گو کہ میں تو نہیں اس سے مطمئن
لیکن اثر ہوا ہے مرے التماس کا

اقدارِ علم و فہم کا یہ دور ہی نہیں
عازمؔ یہ دور آج کا ہے خوش لباس کا

اختر علی اختر

سید اختر علی اختر ابن سید مجید علی، اکولہ　　تاریخ پیدائش : یکم اپریل ۱۹۳۸ء

ایچ۔ایس۔ایس۔سی

ٹریفک کنٹرولر مہاراشٹرا اسٹیٹ روڈ ٹرانسپورٹ

"خیالوں کے پھول" (شعری مجموعہ) ۲۰۰۷ء

تم نے دیوانہ کیا اچھا ہُوا　　ہر جگہ میرا جنوں رُسوا ہُوا

اب تو دیوانوں کے دل کی ہو گئی　　موسمِ گُل میں چمن صحرا ہُوا

جو بھی آیا حُسنِ پنہاں دیکھ کر　　کوئی اندھا تو کوئی بہرا ہُوا

دیکھ لو اس میں مری تصویر ہے　　اشکِ غم پلکوں پہ ہے ٹھہرا ہُوا

فتح کیسے پائیں گے کفار پر　　قوم کا شیرازہ ہے بکھرا ہُوا

تھا جو اختر زہر سا تیرِ نظر　　دن بہ دن زخمِ جگر گہرا ہُوا

اُجالوں کی نمائش ہو رہی ہے　　اندھیروں سے بھی سازش ہو رہی ہے

کوئی منصف نہیں شاید میسر　　ستمگر سے جو نالش ہو رہی ہے

وہ مانے یا نہ مانے اس کی مرضی　　منانے کی تو کاوش ہو رہی ہے

ستمگر سے کوئی پوچھے تو اتنا　　یہ مجھ پر کیوں نوازش ہو رہی ہے

ادب کی روک کر تعمیر خود ہی　　ترقی کی گذارش ہو رہی ہے

ہیں چرچے علم کے ہر اک زباں پر　　مگر کمزور دانش ہو رہی ہے

نہیں اخلاصِ نیت اور اختر　　عبادت کی نمائش ہو رہی ہے

دل و جاں ہم نثار کرتے ہیں
وہ نگاہوں سے وار کرتے ہیں

حالِ دل جب انھیں سناتا ہوں
آنکھ وہ اشک بار کرتے ہیں

ہم نے ان سے کبھی گلہ نہ کیا
وہ تو شکوے ہزار کرتے ہیں

آ بھی جاؤ کہ تاب ضبط نہیں
ہر گھڑی انتظار کرتے ہیں

آنکھ ان سے لڑی ہے جب اختر
گل و بلبل سا پیار کرتے ہیں

خواب آسودگی سنہرا ہے
زندگی پر تو سخت پہرا ہے

دھوپ نفرت کی بڑھ گئی لوگو!
اب محبت پہ چھایا کہرا ہے

حق پرستوں کا نام آشتی
سارے عالم میں جن کا شہرہ ہے

ہو دکھاوا یا ہو عمل اچھا
فیصلہ نیتوں پہ ٹھہرا ہے

دور کتنے بھی تم رہو اختر
رشتہ دل سے تو دل کا گہرا ہے

فصیح اللہ نقیبؔ

فصیح اللہ خاں نقیبؔ ابن ساجد اللہ خاں، اکولہ — تاریخ پیدائش : ۵ راپریل ۱۹۴۳ء
ایم۔اے (اردو، فارسی) بی۔ایڈ — فون نمبر : 0724-2471052
موظف صدر مدرّس عثمان آزاد اردو ہائی اسکول و کے۔ایم۔اے حسین جونیئر کالج اکولہ
''سیپیاں'' (شعری مجموعہ)، اِک شخص اِک شاعر۔غنی اعجازؔ (سوانح) ''شخص و عکس'' ناشنیدہ (مرتب)

ہیں مزاج آسماں پہ جس تس کے ۔۔۔ ناز اُٹھائیں بھی تو ہم کس کس کے
بجلیوں کے سنہری حرفوں میں ۔۔۔ بادلوں پر ہیں دستخط کس کے
آنکھ سے گر چھلک نہیں پاتے ۔۔۔ دل پہ گرتے ہیں اشک رِس رِس کے
جانے کب ہووے دیدہ ور پیدا ۔۔۔ دیدے پتھرا گئے ہیں نرگس کے
پاؤں چادر میں رہ نہ پائیں گے ۔۔۔ ہاتھ پھیلے رہیں گے جس جس کے
آرزوؤں کے سوکھتے گلبن ۔۔۔ منتظر یاسیت کی ماچس کے
کم سے کم گھر کو گھر تو رہنے دیں ۔۔۔ رکھیں آفس کو اندر آفس کے
عکسِ دوراں نقیبؔ کی غزلیں ۔۔۔ سلسلے چند رطب و یابس کے

کبھی سے ہم نہیں کھلتے کہ سب نہیں کھلتے ۔۔۔ وگرنہ محفلِ یاراں میں کب نہیں کھلتے
ہر ایک شخص کو حُسنِ نظر نہیں ملتا ۔۔۔ ہر ایک شخص پہ شعر و ادب نہیں کھلتے
یہاں پہ داد کو زنجیر اب نہیں کھنچتی ۔۔۔ یہاں پہ عدل کو دروازے اب نہیں کھلتے
کہیں انا پہ یقیناً لگی ہے چوٹ نئی ۔۔۔ پرانے زخم یونہی بے سبب نہیں کھلتے
یہ دور وہ نہیں پھر بھی شریف زادوں کے ۔۔۔ بزرگ سامنے گر ہوں تو لب نہیں کھلتے
ہمارے عیب ہمیں جو بتائے سو محسن ۔۔۔ کہ آئنوں پہ بھی خود کے عقب نہیں کھلتے
کبھی نقیبؔ سبھی پر کھلی کتاب کوئی ۔۔۔ کبھی تو ہم پہ بھی خود اپنے ڈھب نہیں کھلتے

دوستی کے نئے آداب لئے پھرتے ہیں
لوگ اب عطر میں تیزاب لئے پھرتے ہیں

چاہتے ہیں کہ حقیقت میں ڈھلیں آپ ہی آپ
جاگتی آنکھوں میں ہم خواب لئے پھرتے ہیں

آنکھ اٹھتی نہیں باہر کے نظاروں کی طرف
ہم طبیعت بڑی سیراب لئے پھرتے ہیں

احتیاطاً، کہ حریفوں کے نہ ہاتھ آجائیں
میرے پرزے مرے احباب لئے پھرتے ہیں

ہم کو شہرت کی تمنا نہ ستائش کی طلب
بے سبب آپ یہ اسباب لئے پھرتے ہیں

مہ جبیں ہیں انھیں بندیا کی ضرورت کیا ہے
کیوں وہ مہتاب پہ مہتاب لئے پھرتے ہیں

کیا گذرتی ہے دلوں پر یہ خدا ہی جانے
لوگ چہرے بڑے شاداب لئے پھرتے ہیں

دل کے تاروں سے چلے چھیڑ ترنم کے لئے
ہم جو اشعار کی مضراب لئے پھرتے ہیں

بادباں کا ہے نہ پتوار کا محتاج نقیبؔ
اس کی کشتی کو جو گرداب لئے پھرتے ہیں

خیر سے ہوتی رہی راہنمائی کیا کیا
ورنہ آجاتی بشر میں کج ادائی کیا کیا

معتبر کیسے کہیں، تُو نے اُڑائی کیا کیا
اے نظر! تجھ کو یہ دنیا نظر آئی کیا کیا

بے رُخی تھی و لے برگشتگی ایسی تو نہ تھی
کیا خبر! کس نے وہاں جا کے لگائی کیا کیا

دل نے تسلیم کیا کب کہ یقیں آجاتا
اُس نے بن بن کے مگر بات بنائی کیا کیا

عقل ہشیار تھی دھیرے سے دیا ہاتھ دبا
کیا کہوں، ورنہ مرے دل میں سمائی کیا کیا

کیسے احسان کئے جائیں، سخاوت کیسے
چھوڑ کر نقش گئے حاتمِ طائی کیا کیا

مَیں نہ ہابیل، نہ یوسفؑ، نہ مَیں ٹیپو سلطاں
چاہتے ہیں مرے حق میں مرے بھائی کیا کیا

وہ تو بہتان لگانے کے لئے بیٹھے ہیں
دل میاں بھائی ہرا دے گا صفائی کیا کیا

ڈال کر آنکھوں میں آنکھیں جو کہا: "پہچانا"؟
اُس نے پھر مجھ سے نقیبؔ آنکھ چرائی کیا کیا

حفیظ مومنؔ

حفیظ اللہ خاں ابن رحمت اللہ خاں ، امراؤتی — تاریخِ پیدائش : ار جولائی ۱۹۴۸ء
ٹیلیگراف ڈپارٹمنٹ سرکاری ملازمت (سبکدوش) — موبائل : 9421818730
''ورق ورق لمحے'' ''پھول کا سایہ'' (شعری مجموعے) ''گھر کی خوشبو''
''نیم کا درخت'' (زیرِ ترتیب)

جسے ہے زعم کہ اُس نے ہَوا کے پر باندھے
اگر ہے دَم تو ہماری دعا کے پَر باندھے

اُٹھائے ہاتھ عذاب و بلا کے پَر باندھے
یہ کس دعا نے کسی بد دعا کے پَر باندھے

ہوئی نہ آج بھی توبہ کے ٹوٹنے کی سبیل
خدا نے آج بھی کالی گھٹا کے پَر باندھے

کوئی تو ہو جو اسے روک لے تباہی سے
کوئی تو ہو جو دلِ مبتلا کے پَر باندھے

ہماری سوچ کی پرواز روکنا تھا محال
ہمیں نے جان کی بازی لگا کے پَر باندھے

گئی دِنوں سے کسی کا سلام ہے نہ پیام
مرے عدو نے یقیناً صبا کے پَر باندھے

شفا کی آس لگائے مریض بیٹھا ہے
دعا کو ہاتھ اُٹھائے دَوا کے پَر باندھے

حفیظؔ موت سے لقمان بچ سکے کب تک
بڑے حکیم تھے کب تک قضا کے پَر باندھے

اُن کے ہونٹوں کا وہ انداز کہیں اُف جیسے
اور تصویرِ مصور کا تصوف جیسے

اتنے ٹھہراؤ سے وہ بات کیا کرتے ہیں
ایک سے دوسرے سجدے میں توقف جیسے

اس طرح خود کو زمانے سے بچا رکھتا ہے
اُن کو منظور نہیں خود میں تصرف جیسے

یوں ہَوا آ کے مرے در سے پلٹ جاتی ہے
کچھ بتانے میں ہو ظالم کو تکلف جیسے

ہر طرف شور ہے خاموش کھڑا ہے کوئی
ہو رہا ہو اُسے ہونے کا تاسف جیسے

اس طرح وقت نے بدنام کیا ہے مومنؔ
کوئی محفل میں کراتا ہو تعارف جیسے

باتوں سے تیری بات کی خوشبو نکل پڑے
پہچان کا کہیں کوئی پہلو نکل پڑے

کم کم کہوں مَیں شعر، سناؤں بہت ہی کم
کیا جو کسی غزل سے کبھی تُو نکل پڑے

بوسہ کہا تھا آپ نے ابرو چڑھا لیے
اتنی ذرا سی بات پہ چاقو نکل پڑے

اس بار اُس نے آپ سے تُم کہہ دیا ہمیں
ایسی خوشی ! کہ آنکھ سے آنسو نکل پڑے

کہتے ہیں روشنی کی حفاظت کریں گے ہم
سورج کی دیکھ بھال کو جگنو نکل پڑے

کانوں میں رس تھی گھولتی سنتوں کی وانیاں
ترشول لے کے آج کے سادھو نکل پڑے

افلاس کے لباس میں یہ بات ہے، اگر
شاہانہ آن بان سے اُردو نکل پڑے

جب دین کی مدد کو پکارا گیا حفیظؔ
پھانکا نہ اپنے ہاتھ کا ستو، نکل پڑے

انوکھا روپ دھارا ہے، نرالا قد نکالا ہے
ذرا سی شاخ نے کیسا بڑا برگد نکالا ہے

خوشامد کرنے والے کے حکومت ہاتھ آئی ہے
جو اپنی جان پر کھیلا اُسے سرحد نکالا ہے

ہزاروں میں کسی اِک آدھ کو دنیا عطا کی ہے
ہمارے واسطے اس نے یہی فیصد نکالا ہے

کہ اس کو سوجھتی رہتی ہے اپنی ہی چلانے کی
کہیں تبریز بھیجا ہے، کہیں سرمد نکالا ہے

بہت آسان ہے اللہ کو منظر بدل دینا
ابھی مسند نشیں ہے ابھی مسند نکالا ہے

احد میں میم رکھتا، حمد سے پہلے الف رکھتا
عجب انداز سے اللہ نے احمد نکالا ہے

کمانا اور کھانا ، عیش کرنا اور مرجانا
نہیں مومنؔ، اگر جینے کا یہ مقصد نکالا ہے

پرکاش پروہت प्रकाश परोहित

پرکاش پروہت، اکولہ
تاریخ پیدائش : ۱۹ رنومبر ۱۹۴۸ء
ایم۔کام۔ایم۔اے (ہندی)

"ویدنا دستخط نہیں کرتی" (مجموعۂ گیت، غزل) "بادل کیسے چتر بناتے" (بال گیت سنگرہ)

بوریا بستر اُٹھا کرفیو لگا ہے
مت کسی کو دے صدا کرفیو لگا ہے

گھومتے ہیں صرف سناٹے گلی میں
آدمی ہے لاپتہ کرفیو لگا ہے

ایک صوبہ ایک جنگل ہوگیا ہے
جل رہا ہے ہر ضلع کرفیو لگا ہے

آگ کا دریا مکانوں تک نہ پہنچے
ہو دُکانوں کا بھلا کرفیو لگا ہے

بھر گیا ہے پیٹ لاشوں سے سڑک کا
ہوگئی ہے انتہا کرفیو لگا ہے

رہ گیا پدچاپ کو آنگن ترس کر
سوگیا ہے راستا کرفیو لگا ہے

چاقوؤں کے اور تلواروں کے سائے
زندگی پر ہیں فدا کرفیو لگا ہے

کل کا سورج کیا دِکھائے رام جانے
آج اک ہفتہ ہُوا کرفیو لگا ہے

آج بھی سوچا بہت
اور پھر رویا بہت

مَیں کہیں بھی تھا نہیں
آئینہ دیکھا بہت

آدمی کمزور تھا
زخم تھا گہرا بہت

تھا وہ دریا دل مگر
آپ نے مانگا بہت

عیب بھی چھپ جائیں گے
پاس ہے پیسا بہت

کیا پتہ کیوں آپ کو
دیکھ کر، دیکھا بہت

بس یہی افسوس ہے
کم لکھا، بھوگا بہت

جانتا ہوں اس کی سیرت کو صفت کو
بن پڑھے ہی پھاڑ ڈالے گا وہ خط کو

اس کے اوچھے پن سے تم واقف نہیں ہو
وہ صحیح ثابت کرادے گا غلط کو

قد مرا کتنا بڑا مَیں جانتا ہوں
جانتے ہو تُم تمھاری شخصیت کو

جاتے جاتے دے گیا بیٹا دلاسا
لے گیا ہے زندگی بھر کی بچت کو

چاٹو کاری چھا گئی ہے دفتروں میں
چاپلوسی کھا گئی ہر اہلیت کو

رکھ سکو محفوظ تو پھر رکھ کے دیکھو
قہقہوں کے بیچ جینے کی جگت کو

ٹکڑا جگر کا پھول کی کیاری ہیں بیٹیاں
پھر کیوں بھلا دہیج کی ماری ہیں بیٹیاں

ہیں گونج رچاؤں کی اذانوں کی تان ہیں
ہم کو تو اپنی جان سے پیاری ہیں بیٹیاں

نردھن ہو یا دھنوان ہو راجہ یا بھکاری
بابل کے لئے راج کماری ہیں بیٹیاں

یہ سچ ہے کہ بیٹا ہے بڑھاپے کا سہارا
یہ جھوٹ ہے ماں باپ پہ بھاری ہیں بیٹیاں

سوئے گا کس طرح وہ بھلا نیند چین کی
جس آدمی کے گھر میں کنواری ہیں بیٹیاں

جو سوچتے ہیں آپ وہی بولتا ہوں مَیں
اوروں کی بیٹیاں بھی ہماری ہیں بیٹیاں

گلاب زخمی

شیخ گلاب زخمی ابن شیخ قاسم، اکولہ
تاریخ پیدائش : یکم جولائی ۱۹۴۹ء
ایچ۔ایس۔ایس۔سی۔ڈی ایڈ
موظف مدرس ضلع پریشد، اکولہ

رُخِ حسین سے پردہ اُٹھا رہا ہے کوئی
کہ ماہتاب سا جلوہ دِکھا رہا ہے کوئی

خدا کے واسطے اِک بار تو چلے آؤ
تمہاری راہ میں آنکھیں بچھا رہا ہے کوئی

میں جام کیسے اُٹھاؤں بھلا اے بادہ کشو
نگاہِ ناز سے مجھ کو پلا رہا ہے کوئی

گلوں پہ قطرۂ شبنم نہیں حقیقت میں
کسی کی یاد میں آنسو بہا رہا ہے کوئی

چلو وہیں پہ ابھی جا کے ہم بھی بس جائیں
سُنا ہے پیار کی دُنیا بسا رہا ہے کوئی

ہماری شیر و شکر کی طرح محبت میں
لو آج زہر عداوت ملا رہا ہے کوئی

کسی کو خوفِ جہنم جہاں میں ہے زخمی
اسی جہان کو جنت بنا رہا ہے کوئی

نادان کچھ نہیں ہے ترے اختیار میں
ہر چیز تو ہے قبضۂ پروردگار میں

اس دور میں وفا کی حقیقت میں کیا کہوں
جیسے سَراب آئی نظر ریگزار میں

ہے وقت کا تقاضا رہیں اتفاق سے
افسوس مبتلا ہوئے ہم انتشار میں

دشمن پہ وقت آئے تو میں انتقام لوں
شامل نہیں ہے دوستو میرے شعار میں

اہلِ چمن تو شاد ہیں مسرور ہیں مگر
زخمی گلاب ہو گئے فصلِ بہار میں

بیتے دن جب بھی یاد آتے ہیں
اشک پلکوں پہ جھلملاتے ہیں

تیری یادوں کے چاند تاروں سے
شبِ فرقت کو ہم سجاتے ہیں

حالِ فصلِ بہار مت پوچھو
پھول کانٹوں میں منہ چھپاتے ہیں

تم جو کہتے ہو، صرف کہتے ہو
ہم جو کہتے ہیں کر دکھاتے ہیں

ہم! کہ فتنہ فساد کی باتیں
جہاں سنتے ہیں بھول جاتے ہیں

وہی تقسیم کے ہیں ذمّہ دار
ہم پہ الزام جو لگاتے ہیں

پھر سے تقسیم ہم نہ ہوجائیں
آج حالات یہ بتاتے ہیں

میری انگلی پکڑ کے چلتے تھے
اب مجھے راستہ دکھاتے ہیں

تیرے اشعار ہیں کہ اے زخمی
ذوق والوں سے داد پاتے ہیں

اشک پینا پڑا غم چھپانا پڑا
تم سے مل کر ہمیں مسکرانا پڑا

ہو کے نادِم وہ ملنے کو جب آگئے
سارا شکوہ گلہ بھول جانا پڑا

آ کے دہلیز پر مجھ سے خوددار کی
مال و زر کو ترے سر جھکانا پڑا

جھک گئے سر سبھی کے تو آخر مجھے
پیشِ تیغِ ستم سر اٹھانا پڑا

کھیل دل کا بھی زخمی عجب کھیل ہے
جیت کر بھی مجھے ہار جانا پڑا

نور احمد نورؔ

نور احمد نورؔ ابن شیخ حسین، اکولہ
موبائیل : 09404894292
تاریخِ پیدائش : ۱۰ر نومبر ۱۹۴۹ء
تعلیم : میٹریکیولیشن، ڈی۔ ایڈ
موظف صدر مدرس ضلع پریشد، اکولہ
ایڈیٹر : نقوشِ برار (پندرہ روزہ)

عالم عالم جدا جدا ہے نا　بندہ بندہ خدا خدا ہے نا
بھیجتا ہے درود جن پہ خدا　جن پہ عالم فدا فدا ہے نا
آخرش کائنات سب فانی　اللہ اللہ سدا سدا ہے نا
سنتیں دوست کی پسندیدہ　ان کی ہر ہر ادا، ادا ہے نا
بارہا معصیت سے کر توبہ　بازو بازو لدا لدا ہے نا
مغفرت کے کھلے کھلے در ہیں　رحمتوں کی ردا ردا ہے نا
فضلِ حق سایۂ نبیؐ مانگے　نورؔ در کا گدا گدا ہے نا

صاف دل تھا سب کے گھر جاتا تھا میں　جتنا ادنیٰ اُتنا ہی اعلیٰ تھا میں
رات کے سایوں سے میرا ربط تھا　صبح ہو جانے پہ گھر لوٹا تھا میں
اُس الکٹرک پول کے سایے تلے　ٹکٹکی باندھے ہوئے بیٹھا تھا میں
پھر نیا سورج اُگانے کے لئے　صبح صادق کی طرح ابھرا تھا میں
میں کبھی پربت کے جیسا تھا اٹل　یا ذرا سی ٹھیس پر بکھرا تھا میں
اک چمکتے آئینے کا عکس تھا　اور بچّے کی طرح لپکا تھا میں
بٹ گیا ہوں آج جسموں میں کئی　نورؔ کل تک کس قدر تنہا تھا میں

ٹوٹتے رہنا ٹوٹ کے پھر مرجھانا بھی
جیسے بچھڑنا اور بچھڑتے جانا بھی

مٹی ہو تم مٹی بن کر دکھلاؤ
پتھر ہونا پتھر سا ہوجانا بھی

پابندی ، ڈر ، نفرت ، قید نہ جانے کیا
مڑ کر دیکھا اس نے اور پہچانا بھی

مجھ سے ترکِ تعلق کا چرچا کرنا
میری گلی میں چھپ چھپ آنا جانا بھی

جھوٹ کا ثابت ہوجانا ، سچ کھل جانا
رات پہ پردہ گرنا ، دن کا آنا بھی

اُلٹی سیدھی باتیں ، گانے ، موسیقی
موبائل نے چھینا ، پینا کھانا بھی

تتلی جیسے اُڑنا ، بل کھانا ، رُکنا
الھڑپن کی فطرت ہے اٹھلانا بھی

من مانی شرطوں پر ہٹ دھرمی کرنا
دوری قایم رکھنا پیار جتانا بھی

دن بھر تپ کر سورج بن جائے کندن
ڈوبتے وقت کا منظر خوب سہانا بھی

اندھے کنوئیں کو جائے اماں سمجھے رہنا
خود ہی درد اٹھانا شور مچانا بھی

سوچ سمجھ کر نورؔ نہیں کہتا پھر بھی
ہوش کی باتیں کرتا ہے دیوانہ بھی

احساس کے مکان کا دروازہ کھولئے
سچ کو دبی زباں سے سہی سچ تو بولئے

ٹوٹے نہ بے ارادہ کہیں دل رقیب کا
میزانِ ذہن میں ذرا الفاظ تولئے

دکھ میں تو خاک ہی نے ثبوتِ وفا دیا
ہمراہ میرے دھول کے ذرّات ہولئے

نگلا نہ جا سکے جسے اُگلا نہ جا سکے
یوں زہر زندگی میں کسی کی نہ گھولئے

سورج سے روشنی کی لکیریں سمیٹ کر
ہر صبح ہم نے داغ اندھیروں کے دھولئے

لیتا ہوں چند آخری سانسیں ٹٹول کر
اب آپ آئیے ذرا دو لفظ بولئے

دل کا چراغ کون ہے اک نفس کے سوا
آنکھوں میں نورؔ اشکِ ندامت ٹٹولئے

حسین خاں جھنجھٹ

حسین خاں جھنجھٹ ابن خواجہ خاں، اکولہ
موبائیل : 9823793597
تاریخِ پیدائش : ۱۹۳۹ء
ایچ۔ایس۔ایس۔سی۔ڈی۔ایڈ
موظف مدرّس

گلوں میں جس طرح خوشبوُ بہت ضروری ہے
اسی طرح ہمیں اُردوُ بہت ضروری ہے
نہ مال و زر کی تمنا نہ جاہ و منصب کی
مری حیات میں بس توُ بہت ضروری ہے
ہے تلخ بول سے دل ٹوٹنے کا اندیشہ
زباں پہ اس لئے قابوُ بہت ضروری ہے
قریب آئینگے دشمن بھی تیری دعوت پر
ترے کلام میں خوشبوُ بہت ضروری ہے
عمل ہو ایسا جو ایماں کی ترجمانی کرے
خود اپنی ذات میں یہ خوُ بہت ضروری ہے
بغیر علم کے منزل نہ پا سکو گے تم
اندھیری رات میں جگنوُ بہت ضروری ہے
زمانے بھر کی زبانوں سے ہم کو کیا جھنجھٹ
ہمارے واسطے اردوُ بہت ضروری ہے

علم کی شمع اندھیرا نہیں ہونے دیتی
اپنے کردار کو میلا نہیں ہونے دیتی
اپنے اسلاف کی تعلیم ہی کچھ ایسی ہے
عزم و ہمت کو جو پسپا نہیں ہونے دیتی
گردشِ خون رگ و پے میں ابھی جاری ہے
اِک بھی سوچ نکما نہیں ہونے دیتی
خندہ پیشانی سے ہر ایک سے پیش آتا ہوں
میری عادت مجھے رُسوا نہیں ہونے دیتی
زندگی سے مری وابستہ ہے یوں رنج و الم
یاد ان کی کبھی تنہا نہیں ہونے دیتی
نہ شکایت ہے تھکن کی نہ گلہ محنت کا
ذمہ داری مجھے بوڑھا نہیں ہونے دیتی
جب سے حالات سے سمجھوتا کیا ہے جھنجھٹ
مفلسی میرا تماشا نہیں ہونے دیتی

مسئلہ جو مرے درپیش ہے تو حل کر دے
زندگی میری ادھوری ہے مکمل کر دے

دلِ خاموش پہ اک ہلکی سی دستک دے کر
جذبۂ شوق مرا اور بھی چنچل کر دے

جب بھی گردن میں جھکاؤں تو نظر آئے تو
اپنی تصویر مرے دل میں مقفل کر دے

تو گھٹا بن کے فضاؤں میں بکھر جا ہر سو
میری چاہت کو بھی آوارہ سا بادل کر دے

لے کے انگڑائی جکڑ لے مجھے ناگن کی طرح
میرے اس جلتے بدن کو ذرا صندل کر دے

چشمِ نرگس جو خدا نے تجھے بخشی اے صنم
اے صنم مجھ کو بھی اُن آنکھوں کا کاجل کر دے

اب نہ جھنجھٹ رہے باقی نہ شکایت کوئی
بن کے ہمراہ سرِ راہ تو ہلچل کر دے

کیوں یہ دھوکے میں پڑا، بھائی ترا کچھ بھی نہیں
تُو جو کہتا ہے مرا، بھائی ترا کچھ بھی نہیں

کیا سکندر کی سوانح تجھے معلوم نہیں
سوچ اس پر بھی ذرا، بھائی ترا کچھ بھی نہیں

وقت اک جھونکا ہوا کا ہے، ٹھہرتا ہی نہیں
اس پہ آنسو نہ بہا، بھائی ترا کچھ بھی نہیں

لوٹ جانا ہے بہر حال سبھی کو اک دن
شور اتنا نہ مچا، بھائی ترا کچھ بھی نہیں

پھنس کے دنیا کے جھمیلوں میں نہ تو جھنجھٹ کر
رال اس پر نہ گرا، بھائی ترا کچھ بھی نہیں

متین احمد متینؔ

محمد متین احمد ابن شیخ محمد، اچل پور (امراوتی)　　تاریخِ پیدائش: ۱۸؍جنوری ۱۹۵۰ء
ایم۔اے۔بی۔ایڈ
مدرّس ضلع پریشد ہائی اسکول، اچل پور
"ننھے منے گیت"، "قلم کے موتی"، "قصیدہ رحمت اللعالمین وغیرہ "تجلی زار" (زیرِ طبع)

نقوشِ پا میں تجلّی وجود کی بابا　　تمام راہ میں خوشبو ہے عود کی بابا
طلسمی ہالے میں رہتا ہے ماہِ آزادی　　عجیب صورتیں دیکھیں قیود کی بابا
یہ آندھیاں نہ بجھادیں چراغِ دل کی لو　　کہ ہے شناخت یہ اپنے وجود کی بابا
قلوبِ دیدہ وراں کو لہو رُلاتی ہے　　رگِ حیات میں گردش جمود کی بابا
یوں خارزار میں کھینچو نہ روح کا دامن　　مجھے ہوس نہیں نام و نمود کی بابا
کبھی کبھی تو حبابِ محیطِ فکر میں بھی　　ملی ہیں وسعتیں چرخِ کبود کی بابا
تجلّی زار ہوا ہے غزل کا آئینہ　　یہ برکتیں ہیں سلام و درود کی بابا
متینؔ وقت نے کیسے یہ دن دکھائے ہیں　　ہیں چار روٹیاں قیمت سجود کی بابا

شعاعِ سمتِ سفر کو نظر میں رکھنا ہے　　تلاطم اور بھنور کو نظر میں رکھنا ہے
ہیں راہ میں خس و خاشاک کے پہاڑ تو کیا　　طلسمِ برق کو اپنے ہنر میں رکھنا ہے
شعارِ چوبِ قلم، شیوۂ عصائے کلیم　　شعاعِ طور کو تارِ نظر میں رکھنا ہے
نئے تبوک نے ان گنت محاذ کھولے ہیں　　ابھی گناہ قدم اپنے گھر میں رکھنا ہے
شبوں کے پاس رہے غارِ ثور کا تریاق　　حرا کا نور نمودِ سحر میں رکھنا ہے
پھر اُس ادا سے کھلیں ذہن و دل کے دروازے　　اُسی نسیمِ اخوت کو سر میں رکھنا ہے
ڈبو رہی ہے تہی سیپیوں کی نادانی　　صدی کے جال کو پل پل نظر میں رکھنا ہے
کبھی ہے دھوپ کبھی فکر، چاندنی ہے متینؔ　　تجلّی زارِ غزل کو سفر میں رکھنا ہے

صحرائے درد، دھوپ کی یلغار قلب و روح
میرے لیے ہیں سایۂ اشجار قلب و روح

لمحات ہیں صدی کے پیالے پیے ہوئے
مجروح ایک دن میں ہیں سو بار قلب و روح

سیرِ شکم سے نفس کو حاصل نہیں فراغ
یارو ہیں اپنے جسم سے بیزار قلب و روح

جگنو کی یہ مثال تو وہ برق ہے تمام
تاریک شب سے برسرِ پیکار قلب و روح

دن کے لبوں پہ رات کی مہریں لگی ہوئیں
ہنگامہ خیز منبعِ اظہار قلب و روح

قاتل سے سرد شوقِ شہادت نہ ہوسکا
تھے محوِ رقص خوب سرِ دار قلب و روح

ہم دستِ زیرِ سنگ سے تا عمر تھے مگر
البیلے تاج فکر کے معمار قلب و روح

کٹ پائیں گے نہ اپنی جڑوں سے تمام عمر
کرتے رہیں خرد پہ اگر وار قلب و روح

اب زور آزمائی میں آنے لگا ہے لطف
دنیا اندھیری رات، ضیاء بار قلب و روح

تن کا کھلونا ٹوٹ گیا زیرِ پائے فیل
بعد از فنا تھے لائقِ دیدار قلب و روح

کچھ روز سے تو صاف یہ لگنے لگا متینؔ
رکھ دیں گے گویا کھینچ کے سرکار قلب و روح

پاکیزہ پن، میرا نشہ
البیلا فن، میرا نشہ

لفظوں کا سنگھار کروں
دیوانہ پن، میرا نشہ

نرگس کی آنکھوں کا نور
گلشن گلشن، میرا نشہ

جنّت کی حوریں ساقی
خواب کا آنگن میرا نشہ

قوسِ قزح صہبا کی موج
حور کا دامن، میرا نشہ

برق کھلے جلووں کی آنچ
دھانی چلمن، میرا نشہ

سچائی میری صہبا
ظل سے اُن بَن، میرا نشہ

مَیں ہوں شرابی البیلا
اِکرامِ زن، میرا نشہ

رشکِ زمیں میرے موسم
لفظ کا ساون میرا نشہ

دل کا یہی اک رنگ متینؔ
اُجلا درپن میرا نشہ

اقبال خلشؔ

اقبال حسین خاں ابن تفضل حسین خاں، اکوٹ (ضلع اکولہ) موبائل : 09822724299
تاریخ پیدائش : ۱؍جولائی ۱۹۵۰ء
تعلیم : ایچ۔ ایس۔ ایس۔ سی
"اثاثہ"، "خلش باقی ہے"، "یہ خلش یہ سوزِ آگہی" (شعری مجموعے) "سراجِ منیر" (مجموعۂ نعت)
"یہ خلش کہاں سے ہوتی" (زیرِ ترتیب)

مآلِ احتساب یہ، کہ ہم بڑے خراب ہیں / کسی پہ طنز کیا کریں، کہ خود ہی آپ آپ ہیں
بصیرتوں کے ارتقاء کی انتہا ہے آگہی / مری نظر سے دیکھئے تو خواہشیں سراب ہیں
کسی کا درد دیکھ کر، تڑپ گئے تو رو دیئے / شعارِ درد مند کو، بصارتیں عذاب ہیں
بہ اعتبارِ علم جن کی، حیثیت فقیر سی / بہ اعتبارِ مال و زر، وہ صاحبِ نصاب ہیں
خرد تمام مسئلوں کا حل، جنوں سے پوچھتی / جواب ایک چاہئے، سوال بے حساب ہیں
ہمارے بعد کسمپرسئ غزل کا دور ہے / ہمیں تو خیر چند قارئین دستیاب ہیں

بھلے ہی ہست سے نابود ہوتا / زیاں میرا، کسی کا سود ہوتا
میں جس کی آرزو میں مر رہا ہوں / تصور میں تو وہ موجود ہوتا
جمی ہے مصلحت کی برف ورنہ / ہمارا حوصلہ بارود ہوتا
ہوس کیونکر تمھیں بے چین کرتی / سکونِ دل اگر مقصود ہوتا
جو ہم کرتے نہ عزمِ حق نوائی / امیرِ شہر کیوں نمرود ہوتا
حسد کا تیل ہے تیرے دیئے میں / اُجالا تو نہ ہوتا، دود ہوتا
طلسم آباد ہے شہرِ تخیل / جسے میں سوچتا مشہود ہوتا
خلشؔ مسلک ہے آفاقی ہمارا / کسی سرحد میں کیوں محدود ہوتا

وہ ہوا پر سوار ہے، سو ہے / کبر، اس کا مدار ہے، سو ہے
خودنمائی شعار ہے، سو ہے / آدمی اشتہار ہے سو ہے
رائیگاں ہے مرا خلوصِ وفا / وہ انا کا شکار ہے، سو ہے
لاکھ مِنّت کرے سخی حاتم / بھیک سے ہم کو عار ہے سو ہے
فقر و فاقہ نہیں ہے مجبوری / یہ ہمارا شعار ہے سو ہے
بارِ احساں اتاریے کیسے / نقدِ جاں مستعار ہے سو ہے
دیکھیے موج کی پشیمانی / ڈوب کر بھی وہ پار ہے سو ہے
یہ سمندر ہے علم و دانش کا / بیکراں، بے کنار ہے سو ہے

ہر لفظ ہے نوشتۂ دیوار کی طرح / سچ بولتا ہے وہ مرے اشعار کی طرح
ماں ہے عظیم، نور کے مینار کی طرح / غصہ تو کر رہی ہے مگر پیار کی طرح
گر سوچیے مہاجرؓ و انصارؓ کی طرح / جذبہ نہیں ہے جذبۂ ایثار کی طرح
دنیا سے پیش آیئے بیزار کی طرح / پیچھے پھرا کرے گی طلبگار کی طرح
خوشبوئے دوستاں تو ہوا پر سوار ہے / چلنا پڑے گا وقت کی رفتار کی طرح
رشتے ہوئے مفاد پرستی میں مبتلا / گھر ہوگیا ہے، کوچۂ بازار کی طرح
کاسہ ہے اس امیر کی قسمت میں اے خلش / جھکتا نہیں جو، شاخِ ثمر دار کی طرح

ڈاکٹر لطیف احمد سجانی

ڈاکٹر محمد لطیف احمد ابن تاج محمد، پوسد (ایوت محل) تاریخ پیدائش: یکم جولائی ۱۹۵۰ء
تعلیم : ایم۔اے (اردو) بی۔ایڈ۔ پی۔ایچ۔ڈی پیشہ : درس وتدریس
موبائیل : 9225796871
''ودربھ میں اردو صحافت'' ۲۰۰۲ء ''گلدستۂ اورنگ آباد'' ''صریرِ قلم'' (تحقیق وتنقید، زیرِ ترتیب)

لگ گئے برسوں ذرا بات بتانے کے لیے
ان خرافات کو گھر گھر سے ہٹانے کے لیے

کس قدر زہر پیا ضبط کیا ہے میں نے
جو لگی آگ، ہے سینے میں چھپانے کے لیے

ایسے بھی لوگ بہت سارے ملیں گے تم کو
ہر غلط کام کیا نام کمانے کے لیے

خونِ دل' خونِ جگر' جان تلک نذر کیے
کیا نہیں دے کے گیے لوگ زمانے کے لیے

داؤ پر لوگ لگا دیتے ہیں ہر شے اپنی
اپنے دشمن کو فقط نیچا دکھانے کے لیے

کون جاتا ہے کسی تپتے ہوئے صحرا میں
اپنی تنہائی کا اک جشن منانے کے لیے

کوششیں جاری ہیں اس دور کی ہر دن اے لطیفؔ
جتنے جنگل ہیں انھیں شہر بنانے کے لیے

عکس در عکس ہے چہروں کی نموداری سے
آئینہ دیکھتے ہیں لوگ بھی بیزاری سے

پھر بھی الزام کئی آگئے سر پر اپنے
میں گریزاں تو رہا وقت کی عیاری سے

بغض ہے' حرص ہے' غیبت ہے' ریاکاری ہے
جس قدر بھی ہو رہو دور ہی بیماری سے

بٹ کر رہ جاتا ہے انسان کئی حصوں میں
مشغلے پیدا عجب ہوتے ہیں بیکاری سے

بے سبب گرتا نہیں آدمی نظروں سے کبھی
بدکلامی کے سبب یا کبھی مکاری سے

نامکمل ہے غزل غم کی عبارت کے بغیر
حسن آتا ہے کہاں شعروں میں فنکاری سے

لوگ گرویدہ مرے یونہی نہیں آج لطیفؔ
دل کو جیتا ہے روابط سے رواداری سے

نہ کوئی خواب ہوگا اور نہ خوابوں کا جہاں ہوگا
کوئی دل میں نہیں ہوگا تو دل خالی مکاں ہوگا

بہت ہی سوچ کر تو کشتیٔ عمرِ رواں کو ڈال
مقابل میں تلاطم خیز بحرِ بیکراں ہوگا

نہیں ہے دور وہ منظر جسے دیکھے گا یہ عالم
مسلماں اک طرف اور اک طرف سارا جہاں ہوگا

یہ دورِ پُر فتن ہے بوجھ اپنا خود اُٹھاؤ تم
تمہارا درد بانٹے گا نہ کوئی مہرباں ہوگا

رئیسوں اور لٹیروں کا زمانہ ہے غریبو ! تم
کبھی مت سوچنا تم پر زمانہ مہرباں ہوگا

چٹانوں کی طرح میں عزم رکھتا ہوں لطیفؔ اب کے
مجھے معلوم ہے ہر اک قدم پر امتحاں ہوگا

جو بجھ گئے انھیں کو چراغوں کا نام دو
بے چہرگی کو اپنی گلابوں کا نام دو

جو ہے حقیقی اس کو تو اب بھول جاؤ تم
بے جان پتھروں کو خداؤں کا نام دو

ہمدردیاں ، خلوص و محبت کہ دوستی
اس دور میں انھیں بھی گناہوں کا نام دو

ہے وقت کا تقاضا بُری حرکتوں کو تم
جدت کہو تحسین اداؤں کا نام دو

دہشت گری جہاں پہ پنپتی ہے رات دن
سنتوں کا مٹھ کہو کہ گپھاؤں کا نام دو

اس میں گھٹن ہے زہر ہے گرد و غبار ہے
پھر بھی اُسے شگفتہ فضاؤں کا نام دو

ڈوبے تھے پھر بھی صاف نکل آئے اے لطیفؔ
اس کو ادا کہو کہ دعاؤں کا نام دو

وقار فاروقی

وقار فاروقی ابن غلام مصطفےٰ حکیم پیارے صاحب، اچل پور (ضلع امراوتی)
تاریخ پیدائش : ۱۷؍ جولائی ۱۹۵۰ء — کاتب

ہر ایک غم کو مسرت میں ڈھالنے والا
کہاں گیا وہ تبسم اچھالنے والا

یہ اس کے رشک و حسد خود اُسے ڈبوئیں گے
مرے گا زہر سے خود سانپ پالنے والا

لگا سکا نہ مرے ظرف کا وہ اندازہ
ابھر سکا نہ سمندر کھنگالنے والا

بچا سکے گا نہ خود کو ذلیل ہونے سے
ہماری ذات پہ کیچڑ اچھالنے والا

خوشی کا لمحہ کبھی تو عطا کرے گا مجھے
جہاں کے غم مری جھولی میں ڈالنے والا

تمھاری بزمِ طرب میں وقار آیا ہے
ہر ایک زخم کو شعروں میں ڈھالنے والا

جو مطلب کی نہیں وہ شے لٹیرا چھوڑ جاتا ہے
''اپاہج باپ ہو جائے تو بیٹا چھوڑ جاتا ہے''

اب ایسے شہ جہاں تو ہم نہیں جو تاج بنوائیں
ہمارے خواب میں یہ کون نقشہ چھوڑ جاتا ہے

کوئی انسان سے بڑھ کر نہیں ظالم زمانے میں
درندہ بھی اُسے دیکھے تو رستہ چھوڑ جاتا ہے

کہیں دنگے بھڑکتے ہیں کہیں ہوتا ہے ہنگامہ
وہ آتا ہے تو اک شوشہ ہمیشہ چھوڑ جاتا ہے

تباہی بعد میں آتی ہے، جاتا ہے وقار اوّل
ہمیشہ شام سے پہلے ہی سایہ چھوڑ جاتا ہے

کون لے کس کی خبر، کھو گئے سناٹے میں
ہم اِدھر آپ اُدھر کھو گئے سناٹے میں

تیری باتوں کا اثر کھو گئے سناٹے میں
ہم نہ سُن پائے مگر کھو گئے سناٹے میں

تیرگی ایسی کہ گُم ہو کے نہ ہم خود کو ملے
کوئی دیوار نہ در کھو گئے سناٹے میں

ایک حسرت تھی کہ ہم تم سے ملیں بات کریں
دیکھ کے تم کو مگر کھو گئے سناٹے میں

زندگی اپنی ہر اک گام پہ لگتی ہے سراب
اُف یہ صحرا کا سفر کھو گئے سناٹے میں

یہ زمانہ تو نہیں داد و دہش کا اے وقارؔ
رہ گئے اپنے ہنر، کھو گئے سناٹے میں

کسی سے فکر کسی سے نظر ملے نہ ملے
سفر ہے شرط، کوئی ہم سفر ملے نہ ملے

سکوں سے کاٹ لیں کچھ اور بھی بہار کے دن
پھر اُس کے بعد قفس معتبر ملے نہ ملے

خود اپنے سائے میں کچھ دیر بیٹھ کر دم لیں
ہماری راہ میں کوئی شجر ملے نہ ملے

خوشی کا لمحہ کوئی رائیگاں نہ جانے دو
یہ نامراد کبھی وقت پر ملے نہ ملے

چلو کہ منزلیں ہم کو پکارتی ہیں وقارؔ
نہ انتظار کرو، راہبر ملے نہ ملے

منصور اعجاز

سید اعجاز حسین ابن سید شبیر حسین، ایوت محل
تاریخ پیدائش : جولائی ۱۹۵۰ء
تعلیم : ایم۔اے (اردو) بی۔ایڈ
"چاندنی کا درد" (شعری مجموعہ) ۱۹۷۹ء "آوازِ جرس" (دیوناگری)

سخت جاں اور بے حس ہوا ہوں
غم کے احساس سے بچ گیا ہوں

دوستوں سے بھی حیرت زدہ ہوں
اجنبی دشمنوں میں رہا ہوں

کوئی حد بھی تو ہو سوچنے کی
سوچتا ہوں تو بس سوچتا ہوں

میرے قدموں سے سر کو اٹھا لے
میں ترے ظلم کی انتہا ہوں

تو غزل ہے سراپا غزل، میں
آخری شعر کا قافیہ ہوں

چاند جب آسماں پہ چلتا ہے
میرے دل سے کوئی گذرتا ہے

تھرتھرائے ہوئے لبوں سے ترے
دیکھنا ہے کہ کیا نکلتا ہے

کوئی صحرا نہیں سراب نہیں
تیری آنکھوں میں کیا چمکتا ہے

پھول کھلتے ہیں جب بھی گلشن میں
تو بھی آئے گا ایسا لگتا ہے

لوگ بیٹھے ہیں بند کمروں میں
اور سڑکوں پہ غم بھٹکتا ہے

چاند راتوں میں درد جاگے تو
تنہا کمروں میں دم بھی گھٹتا ہے

دل میں جل کر جو بجھ گیا منصورؔ
ذہن میں وہ چراغ جلتا ہے

میں بھی خاموش اجالوں کی ضیا ہوں جیسے
اپنی دھرتی پہ خدا تیرا پتا ہوں جیسے

اس کی آنکھوں میں قیامت کی حیا روشن ہے
نیم خوابیدہ اسے سوچ رہا ہوں جیسے

میرا مسکن ، نہ ٹھکانہ ، نہ کوئی راہ گذر
میں کوئی سرپھری آوارہ ہوا ہوں جیسے

میرا در چھوڑ کے جاتی ہی نہیں ہے کم بخت
تیری رسوائی کو اک میں ہی مِلا ہوں جیسے

زندگی ! تو بھی تو مجھ سے کبھی کھُل کر نہ ملی
اجنبی تیرے لئے میں بھی رہا ہوں جیسے

خود سے مِل کر مجھے شدت سے لگا ہے منصورؔ
اب تلک مردہ ضمیروں میں رہا ہوں جیسے

کوئی گذرا ہے مجھے چھوتا ہُوا
جانے کتنی بار یہ دھوکا ہُوا

میں وفا کی آنکھ سے ٹپکا ہُوا
ایک آنسو تھا بہت رُسوا ہُوا

پر جھٹک کر ہوگیا ہے تازہ دَم
اک پرندہ قید سے چھوٹا ہُوا

مدّتیں گذریں اُسے بچھڑے ہوئے
لمحہ لمحہ پھر بھی ہے ٹھہرا ہُوا

پیار بھی ہوتا ہے کیا مجبور کا
ایک وعدہ ریت پر لکھتا ہُوا

اجنبی تو بھی پرائے دیس میں
میں بھی اپنے شہر میں بھٹکا ہُوا

میں کسی مفلس کے در کی ڈھول ہوں
وہ بھی اک پتھر بہت پوجا ہُوا

اک تری دیوانگی منصورؔ کیا
اس گلی میں ہر کوئی رُسوا ہُوا

جانی شیداؔ

صاحب خاں جانی شیداؔ ابن چاند خاں، اچل پور (امراؤتی) موبائل : 9890062504
تاریخ پیدائش : ۲۸ر نومبر ۱۹۵۰ء
ایم۔اے۔بی۔ایڈ صدر مدرس جانی شیداؔ اردو ہائی اسکول، شرالہ (امراؤتی)

صدائے راہ گذر کو ترس گیا ہوں میں تمہارے ساتھ سفر کو ترس گیا ہوں میں
نہ جانے کیا ہوئی مجھ سے کسی کی حق تلفی لگا کے پیڑ ثمر کو ترس گیا ہوں میں
شجر پہ بیٹھے پرندے اُڑا دیئے تھے کبھی اب اپنے گھر میں بھی گھر کو ترس گیا ہوں میں
حرام روزی کا لقمہ چبا لیا تھا کبھی دعائیں کر کے اثر کو ترس گیا ہوں میں
اُٹھا جو سر سے مرے والدین کا سایہ تو اک شفیق نظر کو ترس گیا ہوں میں
مرے نصیب کو تاریکیوں نے گھیر لیا وہ شب ملی کہ سحر کو ترس گیا ہوں میں
زمیں کے چاند کا دیدار کیا ہُوا شیداؔ تو آسماں کے قمر کو ترس گیا ہوں میں

پہلے ہم خود ہی اگر ہاتھ بڑھانے لگ جائیں ہم کو دشمن بھی کلیجے سے لگانے لگ جائیں
ایک پل میں وہ اُتر آئے نظر سے دل میں اس سفر کے لئے اوروں کو زمانے لگ جائیں
تیرا دامن بھی ستاروں سے منوّر ہوجائے میرے آنسو بھی سلیقے سے ٹھکانے لگ جائیں
اسی امید پہ ماں باپ جیئے جاتے ہیں بیٹی عزت سے اُٹھے، بیٹے کمانے لگ جائیں
وہ خزاں میں بھی جو آجائے چمن میں شیداؔ خشک پودے بھی حسیں پھول کھلانے لگ جائیں

چاندنی جیسا بدن چاندسی صورت اُس کی
اتنی فرصت سے بنایا ہے خدا نے اُس کو
ایک میں ہی تو پرستار نہیں ہوں اُس کا
میں اُسے چھوڑ کے زندہ بھی نہیں رہ سکتا
اُس کی چاہت کا خریدار میں بنتا کیسے

ہر نظر والے کو پڑتی ہے ضرورت اُس کی
تکتا رہتا ہے ہر اک آئینہ صورت اُس کی
ہر دھڑکتے ہوئے دل پر ہے حکومت اُس کی
میری ہر سانس پہ لکھی ہے محبت اُس کی
جان دے کر بھی ادا ہوتی نہ قیمت اُس کی

خود رہ کے مشکلات میں حل دے دیا اُسے
موتی لٹائے میں نے سمندر تھا جب تلک
پتھراؤ جس کا شیوہ، دل آزاری جس کا شوق
وہ اک غریب مجھ سے ملا ، ہوگیا امیر
پوری ہوئی نہ شرطِ محبت تو خواب میں
اس نے کہا کہ حسن کی تعریف کیجئے
اب تا ابد اسی کی حکومت میں ہے، جہاں
شیدآ بہت خلیق ہے کہتے ہیں سارے لوگ

میں وہ شجر خزاں میں بھی پھل دے دیا اُسے
اب جھیل ہوگیا تو کنول دے دیا اُسے
منصف خدا ہے، شیش محل دے دیا اُسے
میں اک فقیر درسِ عمل دے دیا اُسے
بلوایا اور تاج محل دے دیا اُسے
اک شعر جو تھا حسنِ غزل دے دیا اُسے
سب کچھ خدا نے روزِ ازل دے دیا اُسے
رب نے محبتوں کا بدل دے دیا اُسے

قدرت ناظم

قدرت خاں ناظم ابن حمید خاں، ناندورہ　　موبائیل : 09850610556
تاریخ پیدائش : ۱۵؍دسمبر ۱۹۵۰ء
تعلیم : ایچ۔ایس۔ایس۔سی　　"ارتعاش" (شعری مجموعہ زیرِ ترتیب)

ہم کہاں ساز پہ گانے کو غزل کہتے ہیں　　اپنے دکھ درد بھلانے کو غزل کہتے ہیں
ورنہ بے جان سے لفظوں کی حقیقت کیا ہے　　تجھ سے ملنے کے بہانے کو غزل کہتے ہیں
ڈھال کر تجھ کو تخیل کے حسیں پیکر میں　　روح کی پیاس بجھانے کو غزل کہتے ہیں
چھیڑ دیتے ہیں ستانے کیلئے ذکرِ وفا　　روٹھ جائے تو منانے کو غزل کہتے ہیں
آپ کے دل میں اُتر جائے تعجب کیا ہے　　ہم تو رگ رگ میں سمانے کو غزل کہتے ہیں
سرد جذبات میں احساس کی چنگاری سے　　رات دن آگ لگانے کو غزل کہتے ہیں
سخت چٹان یا سنگلاخ زمیں پر ناظم　　پیار کا پھول کھلانے کو غزل کہتے ہیں

دل اُداس ہوتا ہے اس قدر اکیلے میں　　نیند بھی نہیں آتی رات بھر اکیلے میں
نام لب پہ آتے ہی دل دھڑکنے لگتا ہے　　مل گئے تو کیا ہوگا وہ اگر اکیلے میں
رُت حسین تھی لیکن آپ جو نہیں آئے　　کیا بتائیں ہم گذری کس قدر اکیلے میں
رات میرے آنگن میں آکے جب بکھرتی ہے　　سونا سونا لگتا ہے اور گھر اکیلے میں
ہم بھی اندھیرے کے خوف سے نہیں ڈرتے　　چاندنی اگر ہوتی ہمسفر اکیلے میں
جانتے ہیں تنہائی ہم کو راس آئے گی　　لمحہ لمحہ لگتا ہے پھر بھی ڈر اکیلے میں
گاؤں رات میں ناظم سائیں سائیں کرتا ہے　　کون گھر سے نکلے گا جان کر اکیلے میں

دل کے زخموں کو آشکار نہ کر
دامنِ عشق داغدار نہ کر

غیر کے در پہ سر جھکے یارب
مجھ کو اتنا ذلیل و خوار نہ کر

میں اخوت پسند ہوں لیکن
بزدلوں میں مرا شمار نہ کر

ان کی فطرت بدل نہیں سکتی
شر پسندوں کا اعتبار نہ کر

صرف لفظوں کے تیر کافی ہیں
خنجروں کو دلوں کے پار نہ کر

تو اگر شیر ہے تو سامنے آ
چھپ کے خرگوش کا شکار نہ کر

آخرت کی بھی فکر کر ناظمؔ
ٹوٹ کر زندگی سے پیار نہ کر

اپنے سائے سے بدگماں کیوں ہے
آج ہر شخص بے اماں کیوں ہے

زندگی ہے اگر پسِ منظر
منظروں میں دھواں کیوں ہے

کیا ہوا آج خون کے بدلے
آگ دل میں رواں دواں کیوں ہے

زندگی بوجھ ہے تو جینے کا
حوصلہ دل میں نوجواں کیوں ہے

بندگی ہے اگر بتاؤ تو !
عشق میں اس قدر زیاں کیوں ہے

جب کہ میں خوبرو نہیں پھر بھی
آئینہ مجھ سے بدگماں کیوں ہے

متحد ہیں اگر تو پھر اتنا
فاصلہ اپنے درمیاں کیوں ہے

ذرّے ذرّے میں نور ہے اس کا
وہ عیاں ہے تو پھر نہاں کیوں ہے

دل اگر غمزدہ نہیں ناظمؔ
اشک آنکھوں سے پھر رواں کیوں ہے

محمد عبدالکبیر حقی

محمد عبدالکبیر حقی ابن محمد عمر، اچل پور (امراوتی) تاریخ پیدائش : ۱۹۵۰ء
ایم۔اے۔بی۔ایڈ
موظف ایجوکیشن ایکسٹینشن آفیسر

جو شاہوں کو نہیں حاصل وہ جوہر پاس رکھتا ہے
"سکونِ قلب" ہر شہزادۂ افلاس رکھتا ہے

وہ اپنی ذات کو محوِ قنوط و یاس رکھتا ہے
سمندر خود کو کہتا ہے لبوں پر پیاس رکھتا ہے

ہیں تخت و تاج کی خاطر دیارِ کفر کے سجدے
مگر مومن فقط اللہ پر وشواس رکھتا ہے

مسلسل چیختا رہتا ہے، ہم یہ جنگ جیتیں گے
جو ہر لحہ شکستِ فاش کا احساس رکھتا ہے

شرورِ نفس اور خناس پھر بھی غالب آتے ہیں
اگرچہ وہ لبوں پر سورۂ والناس رکھتا ہے

توجہ کو وہی مرکز، وہ تسکینِ نگاہ و دل
وہ سادہ شخص جو کردار کی بُو باس رکھتا ہے

جیو تو اس طرح جیسے وطن کی تم ضرورت ہو
وگرنہ بے ہنر سے کون حقی آس رکھتا ہے

حق پسند حق آشنا ہوجایئے
آپ اپنا آئینہ ہوجایئے

شرط اُن کی آرزوئی کی طرح
اپنی ضد جلوہ نما ہوجایئے

اور کب تک ظلمتوں کا تذکرہ
روشنی کا سلسلہ ہوجایئے

رہبری میں پردہ داری شرط ہے
ایسا کیجے رہنما ہوجایئے

خاک ہونا ہی مقدر ہے تو پھر
خاکِ پائے مصطفےٰ ہوجایئے

ساتھ مہر و خلوص و الفت ہے میرے اسلاف کی امانت ہے

ایک اک لمحہ بیش قیمت ہے صرف احساس کی ضرورت ہے

بیٹیوں کا وجود رحمت ہے ماں کے قدموں کے نیچے جنت ہے

ڈالی ڈالی خزاں رسیدہ ہے بے ثمر نخلِ آدمیت ہے

ایک جانب تضادِ قول و عمل اک طرف منصبِ شہادت ہے

ہر زمانہ مرا وجود شناس ہر صدی پر مری حکومت ہے

متحد ہو، تو سانس لوگے پھر تفرقہ زہر ہے، ہلاکت ہے

تم جو حقیؔ خدا کو بھول گئے بس اُسی کا وبال، ذلت ہے

الجھنوں کا شکار ہیں ہم لوگ یعنی غفلت شعار ہیں ہم لوگ

کر کے سوراخ بادبانوں میں کشتیوں پر سوار ہیں ہم لوگ

کم تھے پھر بھی شمار ہوتے تھے اب فقط بے شمار ہیں ہم لوگ

کوئی ہم پر کرے حکومت کیوں اُخروی تاجدار ہیں ہم لوگ

کوئی ہم کو مٹا نہ پائے گا دینِ حق کا شعار ہیں ہم لوگ

قدیر ایازؔ

سیّد عبدالقدیر ایازؔ ابن سیّد سردار، اکولہ
درجہ ششم
"سلگتے لمحے" (شعری مجموعہ)

تاریخ پیدائش : ۱ر جنوری ۱۹۵۱ء
موبائل نمبر : 8293700628

جب سے تم آ گئے فسانے میں
تذکرہ ہے مرا زمانے میں

آنکھ، دل، روح، منتظر ہے تری
دیر کیوں ہو رہی ہے آنے میں

نور و خوشبو سے گھر ہوا معمور
آ گئے تم غریب خانے میں

بھول جاؤ کہا فقط اُس نے
عمر لگ جائے گی بھلانے میں

برق تو دور ہی سے چمکی تھی
لگ گئی آگ آشیانے میں

ایک ادنیٰ خوشی بھی مل نہ سکی
کیا کمی تھی ترے خزانے میں

اُن کے عیبوں کو جانتا ہوں مگر
وہ بڑے ہے بڑے گھرانے میں

قتل کرتے ہیں چھوٹ جاتے ہیں
کھیل دولت کا ہے زمانے میں

اُس نے دیکھا ہے مسکرا کے ایازؔ
طنز مخفی ہے مسکرانے میں

گمنام کیا کروگے چلو ہم ہی کھو گئے
اوڑھے کفن وفا کا سکوں پا کے سو گئے

سناٹا ہنستا آیا ہے جن کی صداؤں پر
خاموش کرنے والے ہی خاموش ہو گئے

نظریں تلاش کرتی ہے محفل میں اب انھیں
محفل کو سونی چھوڑ کے محفل سے جو گئے

والد جو لَوٹ آئے تو کھانے کو لائیں گے
بچّے اس انتظار میں بھوکے ہی سو گئے

کیسے کہوں ایازؔ غزل کس طرح کہی
ہر لفظ اپنے خون میں ہم تو ڈبو گئے

کی خطا، پر بجا کیا میں نے
تجھ کو جلوہ نما کیا میں نے

خود کو ایسے فنا کیا میں نے
فرض اپنا ادا کیا میں نے

میری دیوانگی بھی دین تری
کب کسی سے گلہ کیا میں نے

بانٹ دی جائیداد بچوں میں
سوچتا ہوں یہ کیا کیا میں نے

راہ کانٹوں بھری تھی منزل کی
عزم سے راستہ کیا میں نے

ایک تو جو بھلائے بیٹھا ہے
یاد تجھ کو سدا کیا میں نے

میری دنیا اُجاڑ دی اُس نے
باغ جس کا ہرا کیا میں نے

تو نے جس حال میں رکھا مجھ کو
شکر تیرا ادا کیا میں نے

کیسے ہوگا برا ایازؔ مرا
کب کسی کا برا کیا میں نے

آنکھ اُن کی نہیں دریچہ ہے
اس دریچہ میں خود کو دیکھا ہے

دل پہ نشتر چلا کے پوچھتے ہیں
حالِ دل اب جناب کیسا ہے

بھوکا سب کو اُٹھاتا وہ لیکن
بھوکا ہرگز نہیں سُلاتا ہے

دوست ہی تذکرہ نہیں کرتے
دشمنوں میں بھی میرا چرچا ہے

وہ غریبوں کو دان کیا کرتا
دھرم ایمان جس کا پیسہ ہے

میری فطرت سے وہ جدا نکلا
یوں تو کہنے کو میرا بیٹا ہے

مہنگا اب تو یہاں ہے پانی تک
خونِ انساں بڑا ہی سستا ہے

تو نے جس کو سمجھ لیا اپنا
تیری نظروں کا صرف دھوکا ہے

بسترِ مرگ پر ہے باپ مگر
بیٹا سسرال جا کے بیٹھا ہے

وہ بڑا دل جلا ہی ہوگا ایازؔ
جوتا بُش پر جو اُس نے پھینکا ہے

कैलाश सेंगर کیلاش سینگر

کیلاش سینگر، اکولہ
موبائیل : 09869132657
ایم۔اے (ہندی ادب) بی۔ایڈ
تاریخ پیدائش : ۱۶ر فروری ۱۹۵۱ء
''آئینہ اور ۱۰۱ چہرے'' ''یہاں آدمی نہیں جوتا چلتا ہے'' (طنز و مزاح) ''صبح ہونے کا انتظار'' (کہانیاں زیر ترتیب)
مدرس آر۔ڈی۔جی ودیا مندر ہائی اسکول اکولہ، ''دھرم یگ'' ''ٹائمز آف انڈیا'' نائب مدیر

جھیل کا درپن روز لجا کر بیل نہارا کرتی ہے
پھر چپکے سے لپٹ پیڑ سے زُلف سنوارا کرتی ہے

بچوں کے کنچوں کی گونجیں ذرا دھیان سے سُن لینا
مندر کی گھنٹی اُن کی ہی نقل اُتارا کرتی ہے

پھل دے دے کر خوش ہولینا جنون پُرانا پیڑوں کا
پر دُنیا ہر پاگل کو پتھر ہی مارا کرتی ہے

لڑکی ہے یا جادوگرنی وہ ہم مورکھ کیا جانیں
جادو سے اپنے ہونٹوں کو جو انگارا کرتی ہے

نظر نہ لگ جائے ماں کو وہ تب سُندر ہو جاتی ہے
جب بھی وہ اپنے بچوں کی نظر اُتارا کرتی ہے

اِن چنّائی راتوں کو اک روشن تیلی توڑے گی
برسوں سے اک صبح ہمارا نام پکارا کرتی ہے

محنت کے بعد بھی ملی نفرت کی روٹیاں
سب کے نصیب میں کہاں عزت کی روٹیاں

آنکھوں سے دیکھنے کی نہیں چیز ماں کا پیار
پر پھر بھی دکھاتی اسے عورت کی روٹیاں

جب جب ہماری بھوک کی یہ آگ جل اُٹھی
وہ سینک گئے اس پہ سیاست کی روٹیاں

ہے سواد اِن کا خوب مگر سچ تو یہی ہے
پچتی نہیں کبھی کو یہ شہرت کی روٹیاں

بیوی سے ہم نے سچ یہ چھپایا ہے عمر بھر
عورت سے بڑی چیز ہے عورت کی روٹیاں

گونگی چیخیں، بانجھ بھوک اور اس بے بس سناٹے میں
ہم نے اپنی غزلیں کھوجی چولہے چوکے آٹے میں

سب پر اک اک صبح لٹانے ہم سورج لے بیٹھے تھے
اپنا کیا ہے، جو نہ آئے وہ ہی رہ گئے گھاٹے میں

مہک اُٹھے تیرے چھونے سے ہم، پر سب کو یہی لگا
چندن کی بھی روح چھپی ہے اس ببول کے کانٹے میں

چور اُچکوں کے جےکاروں سے گونجے اُن کے دَورے
اکثر جیبیں کٹی ہماری اُن کے سیر سپاٹے میں

آزادی کی کھاٹ پہ سوئی کھادی کی اُجلی نیندیں
گاؤں کی دب گئی سسکیاں دِلی کے خراٹے میں

جہاں کہیں بھی کالک دیکھی ہم نے تو بس وار کیا
پر لوگوں کو غزل نظر آتی ہے اپنے چانٹے میں

پرندوں کو شکایت ہے کبھی تو سُن مرے مالک
ترے دانوں میں بھی شاید لگا ہے گُھن مرے مالک

کسی بچے سے میلے میں نہ چھوٹے باپ کی اُنگلی
کبھی ماں بن کے بھی تو اس دعا کو سُن مرے مالک

تجھے بھی کیا پڑی تھی جو بنالی بے رحم دُنیا
اگر پچھتا رہا ہے تُو تو سر کو دُھن مرے مالک

کسی کا سر کھلا ہے، تو کسی کے پاؤں باہر ہیں
ذرا ڈھنگ سے تو اپنی چادروں کو بُن مرے مالک

تجھے بھی دیکھ لیتا تھا گُنی اتنا تھا 'وہ اندھا'
دھرے چت نہ کبھی اس نے ترے اَوگن مرے مالک

چھڑک تیزاب پلکوں پر جگایا رات بھر تُو نے
کسی ماں سے چُرا لے لوریوں کی دُھن مرے مالک

لطیف ثانی

لطیف احمد ثانی ابن عبدالغنی نواب، شے گاؤں (بلڈانہ)　موبائیل : 8446520786
تاریخ پیدائش : ۹ رمارچ ۱۹۵۱ء　گریجویشن
سہ ماہی ''کاوش''، ''عقاب'' ہفت روزہ نائب مدیر، ''سنگلاخ زمینوں کا مسافر'' (سوانح ڈاکٹر کلیم ضیاء)

میں چپ رہوں تو بھی اندر پکارتا ہے کوئی
مرے غرور کی پگڑی اُتارتا ہے کوئی

میں جب بھی ماں کے تصور میں ڈوب جاتا ہوں
نظر کے سامنے بانہیں پسارتا ہے کوئی

مرے عمل سے مقدر اگر بگڑ جائے
خدا کے فضل سے قسمت سنوارتا ہے کوئی

عجیب شخص ہے ہر بار جیت جاتا ہے
کہ جیت کر بھی زمانے میں ہارتا ہے کوئی

تمام دن تو گزرتا ہے غم کی چوکھٹ پر
کہ چھت سے رات میں تارے شمارتا ہے کوئی

ملی ہے زندگی مل جل کے ساتھ رہ لیتے
تمام عمر کیوں تنہا گزارتا ہے کوئی

لبوں پہ ذکرِ خدا میں سجائے رکھتا ہوں
میں ڈوب جاؤں تو مجھ کو اُبھارتا ہے کوئی

ہر ایک راہ منوّر دکھائی دے ثانی
ترے وجود کا صدقہ اُتارتا ہے کوئی

مومن بنے تو قوم کا رہبر بنا دیا
اَن پڑھ، گنوار کو بھی گورنر بنا دیا

جس کا بھی اتباعِ نبیؐ کا مزاج ہو
اس کو خدا نے جیسے سکندر بنا دیا

احسان میرے رب کا ہُوا مجھ پہ اس طرح
مومن بنا کے میرا مقدر بنا دیا

تاریخ ہے گواہ جہالت کے دَور میں
سب سے بُری جو قوم تھی، بہتر بنا دیا

آیا سمجھ میں جب سے کوئی مقصدِ حیات
شاہوں نے اِک چٹائی کو بستر بنا دیا

تری یلغار سے دنیا بھی دہل سکتی ہے
تو بدل جائے تو ہر چیز بدل سکتی ہے

ایک عفریت کہ شعلوں کو نگل سکتی ہے
بند ہے نیام میں تلوار نکل سکتی ہے

تیرے اعمال زمانے میں ہے ایسے پیارے
جن سے اسلاف کی پگڑی بھی اچھل سکتی ہے

دینِ حق کیلئے ناموسِ شریعت کیلئے
یہ وہ ملّت ہے کہ شعلوں میں بھی چل سکتی ہے

عسکری قوم ہے فطرت میں جدل باقی ہے
اس کو چھیڑو نہ یہ انداز بدل سکتی ہے

اپنی تاریخ کے اوراق کھنگالو ثاقی
اب کہاں قوم کھلونوں سے بہل سکتی ہے

ایک پتھر ہے مگر آئینہ خانے کتنے
ایک دیوانہ لگائے گا نشانے کتنے

صرف اِک تم ہی نہیں اور نہ جانے کتنے
لوگ بن جاتے ہیں اُلفت میں دِوانے کتنے

عشق میں لوگ بناتے ہیں بہانے کتنے
ایک دل ہے مگر ہیں اس کے فسانے کتنے

مَیں نے اِک بار ترا جلوہ حسیں دیکھا ہے
اس ملاقات کو گذرے ہیں زمانے کتنے

محمد سلیم نشتر

محمد سلیم نشتر ابن عبدالحبیب قریشی، کھام گاؤں (بلڈانہ)
بی۔کام
تاریخ پیدائش : ۳؍ستمبر ۱۹۵۱ء
طبابت ہومیوپیتھی

وقت کے خداؤں میں کیسی ہوشیاری ہے
بھیس ہیں امیروں کے ذہنیت بھکاری ہے
خود بخود نہیں حائل نفرتوں کی دیواریں
کچھ خطا تمہاری تھی، کچھ خطا ہماری ہے
لاکھ میں شہادت دوں، کوئی کیوں یہ مانے گا
شمس نے مرے گھر میں تیرگی اُتاری ہے
کرلیا سبھی نے طے مجھ کو تو رُلانے کا
اک ہنسی پہ میری تو سب کو بیقراری ہے
قہقہے ہوں آنسو ہوں چاہے سکھ ہوں یا دُکھ ہوں
میری جھونپڑی مجھ کو ہر طرح سے پیاری ہے
دشمنوں کی محفل میں لے چلا مجھے یہ دل
مجھ پہ 'اے خدا' کیسی بے بسی یہ طاری ہے
اک ذرا سا غم نشتر کیوں بھلا نہ راس آیا
پھول نے تو کانٹوں میں زندگی گذاری ہے

الٰہی توبہ دنیا میں یہ کیسا انقلاب آیا
یہاں کوئی نہیں اپنا عزیزوں کا جواب آیا
مرے نظارۂ پُر شوق کی تکمیل کیا ہوتی
اِدھر پلکوں نے جنبش کی اُدھر رُخ پر نقاب آیا
اسی کی دید کی خاطر رہی ہیں منتظر آنکھیں
جو فتنہ گر رُخِ پُر نور پر ڈالے نقاب آیا
خموشی ہی فقط ہے داستاں اپنی دلِ مضطر
فریبِ زندگی کھایا الم بھی بے حساب آیا
وہ اظہارِ محبت پر مرے گھبرا کے یوں بولے
فلک نے کیا ستم ڈھایا خدایا کیا عذاب آیا
جلن سے غیر کے چہرے کی رنگت اُڑ گئی نشتر
ابھی خالی ہمارے ہاتھ میں جامِ شراب آیا

اس کے رنگ میں رنگی گذر جائے زندگی پھر مری سنور جائے

''زندگی موت کی امانت ہے'' پھر بھلا کوئی کیوں مکر جائے

زندگی اِک دھویں کا مرغولہ جب ہَوا تیز ہو بکھر جائے

اُس نے معراجِ زندگی پائی جو خدا کی رضا میں مر جائے

''مستحق لوگ'' ہاتھ ملتے ہیں اور گداگر کی جھولی بھر جائے

گر ہدایت نہ ہو تری مجھ کو تیرا دیوانہ پھر کدھر جائے

یہ علامت بھی ہے منافق کی وعدہ کر کے بھی جو مکر جائے

زندگی زندگی نہیں نشترؔ جو فقط کھیل میں گذر جائے

سر سے باندھے کفن نکلتا ہوں گود میں موت کی مَیں پلتا ہوں

راستہ ہر گھڑی بدلتا ہوں میں ندی کی طرح مچلتا ہوں

بھول جاتا ہوں سب ستم ان کے اک تبسم سے میں بہلتا ہوں

وہ تو ملتے نہیں ہیں مل کے بھی ہجر کی آگ میں مَیں جلتا ہوں

تو ہی ہمراہ میرے در پردہ ورنہ گر کے میں کیوں سنبھلتا ہوں

چال وہ چل گئے قیامت کی بیکسی پر میں ہاتھ ملتا ہوں

درد سے کہہ رہا ہے یہ نشترؔ تُو اب آرام کر مَیں چلتا ہوں

غلام ربانی نعیم

غلام ربانی نعیم ابن غلام عباس، بالاپور (اکولہ)

تاریخ پیدائش: ۹/ اکتوبر ۱۹۵۱ء وفات: ۳۰/ جنوری ۲۰۰۸ء

بی۔ایس۔سی (اے جی) ڈائریکٹر مہندرا ہائی برید سیڈس کمپنی جالنہ

"مشکِ ختن" (شعری مجموعہ)

زخم دیتی رہی ہے ذات نئے　　گل کھلاتی رہی حیات نئے

دن روایات کا اسیر رہا　　خواب دیکھے ہر ایک رات نئے

رہنما کس کو چن لیا تم نے　　پیش آئیں گے واقعات نئے

دوستی رسم یا رواج نہیں　　آئے دن کیوں تکلفات نئے

آپ کھو بیٹھے اعتبار اپنا　　کیا کروں میں یہ کاغذات نئے

آج ہم فیصلوں کو کیوں ٹالیں　　کل نیا دن ، مقدمات نئے

تجھ سے ملنے کے بعد خود سے ملا　　مجھ سے میرے تعلقات نئے

تجربے آپ کیجئے صاحب !　　ہم کریں گے مشاہدات نئے

شاعری آپ کی نعیم ہے کیا !　　طرزِ کہنہ مگر نکات نئے

ریت کا ڈھیر عمارت میں بدلنا چاہا　　میں نے ہر خواب حقیقت میں بدلنا چاہا

پہلے آئی مری تنہائی کی ساتھی بن کر　　پھر تری یاد نے وحشت میں بدلنا چاہا

پیار کی روح سے محروم ہے وہ دل جس نے　　اپنی فطرت کو ضرورت میں بدلنا چاہا

دیکھ دیرینہ روایات کا نازک شیشہ　　ٹوٹ جائے گا جو عجلت میں بدلنا چاہا

گھر کے بگڑے ہوئے نقشہ پہ نہ ماتم کیجے　　فرش کو آپ نے خود چھت میں بدلنا چاہا

آپ رائی کا جو پربت نہ بنائیں تو کہوں　　میں نے نفرت کو محبت میں بدلنا چاہا

سوئے ارمانوں کو جگایا کس کی حُسن آرائی نے
کس کے پرتو سے روشن ہیں دل کے دھندلے آئینے
محفل محفل کیوں نہ تمھارے تیر نظر کا چرچا ہو
کتنی دعائیں دیں ہیں دل کے زخموں کی گہرائی نے
میں جس جانب بھی مڑتا ہوں ان کو سامنے پاتا ہوں
سارے پردے توڑ دیئے ہیں اس دل کی بینائی نے
دل کے صحرا سے پھر گذرا قافلہ ان کی یادوں کا
کیسے کیسے جشن منائے آج مری تنہائی نے
نادانی میں ڈوب مرے جو اُن کا رنج بھلا کس کو
لیکن جن کو قتل کیا ہے خود اپنی دانائی نے
کچھ تو نعیمؔ اس گلشن کی اب اہلِ زباں بھی فکر کریں
جس کو سنوارا میرؔ و انیسؔ و غالبؔ اور میناؔئی نے

غم سے کس نے نجات پائی ہے
ہنس کے جی لو تو کیا برائی ہے
بات یہ اب سمجھ میں آئی ہے
خامشی میں بڑی بھلائی ہے
ہم ہیں رونق بڑھانے والوں میں
انجمن آپ نے سجائی ہے
زندگی دور دور ہے ایسے
جیسے اپنی نہیں پرائی ہے
آندھیوں کو کوئی خبر کر دے
ہم نے اک شمع پھر جلائی ہے
اب اسی کو بھلا سمجھ لیجے !
نسبتاً جس میں کم برائی ہے
جب بھی ہم سے نظر ملی ہے نعیمؔ
''موت شرما کے مسکرائی ہے''

سکندر عرفانؔ

محمد سکندر عرفانؔ حمید ابن غلام حیدر، اچل پور (امراوتی)   تاریخ پیدائش : ۱۴ر اپریل ۱۹۵۲ء
پوسٹ گریجویٹ
"زخمی آواز" "سمٹتے دائرے" (شعری مجموعہ)

بچے بھولی بھالی باتیں کرتے ہیں ۔۔۔ روشن مستقبل کی باتیں کرتے ہیں
جانے کب آئے گا موسم گیتوں کا ۔۔۔ سوکھے پیڑ پہ پنچھی باتیں کرتے ہیں
ویراں ویراں اُجڑا اُجڑا شہرِ وفا ۔۔۔ لوگ یہاں کے روکھی باتیں کرتے ہیں
مہکائیں گے ہم بھی اک دن ویرانہ ۔۔۔ خارِ مغیلاں کیسی باتیں کرتے ہیں
ٹوٹ کے مجھ سے ملتے ہیں جب یار مرے ۔۔۔ پہلے وہ بھی رسمی باتیں کرتے ہیں
زہر کا ساگر پینے والے گہرے لوگ ۔۔۔ میٹھی پیاری پیاری باتیں کرتے ہیں
لوگ ہیں اگلے وقتوں کے عرفانؔ سنو ۔۔۔ یہ جو بھولی بسری باتیں کرتے ہیں

پیاس، خالی گلاس، تنہائی ۔۔۔ ہائے اتنی اُداس تنہائی
تجھ سے مل کر ہی دل بہل جائے ۔۔۔ آ "ذرا" میرے پاس تنہائی
بس کے میری اُداس آنکھوں میں ۔۔۔ ہوگئی محوِ یاس تنہائی
ان کی یادیں پہن کے آئی ہیں ۔۔۔ مہکا مہکا لباس تنہائی
اپنی آغوش میں مجھے لے لے ۔۔۔ تو تو ہے غم شناس تنہائی
تیرے اشکوں سے بجھ نہ پائے گی ۔۔۔ میری صدیوں کی پیاس تنہائی
جب بھی عزمِ سفر کیا عرفانؔ ۔۔۔ رو پڑی بدحواس تنہائی

اس شہرِ بے چراغ میں دو چار ہم ہی ہیں
رہتے ہیں وہ جو صورتِ انوار ہم ہی ہیں

کچھ اس نظر سے لوگ ہمیں دیکھنے لگے
جیسے کہ آج صبح کا اخبار ہم ہی ہیں

کل تک تمھاری آنکھ کے تارے بھی ہم ہی تھے
اور آج ان میں چبھتے ہوئے خار ہم ہی ہیں

جو ناخدائے وقت تھے ساحل سے جا لگے
موجوں سے اب بھی برسرِ پیکار ہم ہی ہیں

قربانیاں ہماری کوئی دیکھتا نہیں
ان کی نظر میں آج بھی غدّار ہم ہی ہیں

قائم ہے اس سے اپنی حدوں کا وقار آج
دونوں کے بیچ شیشہ کی دیوار ہم ہی ہیں

عرفانؔ ہم کو وقت نے پامال کر دیا
تہذیبِ نَو کے دوستو معمار ہم ہی ہیں

یہ مصلحت ہے حقیقت کو خواب لکھنا ہے
رُخِ سیہ کو یہاں آفتاب لکھنا ہے

مہک رہی ہیں کئی جن میں پھول کی یادیں
مجھے کچھ ایسے خطوں کے جواب لکھنا ہے

ذلیل و خوار تھے کل تک جو وقت کے ہاتھوں
یہ حکم ہے انھیں عزّت مآب لکھنا ہے

صدی کے چہرے پہ بکھرا ہے جو لہو اپنا
اسی لہو سے مجھے انقلاب لکھنا ہے

لگے ہیں داغ جو انسانیت کے دامن پر
جبینِ وقت پہ ان کا حساب لکھنا ہے

کبھی جو دیکھا تھا میری اُداس آنکھوں نے
تمھارے نام وہی ایک خواب لکھنا ہے

چراغِ فکر سے عرفانؔ روشنی لیکر
کتابِ شب کا مجھے انتساب لکھنا ہے

سیّد الیاس فانی

سیّد الیاس فانی ابن سیّد اسحٰق، اکولہ — تاریخ پیدائش: ۲۳ر ستمبر ۱۹۵۳ء
انٹرمیڈیٹ — تجارت

دریا دلی کی دُھن کے میں آیا تھا آس میں
دو گھونٹ بھی ملے نہ سمندر کے طاس میں

پیرِ مغاں کا نام نہ بدنام ہو کہیں
جتنی ہو آج ڈال دے ساقی گلاس میں

عزّت سے ہے وقار زمانے میں دوستو
عزّت نہیں تو کچھ نہیں بشری اساس میں

مشکل میں حوصلوں کا سہارا اگر نہ ہو
آتا نہیں شعور دلِ بدحواس میں

اپنائیت، خلوص، وفا، ربطِ باہمی
سب کچھ ملے گا تم کو غریبوں کے پاس میں

فانی دبا نہ سوزشِ قلب و جگر کو یوں
چنگاریاں چھپاتا ہے کوئی کپاس میں؟

اپنی آنکھوں کو نم کریں کیسے
لذّتِ درد کم کریں کیسے

جو تسلّی بھی دے نہیں سکتے
ان سے اظہارِ غم کریں کیسے

ان کی فطرت میں بے وفائی ہے
پھر وہ ہم پہ کرم کریں کیسے

حسنِ مغرور کی اداؤں پر
دل کو قربان ہم کریں کیسے

جن پہ ہے وقت نے ستم ڈھائے
وہ کسی پہ ستم کریں کیسے

جن کے معنی ہی کچھ نہیں ہوتے
ایسے الفاظ ضم کریں کیسے

موت آنی ہے ایک دن فانی
آج ہی اس کا غم کریں کیسے

مل کے رہتا ہوں سدا چاروں کے ساتھ
بے وفائی کیا کروں یاروں کے ساتھ

کون محسن ہے پتہ چل جائے گا
مل کے بیٹھو گے جو تم یاروں کے ساتھ

قتل ساحل پر ہُوا شاید کوئی
بہہ رہا ہے خون بھی دھاروں کے ساتھ

آبرو کی پاسبانی شرط ہے
ہے گلوں کی زندگی خاروں کے ساتھ

داغِ دل، داغِ جگر روشن ہوئے
ہیں فروزاں چاند اور تاروں کے ساتھ

ان سے امیدِ وفا فانی نہ کر
کیسی ہمدردی جفا کاروں کے ساتھ

اُس سے پہچان ہوگئی ہوگی
زیست آسان ہوگئی ہوگی

زندگی بے وفا ازل سے ہے
دشمنِ جان ہوگئی ہوگی

آج وہ یار بن گئے گہرے
جان پہچان ہوگئی ہوگی

اس سے جب عرضِ حال تم نے کی
سُن کے حیران ہوگئی ہوگی

گفتگو کر رہے تھے بے موقع
بات بے جان ہوگئی ہوگی

زیست فانی خوشی کی چاہت میں
غم کا عنوان ہوگئی ہوگی

شریفؔ ساجدؔ

شریف احمد ابن عبدالغنی، شے گاؤں (بلڈانہ) — تاریخ پیدائش : ۱۱؍مئی ۱۹۵۳ء
میٹریکیولیشن — آرکیٹیکٹ
"متاعِ رنج والم" (غزلیات وقطعات)

تیرے دیوانے بھی کام لئے پھرتے ہیں
اپنے محبوب کا پیغام لئے پھرتے ہیں

تیرے عاشق ترے گلفام لئے پھرتے ہیں
اپنے ہونٹوں پہ ترا نام لئے پھرتے ہیں

اُن کی تصویر کی کیا ہم کو ضرورت یارو
جن کو سینے میں ہر اک شام لئے پھرتے ہیں

اپنے ہاتھوں سے پلائینگے سنا ہے جب سے
ہم تصور میں وہی جام لئے پھرتے ہیں

تیز بارش ہو کہ سردی ہو یا گرمی ساجدؔ
ہم تو بس دعوتِ اسلام لئے پھرتے ہیں

دیکھ پچھتائے گا نادان ذرا ہوش میں آ
چار ہی دن کا ہے مہمان ذرا ہوش میں آ

کر کے اغیار کی رسموں کی صریحاً تقلید
خود کو کہتا ہے مسلمان ! ذرا ہوش میں آ

اپنے اسلاف کے کردار بھلانے والے
کتنی اونچی تھی تری شان ذرا ہوش میں آ

بکریاں جن کو چرانی بھی نہیں آتی تھیں
بن گئے کیسے وہ سلطان ذرا ہوش میں آ

دینِ حق کی نہیں کر پایا حفاظت تو پھر
شہداء پکڑیں گے گریبان ذرا ہوش میں آ

ہے ابھی وقت سنبھلنے کا سنبھل جا ساجدؔ
تیرے ہاتھوں میں ہے قرآن ذرا ہوش میں آ

نگاہیں سب کی ہیں شاہین کی اُڑانوں پر
شعور والے پرندے ہیں بس نشانوں پر

ہنسی بھی آتی ہے سرکار کے بہانوں پر
کہیں نماز پہ پہرا کہیں اذانوں پر

جوان جن بھی گھروں میں شعور والے ہیں
لگائی جاتی ہے پابندی اُن گھرانوں پر

بنے ہوئے ہیں جو زینت تمام گلشن کی
گرے گی بجلی فقط ایسے آشیانوں پر

کئی دلوں کو پہنچتی ہے ٹھیس تب ساجدؔ
لگائے جاتے ہیں اِلزام جب جوانوں پر

درد ، رنج و الم رہ گئے
دوستوں کے کرم رہ گئے

بانٹ دی ہم نے خوشیاں تمام
صرف دامن میں غم رہ گئے

کر گیا وار مِل کر گلے
سادگی میں ہی ہم رہ گئے

اب نہ چھیڑو ہمیں دوستو !
اشک آنکھوں میں کم رہ گئے

زندگی دوستی اور وفا
بس بھرم ہی بھرم رہ گئے

داستاں سُن کے ساجدؔ مری
آپ کیوں چشمِ نَم رہ گئے

ایڈوکیٹ منظور ندیم

منظور حسین ندیم ابن غلام حسین رازؔ، بالاپور (اکولہ) تاریخ پیدائش : یکم جولائی ۱۹۵۳ء
ایم۔اے۔ایل۔ایل۔بی موبائیل : 7620519198
رٹائرڈ ڈسٹرکٹ جج و ایڈیشنل سیشن جج
''دھوپ کا درخت'' شعری مجموعہ ۲۰۱۴ء

تھا سرد سا کسی کے جوابات کا بدن
تنہا خلا ہے میرے سوالات کا بدن

بچ بچ کے صبح و شام کی تازہ ہواؤں سے
بیمار ہوگیا ہے روایات کا بدن

اس سال معجزہ یہ عجب رونما ہوا
سوکھا دکھائی دیتا ہے برسات کا بدن

چھو اس کو اے اسیرِ تمنا ادب کے ساتھ
نازک بہت ہے ان کی عنایات کا بدن

پتھر سا سخت اس کا رویّہ ہے اے ندیم
پھولوں سا نرم ہے میرے جذبات کا بدن

برس کے دشتِ تمنا پہ بادلوں کی طرح
گزر گیا کوئی خوشبو کے موسموں کی طرح

ہیں وہ خطوط بھی تیرے خلا نہیں پایا
گرے تھے شیشۂ دل پر جو پتھروں کی طرح

ترا پڑوس بھی پا کر نہ کھل سکی قسمت
پڑی ہے بند ترے گھر کی کھڑکیوں کی طرح

ہے پُر کشش بھی بہت، راس بھی نہیں آئی
یہ زندگی بھی ہے خوش رنگ آنچلوں کی طرح

عجیب کرب تھا اس سال بارشوں میں ندیم
کسی کی یاد ٹپکتی رہی چھتوں کی طرح

نکھارتی رہی یلغارِ سنگ، کیا کرتے
ہم اپنا حلقۂ احباب تنگ کیا کرتے

مزاج پایا تھا گھل مِل کے سب میں رہنے کا
جُدا تھا سب سے مگر اپنا رنگ کیا کرتے

نہ تیتروں نہ بٹیروں سے ہم اُلجھ پائے
تھے اپنے آپ سے مصروفِ جنگ کیا کرتے

اسے تھا شوق بہت آسمان چھونے کا
پہ کٹ گئی تھی ہماری پتنگ کیا کرتے

زمانہ دے گیا تمغات چاپلوسوں کو
ہم ایسے دشتِ انا کے ملنگ کیا کرتے

اک عمر بعد ہُوا وقت مہرباں تو ندیمؔ
نہ آرزو تھی نہ دل میں اُمنگ کیا کرتے

نہ خانقاہوں کے سائے، نہ تاج و تخت مجھے
عطا ہُوا ہے فقط دھوپ کا درخت مجھے

وہ سنگدل، پہ ملائم سا ہے دمِ گفتار
مَیں نرم دل ہوں، پہ لہجہ مِلا کرخت مجھے

تمام عمر کی محنت پہ پھیر دے پانی
دکھائے آنکھ جب اپنے جگر کا لخت مجھے

مرے نصیب کی تاریکیوں سے کم واقف
سمجھ رہی ہے یہ دنیا ستارہ بخت مجھے

قدم قدم پہ ہے یاروں کو سیم و زر کی تلاش
دعا بزرگوں کی اپنے سفر کا رخت مجھے

ہری بھری ہے بہت فصلِ فکر و فن میری
یہ اور بات زمینیں ملی ہیں سخت مجھے

दत्ता साग़र دتا ساغر

چارودت شری رام شیرڑ کے (دتا ساغر) ابن نام دیو شیرڑ کے، کھامگاؤں (بلڈانہ)
تاریخ پیدائش : ۱۹۵۳ء موبائیل : 9763985001
"اشک مسکرا اُٹھے" (شعری مجموعہ ۲۰۰۱ء)

لڑکھڑاتے قدم ہیں اور میں ہوں
بس ستم پہ ستم ہیں اور میں ہوں

دل کی محفل میں اب رکھا کیا ہے
رقصِ پیہم ، الم ہیں اور میں ہوں

دیر و کعبہ تمھیں مبارک ہو
ان کے نقشِ قدم ہیں اور میں ہوں

کتنی صدیاں گذر گئیں لیکن
وہی ظلم و ستم ہیں اور میں ہوں

اک ترا درد ہی نہیں تنہا
ایسے کتنے ہی غم ہیں اور میں ہوں

میری خاطر تو کیوں پریشاں ہے
ساتھ تیرے کرم ہیں اور میں ہوں

جانے ساقی کی آرزو کیا ہے
خم و ساغر ہیں سم ہیں اور میں ہوں

دیئے ماٹی کے نہیں دل کے جلا کرتے تھے
کبھی اس ملک میں انساں بھی رہا کرتے تھے

اب تو ڈستے ہوئے سناٹے ہیں بس دور تلک
گوشے گوشے میں جہاں جشن ہُوا کرتے تھے

بے سہاروں کی قطاروں میں انھیں دیکھا ہے
کبھی جو ہاتھ ستاروں کو چھوا کرتے تھے

یہ اجنتا ، یہ حسیں تاج خبر دیتا ہے
پتھروں میں بھی یہاں چاند کھلا کرتے تھے

کیسے آتی نہ اثر لے کے فلک سے ساغر
لوگ ہونٹوں سے نہیں دل سے دعا کرتے تھے

ابھی ادھورے ہیں گیت میرے ابھی ادھوری سی داستاں ہے
نہ چاند نکلا نہ تارے دمکے نہ مسکراتی وہ کہکشاں ہے
ابھی تو ہونٹوں پہ آہ سی ہے، ابھی بھی کچھ نگاہ سی ہے
ابھی تو ہر سو خموشیاں ہیں، ابھی تو ہر سو دھواں ہے
ابھی تو راہوں میں پیچ وخم ہیں کہ حادثے بھی قدم قدم ہیں
ابھی تو باقی کئی ستم ہیں، ابھی تو باقی کچھ امتحان ہے
ابھی تو قوسِ قزح کے جیسے ہیں خواب بننے حسین کتنے
وہ پھول بھی تو ابھی ہیں چننے ازل سے جن کی مہک رواں ہے
ابھی تو رب کی بھی بندگی پر لگے ہیں دیر وحرم کے پہرے
ابھی تو کعبۂ دل کا ساغر ترے بشر کو پتہ کہاں ہے

یاروں کی یاریاں ہیں سلامت تو مرحبا
ہوتی رہے جو روز قیامت تو مرحبا
ہم کو جہان بھر کے الم بھی چلو قبول
بس آپ کی رہے جو عنایت تو مرحبا
ویسے مجھے یقین ہے پھر بھی مرے اے دوست
تیرا بھی گر خدا ہے محبت تو مرحبا
دیوانہ کر گئی ہیں تری مسکراہٹیں
یہ بھی اگر ہے تیری شرارت تو مرحبا
نازک لبی سے آپ کی انکار تو نہیں
لہجے میں بھی ہو تھوڑی لطافت تو مرحبا

عبدالستار دانشؔ

عبدالستار دانشؔ ابن عبدالرحمٰن، اچل پور
تاریخِ پیدائش: ۱۰ جنوری ۱۹۵۴ء
تعلیم: ایم۔اے۔بی۔ایڈ
موبائیل: 7620519198
موظف مدرّس رحمانیہ ہائی اسکول و جونیئر کالج، اچل پور

زیست کب اختتام تک پہنچی صرف مٹی مقام تک پہنچی
زندہ رہنے کو تھا حلال بہت پھر بھی دنیا حرام تک پہنچی
سرکشی کے نصیب میں پتھر بندگی فیضِ عام تک پہنچی
مسئلہ صرف کرسیوں کا تھا بات بابر سے رام تک پہنچی
کام آتی تھی مشکلوں میں کبھی دوستی اب سلام تک پہنچی
پردہ اُٹھتے ہی گھر کی زینت بھی کیسے کیسے مقام تک پہنچی
میکدہ تو کھلا رہا دانشؔ تشنگی خود نہ جام تک پہنچی

سجدے میں تو ضرور یہ سر دیر تک رہا رزقِ حرام کا بھی اثر دیر تک رہا
ہر گوشۂ بدن پہ سحر دیر تک رہا آنکھوں سے گفتگو کا اثر دیر تک رہا
سچائی پر سزا تھی یہاں جھوٹ پر وہاں عالم میں کشمکش کے بشر دیر تک رہا
ترکِ تعلقات سے سُلجھا نہ مسئلہ بے چین وہ اُدھر، یہ اِدھر دیر تک رہا
افسوس مستفیض مسافر نہ ہو سکے حالانکہ وہ شریکِ سفر دیر تک رہا
تاریکیاں حسد کی ہی محروم رہ گئیں روشن خلوص کا تو قمر دیر تک رہا
پیغامِ حق سُنیں کہ سُنیں نفس کی صدا دانشؔ بھی ہو کے زیر و زبر دیر تک رہا

نقش ہے ہر ظلم جس کا وادیٔ کشمیر پر
اُس نے دہشت گرد لکھا امن کی تصویر پر

کاہلی کی لگ گئی دیمک ہر اک تدبیر پر
اکتفا کر کے وہ شاید رہ گیا تقدیر پر

تیز رکھنا دھار اپنے حوصلے کی ہر گھڑی
منحصر ہے زندگی کی جنگ اس شمشیر پر

رکھ توازن کچھ تو واعظ تو' بھی قول و فعل میں
لوگ گرویدہ نہیں ہوتے فقط تقریر پر

تین سو تیرہ کے جیسے شرط ہیں اوصاف بھی
فتح ناممکن ہے خالی نعرۂ تکبیر پر

کیسے دستک دے بھلا کوئی خوشی در پر مرے
جب غموں کا سانپ آ کر چڑھ گیا زنجیر پر

کھل اُٹھا ہر ایک دانشؔ غنچۂ اہلِ سخن
خونِ دل چھڑکا جو ہم نے گلشنِ تحریر پر

رکاوٹ راستے کی میل کا پتھر نہیں ہوتا
نظر منزل پہ ہو تو فاصلوں کا ڈر نہیں ہوتا

قلعہ ایمان کا مضبوط ہو تو سر نہیں ہوتا
خدا سے ڈرنے والوں کو کسی کا ڈر نہیں ہوتا

بھٹکتی ہے خوشی خانہ بدوشی کی طرح در در
جہاں میں مستقل اُس کا کہیں بھی گھر نہیں ہوتا

فقط اعمال اور کردار پر ہیں منحصر رُتبے
کما کر مال و دولت آدمی برتر نہیں ہوتا

غریبی ملک میں پھیلی ہوئی کیسے دکھائی دے
سیاسی عینکوں میں دُور کا نمبر نہیں ہوتا

رسد آتی نہیں دانشؔ کبھی جنگِ مقدر میں
بشر تنہا ہی لڑتا ہے کوئی لشکر نہیں ہوتا

عارج میرؔ

عارج میرؔ، ورودڈ (امراؤتی)
تاریخ پیدائش: ۲۲ فروری ۱۹۵۴ء
ایم۔اے۔بی۔ایڈ
ملازمت: لکچرر سمبھاجی گرلز کالج ورودڈ امراؤتی

''تانک جھانک'' (طنز و مزاح)
''ناشنیدہ'' (شعری مجموعہ)

بس گئی آ کے آنکھوں میں شامِ عدن
جگمگاتے بدن رنگ رخ پیرہن

سہمی سہمی کرن سبز اخلاق کی
کھردرے پیڑ بے برگ ہلکی چبھن

سرسراتی ہوئی ریت کرتی ہے چھیڑ
کسمسانے لگے سیپیوں کے بدن

خشک آوارہ پھرتا ہوا گرد باد
منتشر راہ میں شور زاغ و زغن

دھوپ رنگولیوں میں بھرے روشنی
جگمگاتا ہوا آرزو کا چمن

سرکشی وسعت و پہنائی تک
قربتیں صرف پذیرائی تک

سطح در سطح بدن روشن ہے
کون پہنچا تری رعنائی تک

مچھلیں تیرتی ہیں سیمابی
دھوپ کی یورشِ بینائی تک

پو پھٹی رات مگر آنکھوں میں
سلوٹیں ذات کی گہرائی تک

شام' خوشبوئیں' نشہ اور نغمہ
اور پھر کھو گئی بینائی تک

جو ناشنیدہ رہے لفظ آج بولیں گے
شگوفہ ہائے تخیل زبان کھولیں گے

بلند ٹیلے ابھی درمیان پردہ ہیں
ہوا اِک آئیگی سب اس کے ساتھ ہو لیں گے

قدیم اونچی عمارات پر نصب کتبے
زمیں پہ آئیں تو سوچوں میں قند گھولیں گے

نہ حادثات کی چادر سے ڈھک سکے اسباب
پرند جا کے بلندی پہ بھید کھولیں گے

جہاں پہ چھاؤں ہے آسیب ڈیرا ڈالے ہیں
نہ دھوپ چھوڑ کہ وہ سائے میں پرولیں گے

بدن پہ گھاس ہری قرب کی اُگاتا ہے
یہ نیل روز نئے سامری بلاتا ہے

ہماری پیاس بھی ہے بھید کھولنے والی
وہ پانیوں کو سیہ ریت میں چھپاتا ہے

ہرن کی آنکھ میں پھیلا ہرا بھرا جنگل
دہکتی دھوپ پہ کلکاریاں لگاتا ہے

سکوں کی اُور جھپٹتی ہیں بوڑھی چیلیں پھر
نکیلی کرچیاں ہر راستہ اُگاتا ہے

گرفتیں خشک ہوئیں اور پھسلنیں شاداب
شکستہ صورتیں ہر آئینہ دکھاتا ہے

ارشاد احمد ارشدؔ

ارشاد احمد ارشدؔ ابن مشتاق احمد، بڈنیرہ (امراؤتی)　　تاریخ پیدائش: ۲۳؍جون ۱۹۵۴ء
ایم۔اے۔بی۔ایڈ۔پی۔ایچ۔ڈی　　موبائیل: 9881062119
موظف مدرّس۔آفیسر برائے توسیع تعلیم

سب کو دکھلاؤں گا ہُنر اپنا　　چھوڑ جاؤں گا مَیں اثر اپنا
ہے کٹھن راہ سے گذر اپنا　　ختم ہوتا نہیں سفر اپنا
پھول اُس کے ثمر بھی ہیں اُس کے　　ہے لگایا ہُوا شجر اپنا
میرؔ و غالبؔ جدھر سے گذرے تھے　　ہے اُسی راہ سے گذر اپنا
بیقراری کی کیفیت ہے اُدھر　　دل بھی بے چین ہے اِدھر اپنا
وہ کسی اور کا ہُوا ارشدؔ　　جس کو سمجھے تھے عمر بھر اپنا

اے مورّخ! ملک کی تصویر لکھ　　چل رہے ہیں نفرتوں کے تیر لکھ
جاہلوں کی عزّت و توقیر لکھ　　عالم و فاضل کی ہے تحقیر لکھ
بے گناہوں کی کوئی تقصیر لکھ　　پاؤں میں ڈالی ہوئی زنجیر لکھ
کوششِ پیہم عمل تدبیر لکھ　　تیرے ہاتھوں میں نہیں تقدیر لکھا
بے حسی ارشدؔ میاں اچھی نہیں　　ذہن پر احساس کی زنجیر لکھ

ہنس کے سہہ لیں گے رنج والم دیکھنا   مشکلوں میں بھی ثابت قدم دیکھنا
دوستو ! حوصلے ہوں نہ کم دیکھنا   راستوں کے ذرا پیچ و خم دیکھنا
بہہ رہا ہے جو دریائے جبر و ستم   پار کر جائیں گے یہ بھی ہم دیکھنا
اِک تغیّر زمانے کو دے جائیں گے   تم ہمارا بھی زورِ قلم دیکھنا

میکدے کا نظام تھا کیا تھا   ہر کوئی تشنہ کام تھا کیا تھا
اِک شکایت تھی سب کے ہونٹوں پر   ساقیا ! تیرا نام تھا کیا تھا
کس کے آنے کے منتظر تھے سبھی   کس قدر اہتمام تھا کیا تھا
اُس طرف غول تھا پرندوں کا   کچھ رکھا زیرِ دام تھا کیا تھا
جس کو محسوس کر لیا مَیں نے   وہ ترا انتقام تھا کیا تھا

صابر دانش

محمد صابر دانش ابن عبدالغنی، گوندھنا پور (بلڈانہ)　موبائل : 09822883871
بی۔ ایس۔ سی۔ بی۔ ایڈ　تاریخِ پیدائش : یکم جولائی ۱۹۵۴ء
ریٹائرڈ پرنسپل مہاتما گاندھی جونیئر کالج واشم
''انا''، ''اضطراب''، ''تسکین'' (شعری مجموعے، زیرِ ترتیب)

اس زندگی سے ایک لڑائی لڑا ہوں میں
تب جا کے اس مقام پہ آ کر کھڑا ہوں میں

میری انا سے مجھ کو اجازت نہیں ملی
اور وہ سمجھ رہے ہیں کہ ضد پر اڑا ہوں میں

قد کا نہیں بڑا یہ جسارت تو دیکھیے
کتنے بڑے بڑوں کے برابر کھڑا ہوں میں

اب ذمہ داریوں کی سزا جھیلنی پڑے
میرا قصور یہ ہے کہ گھر میں بڑا ہوں میں

اپنے پدر کے حکم کی تعمیل نہ کروں
ہوں میں بڑا مگر کہاں اتنا بڑا ہوں میں

ہیں آپ جوہری تو پرکھنا ہے آپ کو
اپنے ہر ایک شعر میں موتی جڑا ہوں میں

دنیا ضروریات کو پورا بھی کر چکی
اپنی ضروریات کے پیچھے پڑا ہوں میں

سرکشی جب بھی قلمکار میں آجاتی ہے
اک مصیبت لئے سرکار میں آجاتی ہے

جب بغاوت پہ بھی انعام دیے جاتے ہیں
سر جھکائے ہوئے دربار میں آجاتی ہے

سُرخ روئی و بلندی بھی عطا ہوتی ہے
جب شریعت کسی کردار میں آجاتی ہے

تیری الفت کی قسم ایک ترے آنے سے
زندگی لوٹ کے بیمار میں آجاتی ہے

شاعری نیند اڑاتی ہے سخن سازوں کی
اور پھر عادت و اطوار میں آجاتی ہے

جذبۂ عشق ابھرتا ہے زلیخاؤں میں
جستجو مصر کے بازار میں آجاتی ہے

یہ حکومت کے بکھرنے کا سبب ہے دانش
بے حسی جب کسی سرکار میں آجاتی ہے

اپنے جیسا بھی کوئی اس کو نظر آئے گا
اپنے لہجہ کو ذرا سخت بنا کر دیکھو
ساتھ میں رہ کے سپیروں کے گذاریں کچھ دن
مسکرانا ہے تو پھر ساتھ رہا کر میرے
اپنی اولاد کے جذبات سمجھ لے ورنہ
جس کو سر کرکے مسرت ہی ملے گی دانش

چاند اس رات میں دھرتی پہ اُتر آئے گا
کچھ دنوں بعد تمھیں فرق نظر آئے گا
سانپ کے پھن کو کچلنے کا ہنر آئے گا
کچھ نہ کچھ تو مری صحبت کا اثر آئے گا
تیرا بیٹا نہ کبھی لوٹ کے گھر آئے گا
مرحلہ ایسا بھی دورانِ سفر آئے گا

ابھی تک زبانوں پہ فریاد ہے
اسے سن کے ہے داد مجھ کو ملی
تمھیں عدل و انصاف آتا نہیں
میں انگلی پکڑ کر چلا نہ کبھی
اخوت سے جینے کا فن سیکھ لے
کرو نیکیاں ، کام اچھے کرو
دعائیں بزرگوں کی شامل رہیں

مرا ملک برسوں سے آزاد ہے
مری شاعری میری روداد ہے
ہمیں اپنی سلطانیت یاد ہے
مرا تجربہ میرا اُستاد ہے
اگر تو بھی آدم کی اولاد ہے
ہر اک زندگانی کی معیاد ہے
تو دانش مرا گھر بھی آباد ہے

گلشن بیابانی

عبدالرحمٰن خاں گلشن بیابانی، اچل پور — موبائل : 9421772841

بی۔اے۔ڈی۔ایڈ — تاریخِ پیدائش : ۹ر ستمبر ۱۹۵۴ء

درس وتدریس ڈاکٹر ذاکر حسین اردو ہائی اسکول، نیر پرسوپنت

''لاتحف'' اور ''روش روش'' (شعری مجموعے، زیرِ طبع)

محبت کا وعدہ نبھایا ہے میں نے — زمانے کو نیچا دکھایا ہے میں نے

کہیں وقت اس کو نہ مسمار کردے — محل آرزو کا بنایا ہے میں نے

وہ مجھ سے بھی آگے بڑھا جا رہا ہے — جسے پاؤں چلنا سکھایا ہے میں نے

زمانہ پہ چھایا ہوا تھا اندھیرا — اندھیرے میں دیپک جلایا ہے میں نے

مصیبت میں تم کیا مرا ساتھ دوگے — تمھیں بارہا آزمایا ہے میں نے

سفینہ اسی نے ڈبویا ہے میرا — جسے ڈوبنے سے بچایا ہے میں نے

بہارِ سخن مجھ سے منسوب کردو — بیاباں کو گلشن بنایا ہے میں نے

کیسے کیسے یہ کمالات دکھائیں بابا — لوگ سورج کو ہتھیلی پہ اُگائیں بابا

دودھ بچوں کو بھلا کیسے پلائیں بابا — ایک مدت ہوئی فاقہ سے ہیں مائیں بابا

لوگ اب اس کو بھی اوتار سمجھ لیتے ہیں — چھین لیتا ہے جو بہنوں کی ردائیں بابا

جسم تو جسم ہیں جذبات جھلس جاتے ہیں — گرم ہوتی ہیں بہت شہری ہوائیں بابا

ننھی کلیوں کو حسیں پھول بنا دیتی ہیں — کتنی بدذات ہیں سورج کی شعاعیں بابا

دوست حق بات پہ گویا تو ہیں لیکن ایسے — جیسے گویا ہوں اجنتا کی گپھائیں بابا

توبہ کرنی ہے مگر آج نہیں کل، گلشن — آج تو چھائی ہیں گھنگھور گھٹائیں بابا

مکڑیوں نے وقت کی کر دیا کمال سا / میرے گرد بن دیا اُلجھنوں کا جال سا
اس نئی صدی کا یہ کارنامہ خوب ہے / سکھ کا ایک لمحہ ہے دُکھ کے ایک سال سا
پیٹھ پر لدا ہُوا مسئلوں کا بوجھ ہے / بن گیا ہے آدمی آج کل حمّال سا
دوستی کے وار سے ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا / دل ہمارے سینے میں تھا کبھی جو ڈھال سا
فکروفن کی تشنگی کس طرح بجھاؤں میں / بستیٔ خیال میں لفظوں کا ہے کال سا
موسمِ بہار ہے پر ابھی کھِلا نہیں / گلشنؔ حیات میں پھول بے مثال سا

دل میں جب شعلۂ احساس مچل جاتا ہے / موم کی طرح سے پتھر بھی پگھل جاتا ہے
کیسے کہہ دوں کہ یہ سورج ہے اُجالوں کا امیں / شام ہوتے ہی اندھیروں میں جو ڈھل جاتا ہے
چند قطروں کی مرے دوست حقیقت کیا ہے / ظرف والا تو سمندر بھی نِگل جاتا ہے
"کیا ضروری ہے کہ شعلوں کو ہَوا دی جائے" / جس کو جلنا ہے وہ پھولوں سے بھی جل جاتا ہے
یہ سیاست کا ہے بازار یہاں پر یارو ! / کھوٹا سکّہ بھی کھرے داموں میں چل جاتا ہے
وقت کے ساتھ بدل جاتے ہیں چہرے گلشنؔ / لوگ کہتے ہیں کہ آئینہ بدل جاتا ہے

عبدالرؤف انجم

عبدالرؤف انجم ابن عبدالرشید، اکولہ
ایچ۔ایس۔سی
تاریخ پیدائش : ۵؍نومبر ۱۹۵۴ء
موبائیل : 09370512818

ملے ہیں آنکھ کو منظر لہو میں ڈوبے ہوئے
تمام شہر کے پتھر لہو میں ڈوبے ہوئے

ضرور امن کا پیغام لے گیا تھا کہیں
پرندہ لوٹا لئے پر لہو میں ڈوبے ہوئے

عدالت ان کو ہی مظلوم کہہ کے چھوڑ نہ دے
ہیں جن کے ہاتھ میں خنجر لہو میں ڈوبے ہوئے

پلٹ جا تیری ضرورت ہی کیا ہے اے سیلاب
ہیں میری بستی کے سب گھر لہو میں ڈوبے ہوئے

وہ سُرخرو ہیں، وہی سر بلند ہیں انجم
سجے ہیں نیزوں پہ جو سر لہو میں ڈوبے ہوئے

زرد سوکھے ہوئے چہرے نہیں اچھے لگتے
وقت سے پہلے بُڑھاپے نہیں اچھے لگتے

اپنے ہاتھوں سے جنھیں قتل کیا ہے ہم نے
ان کے چوراہوں پہ پُتلے نہیں اچھے لگتے

جن کا کپڑوں میں بھی عریاں نظر آتا ہے بدن
ان کے دروازوں پہ پردے نہیں اچھے لگتے

ماں کی ممتا میں بھی لاتی ہے کمی بیکاری
گھر میں بیٹھے ہوئے بیٹے نہیں اچھے لگتے

باپ سے روتے ہوئے بچّے نے جھنجھلا کے کہا
بھوک میں کھیل کھلونے نہیں اچھے لگتے

درمیاں کچّے گھروں کے یہ مکانات اونچے
ان امیروں کے ارادے نہیں اچھے لگتے

حادثے، قتل، فساد، آبرو ریزی، اغوا
چھوڑیئے روز یہ قصے نہیں اچھے لگتے

ملک کی سرحدیں کہنے لگیں رو کر انجم
شہر میں فوج کی دستے نہیں اچھے لگتے

ہاتھ تو افسوس سے ایسے نہ مل، ہو جائے گی
آج قسمت مہرباں نہ ہو تو کل ہو جائے گی
تو وہ قطرہ بن سمندر آرزو جس کی کرے
تیری یہ دلکش ادا ضرب المثل ہو جائے گی
کار، اسکوٹر کہاں ایمانداری میں حضور
کی بہت کوشش تو بس اک سائیکل ہو جائے گی
حادثے بکھرے ہوئے ہیں ہر قدم پر دھیان رکھ
زندگی ورنہ سمٹ کر پل دو پل ہو جائے گی
مسئلہ ہو ایک کا تو سوچنے کی بات ہے
ایک ہے دونوں کی گر مشکل تو حل ہو جائے گی
ہم نے سوچا نوٹ کرلیں شعر جب اچھا ہُوا
ہم کو کیا معلوم تھا انجم غزل ہو جائے گی

قابلِ رشک ذات پھولوں کی
خوب ہے کائنات پھولوں کی
خوشبوؤں کا سفر طویل مگر
مختصر ہے حیات پھولوں کی
کر چکے ہیں وضو وہ شبنم سے
ہو رہی ہے صلوٰۃ پھولوں کی
سو گئے ہیں لپٹ کے کانٹوں سے
کیا قیامت ہے رات پھولوں کی
ہے اسیر قفس کے ہونٹوں پر
ذکر کلیوں کا بات پھولوں کی
اُن کے ہنسنے سے کھل گئے غنچے
اُن کے دم سے حیات پھولوں کی
چند لمحوں میں کھِل کے مرجھائیں
زندگی بے ثبات پھولوں کی
ساری محفل مہک گئی انجم
شعر ہیں یا برات پھولوں کی
ہے غزل میں چمک بھی انجم کی
اور مہک ساتھ ساتھ پھولوں کی

صوفی محمد تنویر ساجد نقشبندی

صوفی محمد تنویر ساجد نقشبندی ابن صوفی محمد نظام الدین، باسم　　تاریخ پیدائش : ۱۲ر مئی ۱۹۵۵ء
حافظ، قاری، مولوی، عالم، فاضل، ایم۔اے۔ (اردو، عربی) بی ایڈ
تدریس نگر پریشد مہاتما گاندھی ہائی اسکول، باسم

سرِ راہ کوئی مجھے ملا کہ نقاب رُخ سے اُٹھا دیا
اک عجیب شعلۂ حسن تھا دل و جاں میں آگ لگا دیا

وہ تڑپتا مجھ کو یوں چھوڑ کر، مجھے حیرتوں میں وہ ڈال کر
وہ کدھر سے آیا، کہاں گیا، نہ تو نام اور نہ پتا دیا

ہے رگوں میں خون یا آگ ہے، یہ عجیب طرح کی لاگ ہے
وہ زباں پہ عشق کا راگ ہے کہ جو سازِ دل نے سکھا دیا

مرے دل کا جل گیا آشیاں، مری چشمِ نم ہے دھواں دھواں
اُسے ڈھونڈتا ہوں یہاں وہاں، مرے دل کو جس نے جلا دیا

شب و روز اُس کا حضور ہے، جو سراپا نور ہی نور ہے
اک عجیب کیف و سرور ہے کہ نظر کا جام پلا دیا

ہوا جب بھی وہ مرے روبرو مری آنکھیں کرنے لگیں وضو
تبھی چشمِ ساجدِ کم نظر سے حجاب سارے اٹھا دیا

پستی پہ بلندی کا سماں دیکھ رہا ہوں
ماتھے پہ ترے کاہکشاں دیکھ رہا ہوں

سورج کی حرارت سے جلے قطرۂ شبنم
میں پھول کے دامن میں دھواں دیکھ رہا ہوں

مانا کہ ابھی تاج محل پہ ہے بڑھاپا
فنکار ترے فن کو جواں دیکھ رہا ہوں

سڑکیں ہیں لہو اور مکانات ہیں شعلے
بستی میں نیا امن و اماں دیکھ رہا ہوں

کیا رنج بدلتی ہوئی رُت کا مجھے ساجدؔ
صحرا میں بے بہار خزاں دیکھ رہا ہوں

بے زبانی کو عطا یوں بھی زباں ہونے لگی
میری حالت ان کے چہرے سے عیاں ہونے لگی

ہر مسرت ، ہر خوشی بنتی گئی تصویرِ غم
دھیرے دھیرے نغمگی آہ و فغاں ہونے لگی

شب کے ڈھلنے تک جمی تھی محفلِ شعر و سخن
آنکھ جھپکی تھی کہ مسجد میں اذاں ہونے لگی

تیرے ہاتھوں کی مہک ہے اب بھی میرے ہاتھ میں
تیری خوشبو میری سانسوں میں رواں ہونے لگی

وقتِ رخصت آپ نے دی تھی دعائیں میرے ساتھ
ابر بن کر وہ سفر میں سائباں ہونے لگی

خاک بن کر ان کی گلیوں میں پہنچتا کاش میں
میری مٹی بھی لحد میں رائیگاں ہوتے لگی

آنکھوں آنکھوں ہی میں ساجد کہہ گئے سب حالِ دل
اپنی خاموشی نئی طرزِ بیاں ہونے لگی

حسد ، کینہ ، عداوت کاٹتی ہے — کہ نفرت کو محبت کاٹتی ہے
ہر اک مشکل اور آفت کاٹتی ہے — مصیبت کو مصیبت کاٹتی ہے
نہ گھبرا سب کی زحمت کاٹتی ہے — خدا کی شانِ رحمت کاٹتی ہے
جہنم سرد کردیں اشک میرے — گناہوں کو عبادت کاٹتی ہے
عمل کر ، نیکیوں کے بیج بولے — پکے جب فصل محنت کاٹتی ہے
نہ لیجے قرض ہرگز دوستی میں — یہ وہ شے ہے محبت کاٹتی ہے
نہیں ہیں تن پہ ارمانوں کے زیور — اُسے اب میری چاہت کاٹتی ہے
بہت تھوڑے بچے دن زندگی کے — بہت فکرِ قیامت کاٹتی ہے
بظاہر میں بھی سایہ دار گھر ہوں — مگر اندر تمازت کاٹتی ہے
مری شہرت کی ناگن مجھ کو ساجد — مری اپنی بدولت کاٹتی ہے

ضمیرالدین ساجدؔ

ضمیرالدین ساجدؔ ابن شرف الدین، اکولہ
موبائیل : 9923453010
ایچ۔ایس۔ایس۔سی
تاریخِ پیدائش : ۷؍جولائی ۱۹۵۵ء
''شناخت'' (شعری مجموعہ)

ہمارا پیار دِکھاوے کا پیار تھوڑی ہے
خلوصِ دل ہے، کوئی اشتہار تھوڑی ہے

یہ بادشاہوں سا لہجہ بدل مرے بھائی
کہ اب یہاں پہ ترا اقتدار تھوڑی ہے

غریبِ شہر، تونگر سے کہہ رہا تھا کہ تُو
امیرِ شہر ہے، پروردگار تھوڑی ہے

مرے پھٹے ہوئے دامن پہ ہنسنے والے سُن
یہ تار تار سہی، داغدار تھوڑی ہے

یزیدیت میں ندامت ہے فتح پا کر بھی
حسینیت کی شہادت میں ہار تھوڑی ہے

ہزار جان لٹاؤں وطن پہ میں ساجدؔ
وفا شعاروں میں میرا شمار تھوڑی ہے

وصل مشکل ہی سہی، دیدار ہونا چاہیے
کانچ کا اک روزنِ دیوار ہونا چاہیے

ہو چکی حد، فیصلہ اِک بار ہونا چاہیے
یہ تماشا اب سرِ بازار ہونا چاہیے

ظرف ہونا چاہیے، معیار ہونا چاہیے
''آدمی کو صاحبِ کردار ہونا چاہیے''

لُطفِ منزل پر پہنچنے کا یقیناً آئے گا
شرط یہ ہے راستہ دشوار ہونا چاہیے

ڈوبتی ہو نبض، لیکن ہوش کی باتیں کرے
آدمی کو اس طرح بیمار ہونا چاہیے

بیچ کر ایمان، دُنیا کی خریداری ہوئی
شہر بھر میں آپ کا ستکار ہونا چاہیے

ہے بہت آسان تقسیمِ وراثت دوستو!
بھائیوں میں جذبۂ ایثار ہونا چاہیے

کچھ اشارہ بھی، کنایہ بھی، ہو کچھ تمثیل بھی
کچھ غزل کے شعر کو تہہ دار ہونا چاہیے

ناقدانِ فن کا استقبال ہے ساجدؔ مگر
ناقدوں کو غیر جانبدار ہونا چاہیے

ہیں سیہ ابر کے سائے ترے گیسو کی طرح
جلوہ گر قوسِ قزح ہے ترے ابرو کی طرح

ذہن و دل ، ہوش و خرد ، فہم و شعور و ادراک
لے گئی اُن کی نظر لُوٹ کے جادو کی طرح

مَیں تو کچھ بھی نہیں ظلمت کدۂ ہستی میں
ہوں فقط ایک چمکتے ہوئے جگنو کی طرح

ماہِ نو کا نظر آتا ہے فلک پر جو دماغ
ہو بہو جلوہ گری ہے ترے ابرو کی طرح

جانے کیا ٹوٹتا رہتا ہے مرے سینے میں
گونج آتی ہے چھنکتے ہوئے گھنگرو کی طرح

اِک نہ اِک دن مجھے محسوس کیا جاتا ہے
مَیں چمن میں ہوں بکھرتی ہوئی خوشبو کی طرح

وقت کی آنکھ سے کیا جانئے کب گر جاؤں
مَیں ہوں پلکوں پہ لرزتے ہوئے آنسو کی طرح

تم نے دیکھا تو لگا تم کو دِوانہ ساجدؔ
ہم نے دیکھا تو دکھائی دیا سادھو کی طرح

وہ جس کے لئے موت کا فرمان ہُوا ہے
اُس کی یہ خطا ہے کہ وہ سچ بول رہا ہے

قد پر نہیں موقوف یہاں دل کی بڑائی
چھوٹا تو وہ لگتا ہے ، مگر دل کا بڑا ہے

سانسوں میں بسی ایک تری چاہ کی خوشبو
تیرا ہی تصوّر مری رگ رگ میں رچا ہے

لالچ بھی بری چیز ، حسد بھی ہے بری شے
مَیں نے تو یہی اپنے بزرگوں سے سُنا ہے

ساتھی ترے طوفان سے لڑنے بھی لگے ہیں
اور تُو ہے کہ ساحل پہ کھڑا سوچ رہا ہے

بیساکھیاں رکھتے ہیں سبھی تیرے نگر میں
ساجدؔ ہی اکیلا ہے جو پیروں پہ کھڑا ہے

رفیق سراجی

رفیق خاں سراجی ابن ثناء اللہ خاں، اکوٹ (اکولہ) تاریخ پیدائش : یکم دسمبر ۱۹۵۵ء
تعلیم : ایم ۔ اے (انگریزی) ملازمت : ریٹائرڈ BSNL آفیسر
''طلوعِ سحر'' (شعری مجموعہ) ۱۹۸۸ء

رہینِ حسرت و حرمان و یاس بیٹھے ہیں
وہ شادماں ہیں مگر ہم اُداس بیٹھے ہیں

کریں تو کیسے یقیں ہم کریں وفا پہ تری
رقیب اب بھی ترے آس پاس بیٹھے ہیں

وہ ایک تو' کہ خود اپنی خطا پہ روٹھ گیا
پر ایک ہم کہ سراپا سپاس بیٹھے ہیں

کسی کا جام رہے ہیں کسی کا مے خانہ
ہم ایک عمر سے خود بن کے پیاس بیٹھے ہیں

تمھارے ذکر پہ جی بھر کے روئے چلّائے
کچھ ایسے دل کی نکالے بھڑاس بیٹھے ہیں

کوئی رِستے ہوئے زخموں کی دوا بن جائے
کوئی بیمارِ محبت کا خدا بن جائے

کوئی بے سود امیدوں کا سہارا ہووے
کوئی بہتے ہوئے اشکوں کی ردا بن جائے

کوئی پہنچے مری تسکین کا ساماں بن کر
کوئی تڑپی ہوئی آہوں کی صدا بن جائے

کوئی ہمدرد اُٹھے ، مونس و غمخوار بنے
میرے حق میں کوئی پھر دستِ دعا بن جائے

کوئی ابھرے مرے ہونٹوں پہ سیاہی بن کر
آخری ہچکی بنے ، وجہِ قضا بن جائے

کوئی درماندہ جوانی کو بھی پہنائے کفن
روئے ، چلّائے کہ پُر شور فضا بن جائے

ہم کو لے جائے مزاروں کے شہر کوئی رفیق
کوئی بے دست جنازے کا عصا بن جائے

اک بیکراں سکوت ہے اب شاملِ حیات
اُف کس جگہ پہ ٹھہر گئی نبضِ کائنات

دُکھ ہے، نہ مستیاں ہیں نہ آوارگی کوئی
اللہ رے قیامتِ پژمردگیٔ ذات

نشہ تھا، زندگی تھی، طبیعت جوان تھی
اب غم نہیں جو تیرا تو بے رنگ ہے حیات

میرے جنوں کو آپ سخن گستری کہیں
پنہاں ہیں ایک لفظ میں کتنے ہی تجربات

آؤ رفیق ڈھونڈھیں کوئی ہم خیال پھر
نے دن میں چین ہے نہ سکوں ہم کو رات رات

لمحے بے چینی کے تو نے بھی گذارے ہونگے
تیری آنکھوں میں مرے بھی تو نظارے ہونگے

میری نادار محبت کی شکایت تو نہ کر
تیری نخوت نے کبھی ہاتھ پسارے ہونگے

بے خودی جانے کہاں مجھ کو لئے پھرتی ہے
کسی بے نام سی منزل کے اشارے ہونگے

کبھی غرقاب ہُوا تھا جو سفینہ میرا
جانتا تھا کہ بہت دور کنارے ہونگے

ڈاکٹر محمد کلیم ضیاؔ

ڈاکٹر محمد کلیم ضیاءؔ ابن محمد مقیم، ملکاپور ضلع بلڈانہ　　تاریخ پیدائش: ۴ مارچ ۱۹۵۶ء

تعلیم: ایم۔اے (اردو، فارسی، عربی) پی۔ایچ۔ڈی

صدر شعبۂ اردو اسمٰعیل یوسف کالج جوگیشوری، ممبئی

"پسِ آئینہ" (شعری مجموعہ) متعدد کتب (کہانی، ادبِ اطفال، تنقید وغیرہ)

موبائل: 09820786854 , 09892933626

زردار کبھی چاہنے والا نہیں مانگا
رائی کی ضرورت پہ ہمالہ نہیں مانگا

اکثر مرے چولہے میں رہا برف کا ڈیرا
لیکن کسی رشتے سے نوالا نہیں مانگا

بروقت ضرورت نہ ہوئی پوری کسی سے
سورج سے اندھیرے میں اُجالا نہیں مانگا

غالبؔ کے ہنر میرؔ کی فنکاری کے صدقے
ناقد سے کسی نے بھی حوالہ نہیں مانگا

پوری نہ ہو، ایسی کوئی خواہش ہی نہیں کی
منظر کوئی آنکھوں نے نرالا نہیں مانگا

تپتے ہوئے صحرا کی ضیاؔ پیاس بجھائی
دریاؤں سے پانی کا پیالہ نہیں مانگا

اک بار دیکھ لوں تو ستاتا ہے آئینہ
بیتے دنوں کی یاد دلاتا ہے آئینہ

بدصورتی پہ اپنی ترس کیوں نہ آئے گا
جب بار بار کوئی دکھاتا ہے آئینہ

ہر کوئی اس ہنر سے تو واقف نہیں مگر
بدصورتوں کا بوجھ اُٹھاتا ہے آئینہ

انساں کی صحبتوں نے اسے بھی سکھا دیا
چہروں پہ خوب چہرے چڑھاتا ہے آئینہ

جو داغ میرے چہرے پہ تھے ہی نہیں کبھی
اکثر وہ داغ مجھ کو دکھاتا ہے آئینہ

سچ پوچھیے تو چہروں پہ لکھا نہیں ہے کچھ
اپنے ہی دل کی بات بتاتا ہے آئینہ

اُس وقت کائنات کا عالم نہ پوچھیے
جب پتھروں سے آنکھ ملاتا ہے آئینہ

باطن کی کچھ خبر ہے نہ ظاہر پہ کچھ عیاں
کچھ راز اس طرح بھی چھپاتا ہے آئینہ

محفل میں سب سے آنکھیں چُراتا ہے گو ضیاؔ
تنہائیوں میں ساتھ نبھاتا ہے آئینہ

حادثے گشت میں رہتے ہیں قضا کی صورت
کتنی محدود ہے دنیا میں بقا کی صورت

قصۂ صبر و رضا اس کو سناؤ جا کر
جس نے دیکھی نہ ہو اربابِ وفا کی صورت

زخم بھر جائیں گے پل بھر میں یقیں ہے مجھ کو
وہ جو آجائیں ذرا دیر دوا کی صورت

آ کے بیٹھے بھی نہیں ٹھیک سے اور چل بھی دیے
جب بھی آتے ہو تو آتے ہو، ہوا کی صورت

تو جو بولے تو اتر جائے مجسّم دل میں
کسی تاثیر سے بھرپور دعا کی صورت

لذّتِ دید سے محروم ہوں، محروم سبھی
وہ خیالوں میں ہے موجود، خُدا کی صورت

حادثہ پھر تو نہیں کوئی فلک ساز ہوا
اُتری اُتری سی ہے کیوں آج ضیاؔ کی صورت

کب کسی کے کہے پر چلا آدمی
ظلمتوں میں بھٹکتا رہا آدمی

ہر طرح کا یہاں پر مِلا آدمی
ڈھونڈنے پر مِلا نہ بھلا آدمی

اس کی فہم و فراست تو دیکھو ذرا
زندگی کو سمجھتا سزا آدمی

اس سے بدتر کوئی لمحہ ہوتا نہیں
ہار جاتا ہے جب حوصلہ آدمی

آسماں پھٹ گیا اور کِھسکی زمیں
جب کبھی بن گیا ہے خدا آدمی

اس کی فطرت میں پانی کی تاثیر ہے
ڈھونڈ لیتا ہے خود راستہ آدمی

سنگ بھی، موم بھی، خار بھی، پھول بھی
آگ، پانی، ہوا، خاک کا آدمی

مت ستا، اس کی آہوں سے ڈر، مت ستا
دیکھ پہلے سے ہے دل جلا آدمی

زندگی کے کئی رنگ روشن ہوئے
جب کسی دل میں جاکر بَسا آدمی

داغ پتھر کے بھی صاف ہو جائیں گے
آئینہ دیکھ تو لے ضیاؔ آدمی

ڈاکٹر خواجہ غلام السیّدین ربانی

ڈاکٹر خواجہ غلام السیّدین ربانؔی ابن ڈاکٹر خواجہ کشف الدجیٰ خاں، اکولہ

سنِ پیدائش : ۱۹۵۶ء

تعلیم : ایم۔اے (عربی) پی۔ایچ۔ڈی۔بی۔جے

''اچلپور تاریخ اور ثقافت'' ''اکبر کے عہد میں فارسی تاریخ نویسی''

ڈائریکٹر محکمۂ آثارِ قدیمۂ ہند (ناگپور)

اُس لگام سے چھوٹے اس لگام تک پہنچے
ہم پچاس سالوں میں اس مقام تک پہنچے

مقتدی تو بیچارے کب کے آئے بیٹھے ہیں
اک اذان ہو جائے جو امام تک پہنچے

ساس ہے جہاں دیدہ کب بھلا یہ چاہے گی
یہ بہو بھی اس گھر کے انتظام تک پہنچے

پکّے پکّے رنگوں کی، کچّی ڈور کے بل پر
اک پتنگ اپنی بھی اُن کے بام تک پہنچے

کیسے کیسے اندیشے اُن کبوتروں سے ہیں
گنبدِ شکستہ پر جو نہ شام تک پہنچے

گھر میں اپنا شمار چاہتے ہیں
یعنی ہم اختیار چاہتے ہیں

کچھ تو طے ہو زرِ مبادلِ جاں
اب کے ہم کاروبار چاہتے ہیں

عہد و میثاق توڑنے والے
پھر سے سودا اُدھار چاہتے ہیں

عزتیں مفت میں نہیں ملتیں
مرتبے اعتبار چاہتے ہیں

ایک نسبت تمہارے در سے رہے
ہم کہاں افتخار چاہتے ہیں

کچھ تو اور رنگ جاں کی زیب بڑھے
ایک کچّا مزار چاہتے ہیں

وہ اس طرح بھی مجھے آزمانے لگتا ہے
مزاج پوچھتا ہے مُسکرانے لگتا ہے

کوئی تو ہے جو رہائی کے حکم سے پہلے
ہماری قید کی مدت بڑھانے لگتا ہے

نگاہ اُس کی عجب ہے کہ کچھ نہیں کہتی
مگر بدن ہے کہ اکثر بُلانے لگتا ہے

امیرِ شہر کی مُٹھی میں ہے مرا منصف
بیاں سے پہلے سزائیں سُنانے لگتا ہے

ہماری روح کو رخصت ہوئے زمانہ ہُوا
یہ دیکھنا ہے بدن کب ٹھکانے لگتا ہے

دل میں گر روشنی نہیں ہوگی
شعر میں زندگی نہیں ہوگی

آپ بھی ہو چلے ہیں جاہ پسند
آپ سے دوستی نہیں ہوگی

خواہشیں سب نکال دیں دل سے
اب تو شرمندگی نہیں ہوگی

آپ ایوان میں بھی کچھ نہ کہیں
یوں نمائندگی نہیں ہوگی

صبح سلطانِ شب کے لہجے میں
ویسی شائستگی نہیں ہوگی

رفیق عثمانی

محمد رفیق عثمانی ابن غلام مرتضیٰ، اکولہ
گریجویشن
BSNL میں سینئر ٹیلی کام اسسٹنٹ
''میزان'' (شعری مجموعہ، زیرِ ترتیب)

موبائیل : 9421755446
تاریخِ پیدائش : یکم جنوری ۱۹۵۷ء

مجھ کو شہرت نہ شان دے اللہ
فن کی دولت دے گیان دے اللہ

ُن کے پتھر بھی موم ہو جائیں
میرے شعروں میں جان دے اللہ

وقت کے ہاتھ میں ہے تیر کماں
مجھ کو اونچی اُڑان دے اللہ

ظلم کی تیز دھوپ ہے ہر سو
صبر کا سائبان دے اللہ

اب زمیں پر نہیں جگہ خالی
آسماں پر مکان دے اللہ

اپنے الزام کی کروں تردید!
میرے منہ میں زبان دے اللہ

آگیا زیست سے رفیقؔ عاجز
کب تلک امتحان دے اللہ

پھول اخلاص کے ہونٹوں پہ سجانے والا
میں ہوں دشمن کو بھی سینے سے لگانے والا

جا کے پردیس مرے گھر کا پتہ بھول گیا!
اپنا بچپن مرے آنگن میں بتانے والا

اُس کی یادوں کو کلیجے سے لگائے رکھیے
اب نہ آئے گا کبھی لوٹ کے جانے والا

میرے دشمن تجھے معلوم نہیں ہے شاید!
مارنے والے سے بڑھ کر ہے بچانے والا

کیسے کرتا میں شکایت بھی کسی کی یارو!
میرا اپنا ہی تھا دل میرا دکھانے والا

ایسے بچھڑا کہ خیالوں میں بھی آیا نہ رفیقؔ
کتنا خوددار تھا وہ روٹھ کے جانے والا

کوئی دیکھے تو ذرا کیسی سزا دیتا ہے
میرا دشمن مجھے جینے کی دعا دیتا ہے

حاکمِ وقت بھی حالات سے عاجز آکر
وقت کے سامنے سر اپنا جھکا دیتا ہے

کیا ہُوا تونے جو غربت میں چھڑوایا دامن
ایسے حالات میں ہر کوئی دغا دیتا ہے

لطف آتا نہیں ہو کر بھی شکم سیر تمھیں
ہم غریبوں کو تو فاقہ بھی مزا دیتا ہے

دور آکاش میں اُڑتا ہُوا سوکھا پتہ
آنے والے کسی طوفاں کا پتہ دیتا ہے

ہاتھ پھیلاؤں کسی غیر کے آگے کیوں کر
مجھ کو ہر چیز بنا مانگے خدا دیتا ہے

جس کی آواز کو سن کر میں تڑپ جاتا ہوں
میرے اندر سے مجھے کون صدا دیتا ہے

کوئی منزل پہ نہیں چھوڑتا لیجا کے رفیقؔ
ہر کوئی دور سے بس راہ دکھا دیتا ہے

اس کے منہ کا کڑوا بول بھی کیسا تھا
دودھ میں جیسے شہد ملا ہو لگتا تھا

کھلی ہَوا میں اُڑتے اُڑتے مرجانا!
قفس میں رہ کر جینے سے تو اچھا تھا

شادی ہوجانے پر بیٹا بھول گیا
بیوہ ماں نے کیسے اُس کو پالا تھا

آج میں اُس کا ہاتھ پکڑ کر چلتا ہوں
کل جو میری اُنگلی تھامے چلتا تھا

اب تو اس میں یادوں کا ہے شور بہت
من کا آنگن پہلے کتنا سونا تھا

سوچ رہا تھا آپ مرے گھر میں کیسے؟
آنکھ کھلی تو سمجھ میں آیا سپنا تھا

دن بھر ہنستا پھرتا تھا جو سڑکوں پر
وہ پاگل تنہائی میں اکثر روتا تھا

سر کو اونچا کر کے جو چلتا تھا رفیقؔ
اصل میں مجھ سے قد میں ذرا وہ چھوٹا تھا

महेश शुक्ला مہیش شکلا

مہیش شکلا، اکولہ
موبائیل : 9423127737
تاریخِ پیدائش : ۲۱ رجنوری ۱۹۵۷ء
بی۔ایس۔سی
آفیسر ساوتر ام مِل، اکولہ
''تصویر ہواؤں کی'' (مجموعۂ غزل، نظم)

وہ مجھ کو میرے اپنے سائے سا چھل گیا
شکل تو وہی تھی مگر قد بدل گیا

کیچڑ میں گِرا تھا جو شخص بھول سے یہاں
وہ گیا تو ہاتھ میں لے کر کنول گیا

ہم سے تو بات ہوئی تھی وہ بھول سے مگر
سارے زمانے میں وہی دور چل گیا

نکل سکا وہی جو چلا آنکھ موند کر
دیکھ بھال کر جو گیا وہ پھسل گیا

مشرق سے چلا تھا جو اندھیروں سے جوجھنے
مغرب پہنچ کے وہ بھی اندھیروں سے مل گیا

موم کی شمع کی لو کے پاس میں آ کر
فولاد کا بھی جسم موم سا پگھل گیا

رات بھر رہا وہ اندھیرے کے بھیس میں
اور صبح کو میرے سایے میں ڈھل گیا

اُبھر کر فلک تک جو آئے ہوئے ہیں
وہ صدیوں کے گہرے دبائے ہوئے ہیں

لگے شاخ پر پھل جو بھی ہیں میٹھے
وہ کچھ کچھ پرندوں کے کھائے ہوئے ہیں

لحافوں کی سوچو، الاؤں کی چھوڑو
کہ بادل فضاؤں پہ چھائے ہوئے ہیں

ہیں کاغذ پہ میرے، عبارت کے دھبے
تمہارے قلم کے لگائے ہوئے ہیں

کمال ہنر ہے، قفس میں ہیں لیکن
قفس کو چمن ہم بنائے ہوئے ہیں

ہے جانا جو اُن کو بہت دور واپس
یہاں تک مرے ساتھ آئے ہوئے ہیں

کافور سے احساس ہیں ، شبدوں سے نہ جڑ پائیں گے
جم کر رہیں گے سخت سے ، یا بھاپ بن اڑ جائیں گے
گل ہیں چراغاں تو کھلے ہیں دریچہ و در بھی
جوں ہی روشن ہوگا گھر پردے بہت پڑ جائیں گے
اُکھاڑے جائیں گے اس وقت تیرے میل کے پتھر بھی
جب وہ کسی کی شہرتوں کی راہ میں اڑ جائیں گے
سمندر تہذیب کے اب نہر بن بہنے لگے
دَور یہ آگے بڑھا تو شرم سے گڑ جائیں گے
لگے گا ہم کو کہ جیسے چھپ کے تم ہم سے ملے
ہم جب کبھی تنہائی میں خط پرانا پڑھ جائیں گے

جو نہیں کہتے ہیں ہم تو یہ احترام ہُوا
ورنہ یہ قصّہ تو ، اک وقت ہُوا تمام ہُوا
آیئے ایک دفعہ میرے دوست بن کر بھی
آپ آئے ہیں تبھی ، جب کہ کوئی کام ہُوا
مَیں نے ہاتھوں میں لیا اور پڑھ کے جھوم اٹھا
گویا ہاتھوں میں ترا خط نہ ہُوا جام ہُوا
ہم نے کچھ تیز روشنی کی مشعلیں تھامیں
یہ اندھیرے کو ڈھونڈنے کا انتظام ہُوا
جو بھی باتیں ہوئیں تنہائی میں تصور سے
جا کے محفل میں سُنائی تو وہ کلام ہُوا
وہ خیالوں میں مری عمر بھر رہے یارو
جن کا اس گھر میں فقط ایک دن قیام ہُوا
آپ نے پاؤں جو دہلیز پہ رکھا آ کر
فخر سے اور بھی اونچا ہمارا نام ہُوا

محمد خاں ساجدؔ

محمد خاں ساجدؔ ابن حیات خاں، اکولہ
تعلیم : میٹریکیولیشن
تاریخِ پیدائش : جولائی ۱۹۵۷ء
ملازمت مہاراشٹر اسٹیٹ روڈ ٹرانسپورٹ

بیچارگی کے نام کبھی بے بسی کے نام
الزام سب ہی آئے مری خامشی کے نام

ہر اک قدم پہ کھائے ہیں میں نے کئی فریب
کچھ سادگی کے نام تو کچھ دوستی کے نام

کیا زندگی تھی کرب کے لمحات کے سوا
کچھ روشنی کے نام تھے کچھ تیرگی کے نام

کاغذ میں جذب ہو گئے پلکوں سے گر کے جو
وہ اشک بھیجتا ہوں تری بے رُخی کے نام

ساجدؔ رہِ وفا میں ملی مجھ کو تلخیاں
دل کی لگی کے نام کبھی دل لگی کے نام

دل کے رِستے ہوئے زخموں کو ہوا دیتے ہیں
میرے اپنے ہی مرا درد بڑھا دیتے ہیں

لوگ مجبور پہ احسان تو کرتے ہیں مگر
ضرب احساس کے شیشے پہ لگا دیتے ہیں

منصفِ وقت کا انصاف تو دیکھو لوگو
کون مجرم ہے مگر کس کو سزا دیتے ہیں

شام ہوتے ہی تری یاد بھی آجاتی ہے
اشک پلکوں کے دریچوں کو سجا دیتے ہیں

لوگ ملتے ہیں بہت ٹوٹ کے لیکن ساجدؔ
وقت کے ساتھ ہر اک بات بھلا دیتے ہیں

درد و غم کا آپ کو بھی تجربہ ہوجائے گا
زیست کی جب تلخیوں سے سامنا ہوجائے گا
چھوڑ جا پرچھائیاں بیتے ہوئے لمحات کی
کچھ تو جینے کا مجھے بھی آسرا ہوجائے گا
چھین لے مجھ سے مرا احساس بھی اے زندگی
آخری احسان مجھ پہ یہ ترا ہوجائے گا
کھل ہی جائے گا بھرم احباب کے اخلاص کا
گردشِ دوراں میں جب تو مبتلا ہوجائے گا
تو بھی کچھ الزام دے اے دوست اوروں کی طرح
کچھ نہیں تو دوستی کا حق ادا ہوجائے گا
توڑ دی امید کی بے ساکھیاں حالات نے
کون جانے کس گھڑی کیا حادثہ ہوجائے گا
ناز تھا جس کی وفاؤں پر بہت ساجدؔ ہمیں
کیا خبر تھی وہ بھی اک دن بیوفا ہوجائے گا

اے وقت تیری آنکھ کا، کاجل رہے ہیں ہم
ہر ایک مسئلے کا ترے حل رہے ہیں ہم
منزل کی جستجو کا یہ عالم تو دیکھئے
صحرا ہے، تیز دھوپ ہے، اور چل رہے ہیں ہم
ہاتھوں میں آج وقت نے کشکول دے دیا
نازاں ہیں ہم یہ سوچ کے کیا کل رہے ہیں ہم
اشکوں نے اور آتشِ فرقت کو دی ہوا
"برسات ہورہی ہے مگر جل رہے ہیں ہم"
انجان بن کے آج جو گذرا قریب سے
برسوں اسی کے عشق میں پاگل رہے ہیں ہم
ہر دور کو لہو کا دیا ہم نے ہی خراج
اس دور میں بھی زینتِ مقتل رہے ہیں ہم
حق گو ہیں، حق شناس ہیں، اور حق پرست بھی
ساجدؔ اسی وجہ سے بہت کھل رہے ہیں ہم

ڈاکٹر ندیم الرحمٰن خاں ندیم

ڈاکٹر ندیم الرحمٰن خاں ابن ڈاکٹر منشاء الرحمٰن خاں منشاءؔ   تاریخِ پیدائش : ۳؍ دسمبر ۱۹۵۷ء
ایم۔بی۔بی۔ایس۔ایم۔ڈی۔ایم۔آئی۔ایم۔ایس۔پی۔ایچ۔ڈی
اسسٹنٹ ڈائریکٹر گورنمنٹ میڈیکل کالج ناگپور

دیکھ کر حوصلہ مرے دل کا   ہاتھ تھرّا رہا ہے قاتل کا
پاس آیا نہ وقتِ غرقابی   مجھ پہ احسان ہے یہ ساحل کا
کیا کہیں حشرِ کارواں کیا ہو   راہبر کا پتہ نہ منزل کا
خود ہی دیتے ہیں زخم اور خود ہی   پوچھتے ہیں مزاج بسمل کا
آگئی رُت بہار کی شاید   ہر طرف شور ہے سلاسل کا
کھنچ کے آنے پہ وہ ہوئے مجبور   معجزہ ہے یہ جذبِ کامل کا
ہم زباں ہو کے بھی خموش رہے   پاس رکھنا تھا رنگِ محفل کا
پردۂ شعر میں ندیمؔ اکثر   ہم سناتے ہیں ماجرا دل کا

لہریں کیوں ساکت و خاموش ہیں سوچا جائے   پھر مناسب ہو تو کنکر کوئی پھینکا جائے
اس قدر جور اُٹھائے ہیں خزاں کے ہاتھوں   ہم سے اب موسمِ گل میں بھی نہ چہکا جائے
اور بھی کتنے ہی اسباب ہیں سرمستی کے   یہ ضروری نہیں مئے پی کے ہی بہکا جائے
آئینہ حسنِ خداداد کی کیا دے گا داد   اس کو کچھ میری نگاہوں سے ہی دیکھا جائے
جن میں تحریر ہوں آیاتِ محبت یارو   ان صحیفوں کو نہ بازار میں بیچا جائے
دل میں ہوتی ہے جو محسوس یہ ہلکی سی خلش   دوستو اس کا کوئی نام تو رکھا جائے
منحصر جن پہ ہے تابانیٔ روئے ہستی   منھ کبھی ایسے حقائق سے نہ موڑا جائے
ایسا خوشبو سے بھرا زخم مجھے دے دیجے   ہر قدم پر جو رہِ زیست کو مہکا جائے
شعر کہنے کا فقط اتنا ہی مقصد ہے ندیمؔ   انجمن والوں کے معیار کو پرکھا جائے

حصولِ زر نہ کسبِ رُتبۂ ذی شاں پہ رکھی ہے
نظر ہم نے ہمیشہ خدمتِ انساں پہ رکھی ہے
اُسی کو ہر طرح کی کامرانی ہوگئی حاصل
اساسِ زیست جس نے حکمتِ قرآں پہ رکھی ہے
ازل کے روز ہی سے جنسِ اُلفت کی گراں باری
نحیف و ناتواں سے شانۂ انساں پہ رکھی ہے
محبت ، پیار ، حسرت ، رنج و غم ، درد و ہراسانی
سبھی باتوں کی تہمت اک دلِ ناداں پہ رکھی ہے
تنِ آسانئ ساحل کو تو کچھ کہتا نہیں کوئی
ہر اک نے تہمتِ فتنہ گری طوفاں پہ رکھی ہے
یہ گُل ہے، برق ہے، شعلہ ہے، کندن ہے کہ ہے لالہ
نہ جانے کیا دہکتی شے لبِ جاناں پہ رکھی ہے
مہ و خورشید ہوجائیں نہ مارے شرم کے پانی
اسی خاطر نقاب اس نے رُخِ تاباں پہ رکھی ہے
ندیمؔ اس کو میسّر آگئی ہے شہرتِ جاوید
سدا انگشت جس نے گردشِ دوراں پہ رکھی ہے

رعنائی میں ڈوبی ہوئی پائی تری آواز
کیا خوب خدا نے ہے بنائی تری آواز
مخمور ہے ہر تار مرے سازِ نفس کا
کانوں میں مرے جب سے ہے آئی تری آواز
یہ میرا جنوں ہے کہ ہے آواز کا جادو
آنکھوں سے بھی دیتی ہے دکھائی تری آواز
مستی بھرے لہجے میں جہاں تو ہُوا گویا
گہرائی میں جاں کی اُتر آئی تری آواز
کوئل کی یہ شیریں صدا سوغات ہے تیری
بلبل نے بھی تجھ سے ہے چرائی تری آواز
لے دیکے فقط کان پہ موقوف نہیں ہے
کرتی ہے تہہِ دل میں رسائی تری آواز
کرتا ہے شب و روز ندیمؔ اتنی دعائیں
تجھ سے نہ کہیں مانگے جدائی تری آواز

احمد امام

سید احمد علی ابن سید امام، بالاپور ضلع اکولہ	موبائیل : 9421750345
تاریخ پیدائش : ۳۰؍جون ۱۹۵۸ء
تدریس میونسپل کونسل اسکول، بالاپور
''شاخِ گل''(منظومات اطفال)''اکتساب''''الہام''(غزلیات)

نابینا، گونگی بہری، وزارت پہ آخ تھو
سو بار آج کل کی سیاست پہ آخ تھو

بھونکے ہیں اہلِ علم، گدھے کھا رہے ہیں کھیر
تھو تھو ترے نظامِ حکومت پہ آخ تھو

اہلِ ستم کی واہ سے ہوتی ہے جو نصیب
شہرت پہ ایسی آخ تھو، راحت پہ آخ تھو

تجھ میں نہیں تمیز حلال و حرام کی
لعنت تری کمائی پہ دولت پہ آخ تھو

رکھتی ہے جو نگاہ ہمیشہ مفاد پر
ایسی وفا پہ، ایسی محبت پہ آخ تھو

جو داغدار کردے انا کے لباس کو
ایسے سرور و کیف پہ عشرت پہ آخ تھو

دستار کا ہے پاس جنھیں کر رہے ہیں وہ
خیرات میں ملی ہوئی عزت پہ آخ تھو

وہی غم ہے وہی ایذا رسانی
اگرچہ اب نہیں آنکھوں میں پانی

جو بازاری ہیں، حاکم بن گئے ہیں
وہ ہیں محکوم جو ہیں خاندانی

کبھی ایسا کرو کچھ کر دکھاؤ
کہاں تک اور کب تک لن ترانی

دکھائے گا میاں آنکھیں زمانہ
اگر قائم رہے گی بے زبانی

سہارا دو جہاں میں بے کسوں کو
پرانی ہوگئی ہے یہ کہانی

محبت پر ہے عالم جاں کنی کا
عداوت میں ہے بجلی سی روانی

نہ رہے زبان پہ قہقہے ، نہ کبھی لبوں پہ ہنسی رہی
جو رہا تو مدتوں غم رہا کوئی لمحہ بھر نہ خوشی رہی
میں اکیلا راہِ حیات میں کئی منزلوں سے گذر گیا
نہ کسی نے حال پہ کی نظر نہ کسی کی راہبری رہی
کسی دل پہ تیر سا چل گیا کسی دل کا زخم ابھر گیا
مری بات چبھتی رہی بہت ، مری بات چونکہ کھری رہی
یہ بڑی عجیب سی بات ہے جو تمام عمر ستائے گی
جو ملا مجھے سو بہت ملا ، مگر ایک تیری کمی رہی
کئی لوگ دور دراز سے مجھے یاد کرتے ہیں پیار سے
جو رہی تو میرے ہی شہر میں بڑی میری بے قدری رہی

فضا عجیب سی منظر عجیب دیکھتے ہیں
ہم حاسدین کو اپنے قریب دیکھتے ہیں
خلوص بانٹتے پھرتے ہیں اس کے بعد بھی ہم
اگرچہ سامنے اپنے صلیب دیکھتے ہیں
تمھیں گِلہ ہے رقیبوں کی تنگ نظری کا
ہمیں تو تنگ نظر سے حبیب دیکھتے ہیں
عجب نگاہ سے تکتے ہیں مجھ کو اہلِ سخن
عجب نگاہ سے مجھ کو ادیب دیکھتے ہیں
حقارتوں کے سوا اور کچھ نہیں پاتے
کبھی جو کاسۂ دل میں غریب دیکھتے ہیں
کہاں نکلتا ہے سورج ہماری کاوش کا
کہاں چمکتا ہے جا کر نصیب دیکھتے ہیں

سرفراز خاں ندیم

سرفراز خاں ندیم ابن سعادت خاں، آرنی (ایوت محل) تاریخ پیدائش: ۱؍جولائی ۱۹۵۸ء
ایم۔اے۔بی۔ایڈ موبائیل : 8055796661
درس وتدریس

گردشِ وقت پہ ہم گہری نظر رکھتے ہیں
اپنے دشمن کو پرکھنے کا ہنر رکھتے ہیں

دوستو! دل کے چراغوں کو جلاتے ہیں ہم
بے سہاروں کے لئے سوزِ جگر رکھتے ہیں

اپنی خواہش کو زباں پر نہیں لاتے لیکن
ہم بھی اس دل میں امیدوں کا نگر رکھتے ہیں

خوابِ غفلت میں سمجھتے ہیں زمانے والے
ہم مگر سارے زمانے کی خبر رکھتے ہیں

کیوں ڈراتا ہے ہمیں دار و رسن سے باطل
حق پرستی کے لئے دار پہ سر رکھتے ہیں

داد دیتے ہیں ہمیں راہ کے کانٹے بھی ندیم
آبلہ پا ہیں مگر عزمِ سفر رکھتے ہیں

بوسیدہ مفلسی کی ردا تھی پھٹی رہی
گرد و غبارِ وقت سے ہر دم اٹی رہی

موسم کی گرم سرد ہواؤں کا خوف کیا
اپنی حیات رنج و خوشی میں بٹی رہی

وہ شخص گر بھی جائے تو اس میں عجب کیا
جس کی نگاہ راہ گذر سے ہٹی رہی

رشتوں کی ڈور ہوتی ہے نازک خیال رکھ
اک بار کٹ گئی تو ہمیشہ کٹی رہی

ہے کیسی سخت جان یہ چڑیا امید کی
جو سرپھری ہوا کے مقابل ڈٹی رہی

طوطے کا وصف ہے کہ سبق بھولتا نہیں
جو بات رٹ چکا وہ ہمیشہ رٹی رہی

جو کٹ گئی ندیم گئی اپنے ہاتھ سے
ڈوری پتنگ کی جو کٹی تو کٹی رہی

اشک آنکھوں میں کسک دل میں چھپاتے ہونگے
جو غریبی کی سزا دہر میں پاتے ہونگے
حادثو ! روک لو رفتار ذرا تم اپنی
میرے بچے ابھی اسکول سے آتے ہونگے
ہم تو قاتل کے مددگار کہیں گے اُن کو
جو اسے جھوٹی گواہی سے بچاتے ہونگے
ہم نے مانا کہ بہت خوب ہیں آنکھیں ان کی
نیند میں پھر بھی مرے خواب ستاتے ہونگے
بھولنے والے تری یاد ستائے ہم کو
گاہے گاہے تجھے ہم یاد بھی آتے ہونگے
لاش لیجاؤ دواخانے سے اب جلد ندیم
لوگ دیدار کو سب گھر مرے آتے ہونگے

کوئی دستک دے رہا ہے کھول دروازہ ابھی
کم سے کم آجائیگی گھر میں ہوا تازہ ابھی
بے حسی نے آج تک بخشا نہیں اپنا شکار
قوم گر جاگی نہیں بکھرے گا شیرازہ ابھی
کب نہ جانے شر کی کوئی ضرب چہرے پر پڑے
ہم نے مشکل سے لگایا امن کا غازہ ابھی
زلزلہ مسمار کر سکتا ہے یہ اونچے محل
قدرتی آفات کا مشکل ہے اندازہ ابھی
ظالمو ! مظلوم کی آہیں دکھائینگی اثر
تم اگر سمجھے نہیں بھگتوگے خمیازہ ابھی

مستقیم ارشدؔ

محمد مستقیم ارشدؔ ابن محمد تسلیم، گوندھنا پور (بلڈانہ) تاریخِ پیدائش : ۱۸؍اگست ۱۹۵۸ء
ایچ۔ ایس۔ سی
''آوازِ وطن'' (قومی گیت زیرِ طبع) ''سیلِ رواں'' (شعری مجموعہ زیرِ ترتیب)

آگئی ہے شکر زبان میں کیا
پھول کھلنے لگے چٹان میں کیا

کھل کے اظہار کر نہیں سکتے
اک خلش سی ہے درمیان میں کیا

لوگ پھرنے لگے خلاؤں میں
چیز کوئی ہے آسمان میں کیا

پڑھتے رہتے ہو آیت الکرسی
کوئی آسیب ہے مکان میں کیا

کیوں سزا دے رہے ہو جینے کی
تیر باقی نہیں کمان میں کیا !

میرؔ و غالبؔ کی جس میں خوشبو ہو
چیز ایسی بھی ہے دکان میں کیا

سچ وہ کہتے ہوئے جھجکتا ہے
کوئی کانٹا سا ہے زبان میں کیا

تھے جو اپنے وہ جا بسے ارشدؔ
دور خوابوں کے اک جہان میں کیا

وہ داؤ پیچ سے کیا کیا چڑھاؤ کرتے رہے
خدا کا شکر ہے ہم بھی بچاؤ کرتے رہے

تمام عمر وہ قسمت سے بدگماں ہی رہے
ہم ان کی سمت تو اپنا جھکاؤ کرتے رہے

بتائیں، کیا دیا بچوں کو اپنی جانب سے ؟
ہر اک دکاں پہ کھلونوں کے بھاؤ کرتے رہے

اب اس کے بعد کوئی گھر اجڑ نہیں سکتا
حسین لفظوں کا رہبر چناؤ کرتے رہے

کبھی تو سمجھیں گے ارشدؔ وہ مدعا دل کا
اس اک امید پہ ہم آؤ جاؤ کرتے رہے

اندھیرا رات کا اس وقت بوڑھا ہونے والا ہے
دریچے کھول کر دیکھو سویرا ہونے والا ہے

بکھیرا ہے فلک نے زعفرانی رنگ دھرتی پر
درختوں کا ہر اک پتہ سنہرا ہونے والا ہے

وہ اپنی دسترس سے اب مجھے آزاد کر دے گا
امیرِ شہر کے ہاتھوں اُجالا ہونے والا ہے

حویلی کا ہر اک گوشہ گلابوں سے مہکتا ہے
کسی مظلوم کی آہوں کا سودا ہونے والا ہے

پرندے گھونسلوں کی اوٹ میں جو سہمے بیٹھے ہیں
کسی طوفاں کی آمد ہے اندھیرا ہونے والا ہے

وہ میری شخصیت پر اب کرے گا تبصرہ شاید
مرے افکار کے رنگوں کا چرچا ہونے والا ہے

بدن میں خون کی اک بوند بھی باقی نہیں ارشدؔ
مری صف میں رقیبوں کا اضافہ ہونے والا ہے

نہ جانے کس نے پلٹ کر یہ دی صدا مجھ کو
سجھائی دیتا نہیں آگے راستہ مجھ کو

میں اس کے بارے میں سوچوں غرض نہیں لیکن
وہ دیکھنے میں تو اچھا بھلا لگا مجھ کو

ستم کی ناگ بھی ڈس رہی تھی تنہائی
ترے بغیر اکیلے میں ڈر لگا مجھ کو

اُسی کے لمس کی خوشبو بسی ہے سانسوں میں
اے کاش وہ بھی تو اپنے میں ڈھونڈتا مجھ کو

کسی بھی حال نہ چھوٹے یہ صبر کا دامن
خدائے پاک عطا کر وہ حوصلہ مجھ کو

وہ جس کو جینے کا میں نے شعور بخشا تھا
دکھا رہا ہے وہی شخص آئینہ مجھ کو

ہر ایک سمت قہر ڈھا رہے ہیں ابنِ یزید
لگے ہے ہند بھی میدانِ کربلا مجھ کو

میں اُس کے واسطے سب کچھ نثار کر دیتا
اگر وہ پیار سے ارشدؔ پکارتا مجھ کو

ڈاکٹر امین انعامدار

ڈاکٹر امین الرحمٰن امینؔ ابن مبین الرحمٰن (مرحوم)، بیودہ
تاریخِ پیدائش : ۱؍ جون ۱۹۶۰ء وفات : ۴؍ مئی ۲۰۰۸ء
تعلیم : ایم۔اے (اردو، فارسی) پی۔ایچ۔ڈی
درس وتدریس انچارج پرنسپل آرٹس اینڈ کامرس کالج، بیودہ
"احساس" (شعری مجموعہ) "محبوب راہی ایک مطالعہ" (مرتب)

خوشا نصیب حقیقت یہ دل نے مانی ہے　حیات ہم کو بتانی نہیں بنانی ہے
رکھے بھی کوئی تو کیوں کر تعلقِ خاطر　میں اک جزیرہ، مرے ارد گرد پانی ہے
یہ کیا کہ رائی کا پربت بنا دیا تم نے　ہمارا دل تو حوادث کی راجدھانی ہے
ہماری پیٹھ میں خنجر اُتارنے والے　ستم کی طرز بدل دے، بہت پرانی ہے
بہت سے اہلِ زباں بے زبان جیسے ہیں　بہت سے گونگوں کو زعمِ زبان دانی ہے
امینؔ سوزشِ عشقِ حبیب ہیں دونوں　اے شمع تیری مری ایک ہی کہانی ہے

صاف دل اور نظر پاک لیے پھرتے ہیں　مفلسی میں بھی یہ املاک لیے پھرتے ہیں
دیکھیے داد کہ اس دورِ پُر آشوب میں ہم　بے خطر لہجۂ بیباک لیے پھرتے ہیں
ہم نے ہر حال میں جینے کا ہنر سیکھ لیا　آپ کیوں دیدۂ نمناک لیے پھرتے ہیں
خوش لباسی ہے فقط لائقِ تعظیم یہاں　اور ہم دامنِ صد چاک لیے پھرتے ہیں
آشیانوں کی سکونت کے مزے لوٹیں گے　جو پرندے خس و خاشاک لیے پھرتے ہیں
ہم، کہ افسوس صد افسوس من و تو کے اسیر　وہ، کہ منصوبۂ خطرناک لیے پھرتے ہیں
بس مقاماتِ مقدس کی زیارت ہو نصیب　ہم یہ حسرت شہِ لولاکؐ لیے پھرتے ہیں

ہر دل میں بے بسی کی چبھن چھوڑ جاؤں گا
جب بھی تجھے اے ارضِ وطن چھوڑ جاؤں گا
حاصل تمام عمر کا دھن چھوڑ جاؤں گا
یعنی زبانِ گنگ و جمن چھوڑ جاؤں گا
مغموم کس لیے ہے اری سر پھری خزاں
میں تیرے نام اپنا چمن چھوڑ جاؤں گا
کانٹے کریں گے یاد مری چاک دامنی
پھولوں کو محوِ رنج و محن چھوڑ جاؤں گا
ہر اک خوشی کرے گی مجھے در بہ در تلاش
ہر اک جبینِ غم پہ شکن چھوڑ جاؤں گا
جی جی کے سب ہی مرتے ہیں لیکن میں اے امینؔ
مر مر کے زندہ رہنے کا فن چھوڑ جاؤں گا

کسی کسی پہ خدا مہرباں زیادہ ہے
وہ جانتا ہے ضرورت کہاں زیادہ ہے
زباں سے پوچھیے مت ہاتھ دیکھیے رکھ کر
بدن میں درد کہاں کم، کہاں زیادہ ہے
چراغِ عمر کی لَو نے دلا دیا احساس
کہ اس میں روشنی کم ہے دھواں زیادہ ہے
مری سنو تو کدورت کا کھیل مت کھیلو
کہ اس میں سود بہت کم، زیاں زیادہ ہے
نہ کیجے بات فرشتوں سے تلخ لہجے میں
گلی میں شور جو وقتِ اذاں زیادہ ہے
مقابلے کا اندھیروں سے حوصلہ ہے تو پھر
ذرا سا نور بھی جگنو میاں زیادہ ہے
ازل سے دونوں میں رشتہ اٹوٹ ہے تو امینؔ
حیات موت سے کیوں بدگماں زیادہ ہے

ریاض انورؔ

قاضی ریاض الدین ریاض ابن قاضی تمیز الدین، بلڈانہ
موبائل : 9730542130
تاریخ پیدائش : ۲۷ر جون ۱۹۶۰ء
میٹریکیولیشن

نظر میں مدتوں عبرت کا منظر بیٹھ جاتا ہے
صفِ فقراء میں جب کوئی تونگر بیٹھ جاتا ہے

تضادِ باہمی ہو بھائیوں میں اک تباہی ہے
ہوں دیواریں اگر کچی تو پھر گھر بیٹھ جاتا ہے

پرائے ہو گئے بیٹے نہ پوچھیں لاغری میں اب
پریشاں باپ بوڑھا سر پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے

ضمیر و آبرو، خودداریاں سب بک جاتی ہیں
پکے زن، عمرد دروازے کے باہر بیٹھ جاتا ہے

شراکت کی کمائی ہے تو کیوں لڑ کر گنواتے ہو
ترازو لیکے منصف بن کے بندر بیٹھ جاتا ہے

کرم ہے لوک شاہی کا سیاست کا کرشمہ ہے
کروڑوں کی کمائی کر کے لیڈر بیٹھ جاتا ہے

تھکن کو بھول کر چلنا ہی انورؔ زندگانی ہے
وہ منزل پا نہیں سکتا جو تھک کر بیٹھ جاتا ہے

ہے عام ویسے تو کہلائے جو نقاب یہاں
نمایاں جسم جو کر دے وہ ہے حجاب یہاں

نہ ذوقِ علم ہے ہم میں نہ اکتساب یہاں
وقار کھویا ہے کتنا نہیں حساب یہاں

ہمیں تھے وہ کہ جو دنیا میں حکمراں تھے کبھی
ہمیں ہیں اب کہ ہے غربت ہے اضطراب یہاں

کتاب خیر تو رکھ دی ہے ہم نے طاقوں میں
رکھا ہے کھول کے ہر ایک شر کا باب یہاں

گناہ کرتے ہیں بے خوف، بے جھجک ہم سب
ہے فخر عصیاں پہ جیسے کوئی ثواب یہاں

تقاضا بشری ہے سرزد خطائیں ہوتی ہیں
بہت ضروری ہے کرنا بھی احتساب یہاں

گناہ تو بھی کرے گا یوں کب تلک انورؔ
بڑھاپا آگیا کر لے تو اجتناب یہاں

خدا کی حمد کے وحدت کے نغمے رقص کرتے ہیں
مگن ذکرِ خدا میں جب پرندے رقص کرتے ہیں

مساوات، امن، بھائی چارگی، عدل و اماں کیوں ہو
جہاں ایوانِ شاہی میں لٹیرے رقص کرتے ہیں

حصولِ رزق میں پرہیز سے برکت جو ہے گھر میں
ہراک گوشے میں راحت کے اُجالے رقص کرتے ہیں

تباہی ناچتی ہے انتشار و شر مچلتے ہیں
جہاں تاریخ کے جھوٹے حوالے رقص کرتے ہیں

ضمیر و آبرو عزت یہاں ہر چیز بکتی ہے
یہ ہے بازارِ زر سونے کے سکے رقص کرتے ہیں

بھلا اندازہ کوئی کیا لگائے ان کی خوشیوں کا
کھلونا پا کے جب مفلس کے بچے رقص کرتے ہیں

عدالت سے یہاں روتا ہُوا ہر مدعی نکلا
کرم فرمائی سے منصف کی ہر مجرم بری نکلا

جو ہوتا عارضی صدمہ تو سہہ کر جی لیے ہوتے
مگر کیا کیجئے داغِ جدائی دائمی نکلا

امیرِ شہر تیری بخششوں کا ہے پتہ ہم کو
ملا جو تجھ سے اپنی آنکھ میں لے کر نمی نکلا

یقیں ہوتا نہ تھا حیرت سے ہم سب کور ہے تکتے
حمامِ زندگی سے برہنہ ہر آدمی نکلا

یقینی تھی فتح انورؔ مقابل ہار ہی جاتا
قبیلے کا مرے سردار جو تھا سازشی نکلا

مجیب پرواز

مجیب الرحمٰن پرواز انعامدار ابن طالب الرحمٰن طالب انعامدار، بیودہ
تاریخِ پیدائش : ۱۱ر جولائی ۱۹۶۰ء موبائیل : 9860639649
تعلیم : بی۔اے

ہم نوا، ہم نفس، ہم زباں آئینہ — اس لئے میرا طرزِ بیاں آئینہ
جائزہ اپنا لیتے رہو، کیا پتہ — لا کے رکھ دے کوئی کب کہاں آئینہ
صاف گوئی میں اپنی مثال آپ ہے — مت سمجھئے کہ ہے بے زباں آئینہ
چاہئے شوق سے کان بھر دیجئے — مجھ سے ہوگا نہیں بدگماں آئینہ
لمحہ لمحہ تری یاد میں دم بہ دم — لے رہا دیر سے ہچکیاں آئینہ
ہاں بفضلِ تعالیٰ ہیں پرواز کے — ذہن و دل آئینہ، جسم و جاں آئینہ

میٹھے ہوتے ہیں سارے ثمر پیار کے — آؤ مل کر لگائیں شجر پیار کے
پھوٹ ڈالے کوئی ان میں ممکن نہیں — ہیں یہ رشتے بڑے معتبر پیار کے
جلوہ گر ہیں محبت کی رعنائیاں — کوئی جا کر تو دیکھے نگر پیار کے
پَر کترنے کو جن کے بڑھیں قینچیاں — وہ کبوتر بنے نامہ بر پیار کے
یاد اُن کی دلوں میں بسائے چلو — ہیں یہ لمحے بہت مختصر پیار کے
یوں ہی چلتے رہیں پیار کے قافلے — یوں ہی ملتے رہیں ہمسفر پیار کے
اب ہو دہشت پسندی میں گاندھی گری — بم گریں ہر جگہ پر مگر پیار کے
آسمانِ محبت پہ اُڑتا پھروں — مجھ کو پرواز لگ جائیں پَر پیار کے

مری تشنہ لبی ہے اور مَیں ہوں　　　وہی سوکھی ندی ہے اور مَیں ہوں
سکونِ زندگی ہے اور مَیں ہوں　　　مسلسل بے کلی ہے اور مَیں ہوں
تخیّل سبز ہوتا جا رہا ہے　　　عنایت آپ کی ہے اور مَیں ہوں
کیے جاتا ہوں میں عرضِ تمنّا　　　تمھاری خامشی ہے اور مَیں ہوں
سرِ نخلِ تمنّا مسکراتی　　　بس اک ننھی کلی ہے اور مَیں ہوں
مری تصویر پہ پرواز اُن کی　　　نگاہِ سرسری ہے اور مَیں ہوں

اُجلے ملبوس میں دھبّے نہیں اچھے لگتے　　　رہنما قوم کے جھوٹے نہیں اچھے لگتے
ہوں اگر سر پہ تو تقدیسِ حیا کے ضامن　　　اور ڈھلکیں تو دوپٹے نہیں اچھے لگتے
مثلِ آئینہ ملا کر مرے بھائی مجھ سے　　　تیرے چہرے پہ مکھوٹے نہیں اچھے لگتے
اہمیت رات کے دم خم سے ہے دن کی قائم　　　سب ہی اچھے ہوں تو اچھے نہیں اچھے لگتے
جسمِ قرطاس پہ اک بوجھ لگیں جو پرواز　　　دستخط کے وہ انگوٹھے نہیں اچھے لگتے

کرشن کمار شرما कृष्णा शर्मा

کرشن کمار شرما ابن بنارسی لال شرما، اکولہ
موبائیل : 9421755417
تاریخِ پیدائش : ۲۴ رنومبر ۱۹۶۰ء
''تانک جھانک'' (طنز و مزاح)
بی۔کام۔ایم۔اے۔ایم۔فل
ملازمت : دی اکولہ جنتا کمرشیل کوآپریٹیو بنک لمیٹیڈ، اکولہ

نیند میں جیسے بچّہ ہنس دے
کاش کہ ایسا دُنیا ہنس دے
روتے روتے سویا ہوں ، پر
خواب میں کوئی چہرہ ہنس دے
دوُر نہیں وہ وقت کی آندھی
تجھ پر کوئی تنکا ہنس دے
ہُوا جلے پر نمک چھڑکنا
صحرا پر جب دریا ہنس دے
تجھ کو آتا دیکھ خوشی سے
گھر کا آنگن ، پروا ہنس دے
کبھی کبھی تو تنہائی میں
خاموشی ، سناٹا ہنس دے
غم کا کیا ہے ، اور ملیں گے
چھوڑ اُداسی ، اچھا ہنس دے

اپنی لاج سنبھالے ہیں بھئی
ہم تو لڑکی والے ہیں بھئی
صبح کمائیں ، شام پیائیں
اپنے ٹھاٹھ نرالے ہیں بھئی
مجبوری ہے کون بتائے
سب کے منہ پر تالے ہیں بھئی
پھکڑ فطرت کے مالک ہیں
کل کو کل پر ٹالے ہیں بھئی
دل ہیں برچھی ، تیر ، کٹاری
چہرے بھولے بھالے ہیں بھئی
اُن کو یہ مضمون لکھا ہے
ایک کبوتر پالے ہیں بھئی
ٹوٹ ٹوٹ کر ہوئے مکمل
ہم مکڑی کے جالے ہیں بھئی

جب بھی ہوتا ہوں میں اکیلے میں — خود کو کھوتا ہوں میں اکیلے میں
فصل اُگاتا ہوں یوں ہنسی کی مَیں — اشک بوتا ہوں میں اکیلے میں
جو رٹے نام بس تمھارا ہی — ایسا طوطا ہوں میں اکیلے میں
اُن کی یادوں کا ، اپنی آہوں کا — بوجھ ڈھوتا ہوں میں اکیلے میں
رام مندر اور بابری مسجد — دونوں ہوتا ہوں میں اکیلے میں

مِلی انگوٹھی سونے کی — عادت چھوٹی سونے کی
رام سے مِل کر راون نے — لنکا لوٹی سونے کی
خوشبو لیکر پھول کھِلا — قسمت پھوٹی سونے کی
آیا سپنا مٹی کا — نندیا ٹوٹی سونے کی
آئے کام مصیبت میں — بات انوکھی سونے کی
چلو کہ اُس پر ٹنگ جائیں — وہ ہے کھونٹی سونے کی
اکثر چاندی کھاتی ہے — قسمیں جھوٹی ، سونے کی

عبداللہ بہار

عبدالبہار ابن عبدالغفار، بتروں (اکولہ)
موبائیل : 7588090765
بی۔اے۔ڈی۔ایڈ
تاریخ پیدائش : یکم رجنوری ۱۹۶۲ء
مدرّس عثمان آزاد اردو ہائی اسکول، اکولہ

نثار دل بھی کیا اور ہر خوشی دے دی
لو آج ہم نے تمھیں اپنی زندگی دے دی

یہ کیا کیا کہ نظر سے نظر ملی بھی نہ تھی
قرار لوٹ لیا دل کو بے کلی دے دی

ہمارے حُسنِ تخیّل کا احترام کرو
تمھارے عزم کے پھولوں کو تازگی دے دی

جلا کے دل کے نشیمن کو اپنے ہاتھوں سے
تمھارے شوق کے جذبوں کو روشنی دے دی

یہ سوچ کر کہ گزر جائیں گے یہ دن اپنے
غموں کو بانٹ لیا اپنی ہر خوشی دے دی

بہارؔ لوٹ لیا کس نے قافلہ دل کا
یہ کس نے ظلم کے ہاتھوں میں رہبری دے دی

آپ رسوا ہوئے زمانے میں
اِک ذرا آئینہ دِکھانے میں

وہ کسی سے بھی ڈر نہیں سکتا
حق پہ چلتا ہے جو زمانے میں

تو نے پرکھا بھی ہے کبھی اُس کو
کتنے جوہر ہیں اس دِوانے میں

پاس رکھنا ہے کچھ انا کا بھی
”یہ قباحت ہے سر جھکانے میں“

قہر چاروں طرف برستا ہے
اِک ذرا اُس کے روٹھ جانے میں

ظلم پر بڑھ کے احتجاج کرو
چھپ کے بیٹھو نہ آشیانے میں

تبصرے، تذکرے سیاست کے!
میرؔ و غالبؔ کے آستانے میں

ہو نہ ہو یہ بہارؔ سازش ہے
زیرِ لب اُن کے مسکرانے میں

سینے میں سانس آنکھوں میں جب تک کے دَم رہے
باطل کے سامنے نہ مرا سر یہ خم رہے

موسم بھی دلفریب ہے ماحول بھی حسین
لگ جا گلے کہ کچھ تو وفا کا بھرم رہے

کردار پر نہ اپنے کبھی حرف آ سکا
دشمن کی محفلوں میں بھی ہم محترم رہے

ویسے تو یہ جہان فسانوں کا ڈھیر ہے
لیکن فسانے اپنے بہت ہی اہم رہے

ہم نے ہر ایک مسئلہ حل کر لیا مگر
باقی بہارؔ زُلف کے بس پیچ و خم رہے

اہلِ دل بھی دیکھئے اب کیا سے کیا کرنے لگے
شیشہ گر بھی پتھروں سے مشورہ کرنے لگے

دے دیا ہے تجرباتِ زندگی کو رُخ نیا
آج ہم اپنے تئیں ہر فیصلہ کرنے لگے

مسئلوں کا حل نظر آئے گا کیسے دوستو
ہم درِ اغیار پر جب التجا کرنے لگے

اس لیے وہ جو جھتے ہیں روز و شب حالات سے
جو ذرا سی بات پر جھگڑا کھڑا کرنے لگے

یہ سیاسی لوگ بنجاروں کی طرح دیکھئے
بستیوں سے دور جا کر رتجگا کرنے لگے

حضرتِ لقوبؔ کو کیا پڑھ لیا تم نے بہارؔ
صابروں کی زندگی پر تبصرہ کرنے لگے

ڈاکٹر عمران علی خاں عمراںؔ

ڈاکٹر عمران علی خاں عمراںؔ ابن مردان علی خاں نشاطؔ، اکولہ — تاریخ پیدائش : ۴ر جنوری ۱۹۶۳ء

ایم۔بی۔بی۔ایس۔ایم۔ایس — طبابت (سرجن)

"آوارگی" (شعری مجموعہ زیرِ ترتیب)

وہ ایک شخص جو اتنا اُداس لگتا ہے
نہ جانے کیوں وہ مرے دل کے پاس لگتا ہے

چمن میں رنگ فضاؤں نے جب سے ہے بدلا
ہر ایک چہرے پہ خوف و ہراس لگتا ہے

یوں غور و فکر کے دریا میں پی چکا پھر بھی
مرا وجود کیوں صدیوں کی پیاس لگتا ہے

مرا رفیق بھی اب جا ملا رقیبوں سے
بہت ذہین ہے موقع شناس لگتا ہے

دھڑکنے دل جو لگا بے کلی سی ہے طاری
جگر کے کونے میں اُن کا نواس لگتا ہے

خبر ہے گرم کہ محفل میں وہ بھی آئیں گے
یقین کم ہے زیادہ قیاس لگتا ہے

ہو روح کھوکھلی تاریک ہو ضمیر اگر
بدن بھی دیکھئے خالی گلاس لگتا ہے

برہنہ کون نہیں ہے یہاں پہ اے عمراںؔ
اگرچہ جسم پہ سب کے لباس لگتا ہے

کوئی پرواہ نہیں ہے کہ وہ سر کاٹیں گے
ہم محبت سے ہی نفرت کا اثر کاٹیں گے

عزمِ فرہاد نے اوزار سے کاٹا تھا پہاڑ
ہم رگِ گل سے بھی پتھر کا جگر کاٹیں گے

لوگ احسان کو احسان سمجھتے کب ہیں
جس کے سائے میں پلیں گے وہ شجر کاٹیں گے

پھر ترے آنے کی اُمید صبح جاگے گی
پھر تری یاد میں ہم آٹھ پہر کاٹیں گے

آپ نے اُڑنا کبھی جس کو سکھایا عمراںؔ
لکھ رکھیں یہ کہ وہی آپ کے پر کاٹیں گے

تلاشِ رزق میں جس نے ذرا اچھا بُرا سمجھا
تو پھر اس نے حقیقت میں خدا کو بھی خدا سمجھا

وہ خلوت میں وہ جلوت میں کہاں اُس سے چھپے گا تو
اگر تو یہ نہیں سمجھا بتا دے پھر کہ کیا سمجھا

ہمارا خون شامل ہے وطن کے ذرّے ذرّے میں
مگر افسوس کہ اہلِ وطن نے بے وفا سمجھا

بیانِ حسن شاعر کے تخیّل کا کرشمہ ہے
کبھی زلفوں کو وہ ناگن ، کبھی کالی گھٹا سمجھا

گنوادی جان عمرانؔ نے ہے جس کی جان کی خاطر
وہ اس کی موت کو پھر بھی فقط اک حادثہ سمجھا

آج ہم زیرِ عتاب وقت وقت کی بات ہے
آپ اور عزّت مآب وقت وقت کی بات ہے

جھوٹ ، مکّاری ، فریب اور دکھاوے کا چلن
اب یہی سب کامیاب وقت وقت کی بات ہے

بے لباسی اب تمدّن کی علامت بن گئی
کیسا پردہ کیا حجاب وقت وقت کی بات ہے

اب نہ چھیڑو دوستو باتیں لب و رُخسار کی
ڈھل چکا ہے اب شباب وقت وقت کی بات ہے

کل تلک کوڑی نہ تھی ، آج جب کرسی ملی
کھا رہا ہے بے حساب وقت وقت کی بات ہے

یاد جب وعدے دلائے ہنس کے نیتا نے کہا
ہو چکا اب انتخاب وقت وقت کی بات ہے

خیر و شر کا ذکر تم عمرانؔ کرنا چھوڑ دو
اب کسے فکرِ حساب وقت وقت کی بات ہے

التمش شمسؔ

التمش حسین شمسؔ ابن امجد حسین، اکولہ
تاریخ پیدائش : ۱رجولائی ۱۹۶۲ء
بی۔اے
ملازمت محکمۂ ڈاک وتار
''میزان'' (شعری مجموعہ زیرِ ترتیب)

تا قیامت نہیں زوال ہمیں
اُس نے بخشا ہے وہ کمال ہمیں

ہم کہ روشن کتاب والے ہیں
پوچھیے کوئی بھی سوال ہمیں

گردشِ وقت اپنے کل کی سوچ
اس قدر کر نہ پائمال ہمیں

ہم ترے عہد کی امانت ہیں
اپنے سینے میں رکھ سنبھال ہمیں

ایک بے رنگ کتاب کی صورت
میز پر یوں نہ تو اُچھال ہمیں

چاند تاروں نے آسماں سے کہا
آمدِ شمسؔ ہے سنبھال ہمیں

چلو ہم میں وفاداری نہیں ہے
مگر کیا تم میں غداری نہیں ہے

تمہارا جھک کے ملنا ہر کسی سے
بتاؤ ! کیا اداکاری نہیں ہے

کوئی منصب مجھے کیونکر ملے گا
مرا انداز درباری نہیں ہے

بڑا ہی نیک ہے وہ پارسا بھی
فقط اُس میں ملنساری نہیں ہے

حقارت سے زمانہ دیکھتا ہے
وجہ یہ ہے کہ سرداری نہیں ہے

کھلے دل کا ہے سچ کہتا ہے اکثر
ذرا بھی اُس میں ہشیاری نہیں ہے

چمکنے دو ستاروں کو فلک پر
ابھی تو شمسؔ کی باری نہیں ہے

ستارے رقص کرتے ہیں نہ تارے رقص کرتے ہیں
تری خاطر شبِ فرقت کے مارے رقص کرتے ہیں
کبھی آکر چلے جانا ، کبھی چھپنا ، کبھی ملنا
مری آنکھوں میں اب تک وہ نظارے رقص کرتے ہیں
نہ جانے مطربہ نے ساز پہ دُھن کیسی چھیڑی ہے
شریکِ بزم جتنے ہیں وہ سارے رقص کرتے ہیں
ذرا سی چھیڑ پر اے شمسؔ ان کی کیفیت یہ ہے
غضب کے مارے آنکھوں میں شرارے رقص کرتے ہیں

ایک ہم سخاوت میں گھر کا گھر لٹا بیٹھے
ایک وہ خیانت سے اپنا گھر سجا بیٹھے
روشنی کا ذمّہ جو اپنے سر لیا ہم نے
اور کچھ نہ سوجھا تو اپنا گھر جلا بیٹھے
اپنے ہار جانے کا غم نہیں ذرا مجھ کو
غم ہے میرے اپنے بھی دشمنوں میں جا بیٹھے
کس قدر بھروسہ تھا اُن کو ذاتِ اقدس پر
یونہی تھوڑی اپنی وہ کشتیاں جلا بیٹھے
کل جو ہنس کے ملتے تھے منہ چھپائے پھرتے ہیں
شمسؔ آپ کیوں اُن کو آئینہ دِکھا بیٹھے

حسین احمد واصفؔ

حسین احمد واصفؔ ابن الحاج عبدالرب، اکوٹ ضلع اکولہ
ایم۔اے(اردو) بی۔ایڈ تاریخ پیدائش : ۱۵رجولائی ۱۹۶۲ء
صدرمدرس ضلع پریشد اسکول، موہالہ، آکوٹ
"امتزاج" (شعری مجموعہ زیرِ ترتیب) تیر بہدف (طنزیہ مزاحیہ مضامین۔زیرِ ترتیب)

دعویٰ امن کریں، ہاتھ میں چاقو رکھیں
اور ہمیں درس، کہ جذبات پہ قابو رکھیں

اتنی پہچان ہی کافی ہے ریاکاروں کی
غم کا اظہار کریں، آنکھ میں آنسو رکھیں

عدل کا خون کریں، پھر بھی بہ زعمِ انصاف
اپنے ہاتھوں میں وہی لوگ ترازو رکھیں

مفلسی لاکھ سہی، پھول سے بچّے پھر بھی
میرے ہوتے ہوئے کیوں آنکھ میں آنسو رکھیں

اپنا لہجہ ہی بڑا تلخ ہے واصفؔ صاحب
کیا کسی شعر میں الفاظ کا جادو رکھیں

جو بڑا ہے اُسے چھوٹے نہیں اچھے لگتے
جس طرح پیڑ کو پودے نہیں اچھے لگتے

مُنتشر ہوتا ہے شیرازۂ ملّت جن سے
اُن کتابوں کے حوالے نہیں اچھے لگتے

اختلافات تو گھر گھر میں ہیں موجود، مگر
گھر کی ہر بات کے چرچے نہیں اچھے لگتے

گھر کی تقسیم کا میں سخت مخالف ہوں، مگر
میرے بھائی کے ارادے نہیں اچھے لگتے

سر میں بیٹی کے بہت پھیل چکی ہے چاندی
پھر بھی ماں باپ کو رشتے نہیں اچھے لگتے

کیسے ہی سخت ہوں حالات، مگر اے واصفؔ
مجھ کو تقدیر سے شکوے نہیں اچھے لگتے

اپنے روشن مستقبل کی باتیں کرتے ہیں
شاعر بھی دیوانوں جیسی باتیں کرتے ہیں

دُنیاداری صاف جھلکتی ہے کرداروں سے
ہم مسجد کی حد تک دینی باتیں کرتے ہیں

کاش عمل بھی اپنے ہوجائیں بالکل ویسے
تقریروں میں جتنی اچھی باتیں کرتے ہیں

کیا تہذیب تنزّل کی منزل تک آ پہنچی
شُرفاء بازاروں میں گھر کی باتیں کرتے ہیں

خواب سے لگتے ہیں اب سارے رشتے ماضی کے
مل ہی جاتے ہیں تو رسمی باتیں کرتے ہیں

اچھا سا منصب حاصل کرلینے کی دُھن میں
لوگ نجانے کیسی کیسی باتیں کرتے ہیں

سچّائی کو سُن کر حاکم مجھ سے کہتا ہے
ایسے لہجے میں تو باغی باتیں کرتے ہیں

بات کروں یا شعر سناؤں، دُنیا کہتی ہے
واصفؔ صاحب، ہر دَم کڑوی باتیں کرتے ہیں

امن کے دعوے، اپیلیں، اشتہار اپنی جگہ
حسبِ سابق شہر بھر میں انتشار اپنی جگہ

دن بہ دن حالات کا رُخ بد سے بدتر کی طرف
روز و شب اچھے دِنوں کا انتظار اپنی جگہ

کار، بنگلہ، کارخانے، محفلیں، ہوٹل، شراب
گھر کے اندر کی فضا ناخوشگوار اپنی جگہ

مَیں صداقت کا علمبردار، تو باطل پرست
جیت میری طے شدہ ہے، تیری ہار اپنی جگہ

اک پیادے نے صفوں کو چیر ڈالا جس گھڑی
منھ ہی تکتے رہ گئے سب شہسوار اپنی جگہ

ہم کہ رسوائی کی سب سے آخری منزل میں ہیں
اور مُسلّم اپنے پُرکھوں کا وقار اپنی جگہ

سیّد معین الدین محقؔ

سیّد معین الدین محقؔ ابن ڈاکٹر سید غیاث الدین سلیمؔ اچلپور　طبابت آیوروید
تاریخ پیدائش : ۹؍اگست ۱۹۶۳ء　موبائیل : 9730198390

ہے خود سے خوش گمانی تو کسی کا امتحاں کیوں ہو
جہاں میں کوئی بھی محقؔ کسی سے بدگماں کیوں ہو

نظر کو شوق بخشا تو سراپا آنکھ ہو جاؤں
کثافت کی کوئی چادر حجاب درمیاں کیوں ہو

نہیں جس کا مکاں اس کی محبت میں جو اُڑتا ہو
کہیں بھی مدعا اس کا سکونِ آشیاں کیوں ہو

نبی سے عشق ثابت ہو اطاعت یوں کرے تو پھر
جہاں کا تاج نہ ہو کر جہاں تو ہے وہاں کیوں ہو

وفائے حق کی عادت یوں ہو جیسے سانس لیتے ہو
رضا کی راہ کے راہی کا کوئی رازداں کیوں ہو

ارادہ کو قد آور کر، بلائیں منہ چھپائیں گی
رہے پھر دھوپ کیسی ہی تو کوئی سائباں کیوں ہو

رگِ جاں سے قریب اس کو کرو محسوس محقؔ تو
کہیں بھی کیوں نہیں ملتا، خدا تو ہے کہاں کیوں ہو

مصلحت کا چار سو تیزاب ہے
کون کس کے واسطے بیتاب ہے

آبِ اُلفت سے کوئی سیراب ہے
اور کوئی ماہیٔ بے آب ہے

چشمِ قاتل آج جو پُر آب ہے
''وہ میری تہذیب کا اک باب ہے''

طاقِ نسیاں پر دھری ہیں خواہشیں
دِل کلامِ پاک کی محراب ہے

موجِ غم پہنچیں گی ان تک بالیقیں
غم کے دریا میں اگر سیلاب ہے

ہجر میں بھی ہے وفا کی روشنی
آبروئے غم سے رُخ پر آب ہے

چاندنی سے اس کی روشن روز و شب
آسمانِ دل کا جو مہتاب ہے

تشنگی کے خون نے سینچا اسے
گلشنِ دیں دائمی شاداب ہے

ذات کا جھگڑا جہاں سے مٹ گیا
جاگتی آنکھوں کا محقؔ خواب ہے

کہاں ہیں مخفی وہ شاہزادے جیئے جو محلوں کی شان بن کر
دلوں کی بستی بسا نہ پائے ، گئے تو اُجڑا مکان بن کر
ہر ایک لمحہ حیات کا ہو چراغ حُبِّ نبیؐ سے روشن
ثنائے رب میں ہی نیند آئے اٹھو سَحَر کی اذان بن کر
ہماری اردو نبیؐ کی عربی سے مل کے شیر و شکر ہوئی ہے
یہاں کی مٹی میں خاکِ طیبہ بسی ہے مومن کی جان بن کر
گئے کہاں وہ جیئے جو حق پر ، صدائے حق ہے وفات میں بھی
ہنوز ہم سن رہے ہیں ان کو گئے جو حق کا بیان بن کر
وہ شاخِ گل جو قلم کی صورت بڑھی تھی آگے جڑیں جمانے
پہنچ نہ پائی زمینِ دل تک انا نے روکا چٹان بن کر
ہمارے بھارت کے سارے نیتا اگر سیاست نبیؐ سے سیکھیں
چمک اٹھے گا جہاں میں سارے یہ ملک سچا مہان بن کر
یزیدیت سے مقابلہ ہے حسینی لشکر بنائے رکھو
روانگی بھی مثال کی ہو جیؤ نبیؐ کے جوان بن کر
کسی نے مخفی کیا بھروسہ وراثتوں کی حفاظتوں کا
یقیں میں مالک مجھے بدل دے مَروں نہ جھوٹا گمان بن کر

کتنی بھلی ہے دنیا یا پھر بری ہے دنیا
جیسا مزاج میرا ویسی لگی ہے دنیا
اس کے سنوارنے میں حالت بگڑ رہی ہے
جو دائمی ٹھکانہ وہ دُوسری ہے دنیا
دل سے نکالنے میں تکلیف ہو رہی ہے
کن مدتوں سے میرے دل میں رہی ہے دنیا
نیچی نگاہ رکھنا دامن بچا کے چلنا
کانٹوں بھری اندھیری ٹیڑھی گلی ہے دنیا
رکھتا ہے یاد رب کو، کب کب کہاں کہاں تو
بس دیکھنے یہی تو کیسی سجی ہے دنیا
اعمال کی زباں سے جو ہیں خدا کے منکر
ان کے لئے تو آخر سب کچھ یہی ہے دنیا
معصومیت کو اپنی جس نے جوان رکھا
اس کے لئے تو یارو بوڑھی بڑی ہے دنیا
قدرت کی نعمتوں کا انکار کیوں کروں میں
عقبیٰ سنوارنے کو مجھ کو ملی ہے دنیا
میں جو بھلا ہوں مخفی سارے بھلے لگے ہیں
کیونکر کہوں بھلا میں کتنی بری ہے دنیا

صابر کمال

غلام صابر کمال شیخ ابن غلام مصطفے شیخ، اکولہ　　تاریخ پیدائش : ۱۰؍اپریل ۱۹۶۳ء
ایم۔اے (اردو، فارسی، انگلش) بی۔ایڈ۔پی۔ایچ۔ڈی
مدرس مغل نیشنل اردو ہائی اسکول، اکولہ

اپنے کشکول میں وہ شمس و قمر رکھتے ہیں　　جو قلندر ہیں زمانے کی خبر رکھتے ہیں
منزلیں ان ہی کے ہمراہ چلا کرتی ہیں　　اپنے سینے میں جو اللہ کا ڈر رکھتے ہیں
نصرتیں ان کے قدم چومتی رہتی ہیں سدا　　ہے جو دیوانے کہاں رختِ سفر رکھتے ہیں
عزم کے بوتے پہ اُڑتے ہیں بلندی کی طرف　　پر نہیں قوتِ پرواز مگر رکھتے ہیں
ہم نے اجداد سے ورثے میں یہ پایا ہے ہنر　　ہم سمندر کے تماشوں پہ نظر رکھتے ہیں
باندھ لیتے ہیں بموں کو بھی شکم سے اپنے　　دل ہے فولاد کے، لوہے کا جگر رکھتے ہیں
ان شریفوں کو تو بزدل نہ سمجھنا صابرؔ　　ٹینک اور توپ چلانے کا ہنر رکھتے ہیں

شہرِ ادب کی جس گھڑی جاگیر بن جائیں گے ہم　　کاروانِ دل کے پھر تو میر بن جائیں گے ہم
میری فرقت میں کبھی جو تم نے دیکھے تھے جناب　　ان حسیں خوابوں کی اک تعبیر بن جائیں گے ہم
تبصرہ جب بھی کرے گا کوئی ملک و قوم پر　　تو قلم، قرطاس اور تحریر بن جائیں گے ہم
جاگ جائیگا شعورِ آگہی جب تم میں تو　　خطۂ ہستی کی اک تنویر بن جائیں گے ہم
عزم لیکے دل میں اُٹھیں گے صلاح الدین سا　　اور عمر کا نعرۂ تکبیر بن جائیں گے ہم
جابروں کے ظلم کو صابرؔ مٹانے کے لیے　　حیدرِ کرار کی شمشیر بن جائیں گے ہم

گردشِ زمانہ سے کب نجات پاتے ہیں
بجلیوں کی زد پہ جو آشیاں بناتے ہیں

ظاہری نوازش کو دوستی نہیں کہتے !
دل اگر نہیں ملتا ، ہاتھ کیوں ملاتے ہیں

دیکھنا ہے تم کب تک ہم سے بیر رکھو گے
ہر قدم پہ چاہت کے ہم دیئے جلاتے ہیں

ہم نے جو زمانے کا کل سبق پڑھایا تھا
وہ اصول اب ہم کو آئینہ دکھاتے ہیں

زندگی حقیقت میں جو سمجھ کے جیتے ہیں
وہ خوشی میں روتے ہیں غم میں مسکراتے ہیں

ہم سے خوش نہیں ہوں گے مصلحت کے سوداگر
ان کے عیب ہم اکثر روشنی میں لاتے ہیں

رات کے اندھیرے میں ڈوب جاتے ہیں لیکن
صبح ہوتے ہی صابرؔ سائے سر اُٹھاتے ہیں

آئینہ ہم سرِ بازار جو لیکر نکلے
جانے کیا بات تھی ہر سمت سے پتھر نکلے

باطلِ وقت کے جب بھی کبھی لشکر نکلے.
حق پرستی کا علم لیکے بہتر نکلے

کٹ گئی عمر غریبی کے بھنور میں لیکن
اس کی جھولی سے کئی قیمتی زیور نکلے

بغض و نفرت کی ہوا چلنے لگی ہے ہر سو
آدمی گھر سے ذرا سوچ سمجھ کر نکلے

جن کے کردار پہ دنیا نے اُٹھائی انگلی
مہر و اخلاص کے وہ لوگ سمندر نکلے

حالِ دل اپنا سنائیں بھی تو کس سے صابرؔ
موم سمجھا تھا جنھیں دل کے وہ پتھر نکلے

قاضی سید احفاظ محی شجیع

قاضی سید احفاظ محی شجیع ابن قاضی سید مشتاق محی الدین نقوی، اچلپور
تاریخ پیدائش: ۴ر دسمبر ۱۹۶۳ء موبائل : 7620519200
''عکسِ ظرافت'' (طنز و مزاح، شاعری کا آغاز طنز و مزاح سے)

قدم جب گھر سے باہر کانچ کے پیکر اُٹھاتے ہیں
تو پھر ہاتھوں میں اپنے لوگ بھی پتھر اُٹھاتے ہیں
ہماری ناؤ جو بچ کر نکل آئی ہے طوفاں سے
اسے غرقاب کرنے اب کنارے سر اُٹھاتے ہیں
میں اک مجبور ہوں مظلوم ہوں اس شہر میں شاید
جبھی تو لوگ مجھ پر انگلیاں اکثر اُٹھاتے ہیں
ہماری زندگی کا ہے یہی دراصل سرمایہ
غموں کا بوجھ بھی ہم روز و شب ہنس کر اُٹھاتے ہیں
یقیناً رُخ بدل لیتی ہیں پھر سرکش ہوائیں بھی
جو ہم اپنے سفینے کا کبھی لنگر اُٹھاتے ہیں
فقط کچھ نقرئی سکّوں کی خاطر آج اہلِ فن
''قلم کس پر اُٹھانا تھا قلم کس پر اُٹھاتے ہیں''
ہزیمت دونوں عالم میں فقط ان کا مقدر ہے
جو بچے سامنے اپنے بڑوں کے سر اُٹھاتے ہیں
نکلتے ہیں جو آنسو دوستو چشمِ ندامت سے
فرشتے آسماں سے آکے یہ گوہر اُٹھاتے ہیں
جو تقلیدِ پیمبر کو شعارِ زندگی کرلیں
مزہ جینے کا ایسے لوگ ہی بہتر اُٹھاتے ہیں
شجیعؔ مطلب کی دنیا ہے بچو مطلب پرستوں سے
جو مطلب کے لئے قرآن بھی سر پر اُٹھاتے ہیں

کھنکتے سکّوں کی ارتھی جہاں سے گذری ہے
غریبی کاسہ لئے پھر وہاں سے گذری ہے
ہمارے دل کی لگی جب گماں سے گذری ہے
''وہ کبھی زمیں تو کبھی آسماں سے گذری ہے''
ابھی تو حلقۂ زنجیر پاؤں میں ہے مرے
ابھی صدا مری آہ و فغاں سے گذری ہے
چڑھا کے آگ پہ ہانڈی میں بھوک بچوں کی
تسلّی ماں کی بڑے امتحاں سے گذری ہے
لکیر کھینچ دی نفرت کی دو قبیلوں میں
کبھی جو تیغ ہوس درمیاں سے گذری ہے
سجا دئے گئے کانٹے دلوں کے آنگن میں
تعصبات کی دیوی جہاں سے گذری ہے
انھیں ملے گا بھلا کیسے منزلوں کا نشاں
کہ منزلوں کی طلب کارواں سے گذری ہے
رہا شجیعؔ بھی ماں کی دعاؤں کا محتاج
حیات جب بھی کسی امتحاں سے گذری ہے

تم اپنی یادوں کی کہکشاں سے سجا ہُوا آسمان بن کر
مرے تصور پہ چھا بھی جاؤ محبتوں کا جہان بن کر

گھٹائیں بادل یہ چاند تارے حسین قدرت کے سب نظارے
چمن میں تتلی گگن میں پنچھی اُڑے ہیں فطرت کی شان بن کر

اگر چہ طوفان سر اُٹھائے زمانہ یوں ہی ہمیں ستائے
ہماری جرأت رہے سلامت کھڑے ہیں ہم تو چٹان بن کر

ہمیں نے سینچا ہے اس چمن کو ہمیں سے اُردو کا بانکپن ہے
"ہمارے خونِ جگر کی خوشبو مہک رہی ہے زبان بن کر"

فضا میں نغمے محبتوں کے زمیں پہ چرچے صداقتوں کے
کریں گے ماحول ایسا برپا ہم امن کے ترجمان بن کر

یزیدی بیعت کا ذکر چھوڑو حُسینی فطرت سے ناطہ جوڑو
تمھیں رہوگے ہمیشہ زندہ جہاں میں حق کا نشان بن کر

عجب زمانہ تھا وہ زمانہ عجب ہے اُن کا حسیں فسانہ
وہ جن کے چہروں سے نور برسے رہیں جو سب کی امان بن کر

ہے ماں کے آنچل کی ٹھنڈی چھاؤں تو کیوں نہ اپنی تھکن مٹاؤں
وہ میری ہستی کے گرم صحرا پہ رہتی ہے سائبان بن کر

مجیحؔ الفت کے گیت گاؤ رہِ طلب میں یہ جان لٹاؤ
رہوگے زندہ حکایتوں میں وفا کی تم داستان بن کر

وہی منصف کی نگاہوں میں گنہگار لگے
جو بے گناہ صداقت کا طلب گار لگے

امیر شہر کی کوٹھی مثالِ تاج محل
اِدھر غریب کی کٹیا بس اک مزار لگے

ہمارے نام کی تختی تھی جن کے دل پہ لگی
ہمارا ذکر بھی اب ان کو ناگوار لگے

ہزار گردشِ دوراں نے کوششیں کی ہیں
ہمیں تو طوق و سلاسل گلے کا ہار لگے

چلو کہ راہ میں طوفان اور بھی ہیں بہت
بڑھو کہ قافلہ منزل سے ہمکنار لگے

خدا کرے کہ سنور جائے گلشنِ ہستی
ہماری بات زمانے کو لالہ زار لگے

مجیحؔ ماں کی محبت بھری بس ایک نظر
زمینِ خشک پہ برسات کی پھوار لگے

محب الرحمٰن وفاؔ

محب الرحمٰن وفاؔ ابن طالب الرحمٰن انعامدار، بیودہ (امراوتی) تعلیم : B.E.
تاریخ پیدائش : ۲۶/ اکتوبر ۱۹۶۴ء موبائیل : 9892737625
لکچرر کاشی بائی اگروال ووکیشنل جونیئر کالج، بیودہ
"آئینہ کا شخص" (شعری مجموعہ زیرِ ترتیب)

آج یوں ہی ہم سے وہ شکوہ گلہ کرنے لگے
لوگ اس پر جانے کیا کیا تبصرہ کرنے لگے

وہ مری معصومیت کے معترف ہوجائیں گے
اپنے دل کو سنگ سے جو آئینہ کرنے لگے

چاند جب نکلا تو جانے کون یاد آیا ہمیں
ہم اچانک جانے کس کا تذکرہ کرنے لگے

عیب خود میں، دوسروں میں خوبیاں آئیں نظر
ہم جو اپنی زندگی کا تجزیہ کرنے لگے

ڈھنگ سے چلنا زمیں پر آج تک آیا نہیں
گو خلاء میں مرتسم ہم نقشِ پا کرنے لگے

لاٹھیوں کے وار سے ہوتا ہے کب پانی جدا
بھائی کو بھائی سے تم ناحق جدا کرنے لگے

خود کو انساں کے نشانے سے بچائیں کس طرح
جانور آدم گزیدہ مشورہ کرنے لگے

دشمنوں نے آج جو دیکھا مرا حُسنِ سلوک
وہ وفاؔ اپنا نشانہ خود خطا کرنے لگے

وفا کی آگ میں پہلے پگھل کے دیکھو تو
ہے عشق کیا یہ سمجھ لوگے جل کے دیکھو تو

وہ سنگِ راہ نہیں کوہِ نور ہیرا ہے
نظر کے زاویے اپنے بدل کے دیکھو تو

سکونِ دل کا خزانہ ضرور پاؤگے
ہوس کے ناگ کو پہلے کچل کے دیکھو تو

ہر ایک آنکھ کا آنسو تمھارا اپنا ہے
حصارِ ذات سے باہر نکل کے دیکھو تو

تونگروں کی ضیافت کو جان جاؤگے
ذرا یہ قیمتی کپڑے بدل کے دیکھو تو

ہے حق کا راستہ کیا خود بخود سمجھ لوگے
دہکتی آگ پہ دوگام چل کے دیکھو تو

خود اپنی اصل حقیقت کو جان لوگے وفاؔ
تم آئینے کو کبھی آنکھ مَل کے دیکھو تو

وہ خود کو ریشمی کپڑوں سے اہلِ زر سمجھتے ہیں
سرابوں کی چمک کو جھیل کا منظر سمجھتے ہیں

ادب کے آسماں پر ہے ستاروں تک چمک جن کی
انھیں منزل نہیں ہم میل کا پتھر سمجھتے ہیں

مرے بچے بہل جاتے ہیں کاغذ کے کھلونوں سے
غریبی کے تقاضے کیا ہیں وہ بہتر سمجھتے ہیں

چٹائی پر ہی میٹھی نیند سوجاتے ہیں محنت کش
اسے کمخواب کا آرام وہ بستر سمجھتے ہیں

سمندر اپنے آپے سے کبھی باہر نہیں ہوتا
مگر بارش میں نالے خود کو ہی برتر سمجھتے ہیں

ہم اپنے فکروفن سے اس میں گُل بوٹے کھلائینگے
زمیں کچھ سخت ہے تو ناسمجھ بنجر سمجھتے ہیں

گویّوں اور نقالوں کی بھی بن آئی ہے اب تو
وفاؔ وہ شعر گوئی کو بھی لقمہ تر سمجھتے ہیں

کڑی دھوپ میں سایہ آور بہت ہے — مری ماں کا آنچل ہے سر پر بہت ہے
ہوس کے لئے ہیں یہ ایوان تھوڑے — قناعت کو اک پھوس کا گھر بہت ہے
وہ سورج ہے بے شک مگر اس کے آگے — مرا ہونا ذرّہ برابر بہت ہے
محافظ ہے جو کارواں کا ہمارے — اسی شخص سے تو ہمیں ڈر بہت ہے
مبارک ہو کمخواب کا تم کو بستر — ہمیں ٹاٹ کی ایک چادر بہت ہے
اے ایمان والو یہ نشتر ہے پنہاں — کہ اب خیر کے نام پر شر بہت ہے
وفاؔ دل کی تشنہ لبی کے لئے تو — بس اخلاص کا ایک ساغر بہت ہے

احمد نثار

شیخ نثار ابن شیخ غلام دستگیر، بھادولہ (بلڈانہ)
ایم۔اے (اردو)
"تجزیۂ حیات" (مجموعۂ غزلیات، زیرِ طباعت)
موبائل : 9422561677
تاریخ پیدائش : ۱۲؍نومبر ۱۹۶۳ء

دبی چنگاریوں سے جب کوئی شعلہ جواں ہوگا
خموشی چیخ اٹھے گی اور انساں بے زباں ہوگا

کبھی تم بھی تو دیوارِ انا کو توڑ کر دیکھو
محبت کے سوا کچھ بھی نہ اپنے درمیاں ہوگا

مزاجِ وقت میں یکسانیت دیکھی کبھی تم نے
خفا ہے آج جس پر کل اُسی پر مہرباں ہوگا

کوئی ہوگا مفاد اس کا یقیناً تم سے وابستہ
امیرِ شہر کیا یونہی کسی پر مہرباں ہوگا

ہمارے قافلے کی گر یہی حالت رہی تو کل
"نہ گردِ کارواں ہوگی، نہ شورِ کارواں ہوگا"

نثار اپنے سخن میں تجربہ ہے زندگانی کا
ہمارے درد کا احساس لہجے سے بیاں ہوگا

کہاں کہاں نہ گئی مہربان کی خوشبو
زمانے بھر میں ہے اردو زبان کی خوشبو

بدن سے جس گھڑی نکلے گی جان کی خوشبو
ملے گی خاک میں تب آن بان کی خوشبو

قدم بھٹکتے ہیں جذبات کے اندھیروں میں
تو کھینچ لاتی ہے مجھ کو مکان کی خوشبو

جو حق کے واسطے دینا پڑے زمانے میں
عجیب ہوتی ہے اُس امتحان کی خوشبو

یہاں پہ پیار ہے یکجہتی بھائی چارا ہے
بڑی ہی خوب ہے ہندوستان کی خوشبو

جوان ہوں گے جو سازش کی گود میں فتنے
کہاں سے آئے گی امن و امان کی خوشبو

وفا، خلوص، دیانت، حیا، صداقت، پیار
نثار ہم بھی لٹاتے ہیں شان کی خوشبو

زندگی کی راہ میں تنہائیاں رکھ دے گا وہ
اپنی یادوں کی فقط پرچھائیاں رکھ دے گا وہ
آخری دم تک جو گونجے گی خیالوں میں ترے
درد کی کچھ اس طرح شہنائیاں رکھ دے گا وہ
اُس کے لہجے میں اَنا ، اور تلخیاں گفتار میں
کڑوی باتوں میں مگر سچائیاں رکھ دے گا وہ
اُس کو آتا ہے مزاجوں کو بدلنے کا ہنر
فطرتِ بد میں کئی اچھائیاں رکھ دے گا وہ
مفلسی ، فاقہ کشی ، دشواریوں کا سامنا
آزمائش کو یہ سب کٹھنائیاں رکھ دے گا وہ
اپنے تیور اور اندازِ بیاں سے اے نثارؔ
سادے لفظوں میں بھی کچھ گہرائیاں رکھ دے گا وہ

فکر کے شعلوں میں جلتی زندگی
تب نکھرتی ہے ہماری زندگی
ہم نے دیکھا حادثوں کی بھیڑ میں
موت سے منہ سے نکلتی زندگی
جب یہ کرتی ہے تمہارا انتظار
تب نہیں کاٹے سے کٹتی زندگی
گود سے ہے گور تک بے چینیاں
المیہ ہے بیٹیوں کی زندگی
سینچا جائے گر مشقت سے اسے
پھول کی صورت مہکتی زندگی
پھول ، پتھر ، آگ اور شبنم نثارؔ
روپ ہے کتنے بدلتی زندگی

عظیم نواز راہیؔ

عظیم نواز خاں راہیؔ ابن مراد نواز خاں، ساکر کھیرڑا، بلڈانہ　　تاریخ پیدائش : یکم مئی ۱۹۶۵ء
تعلیم : درجہ نہم　　موبائیل : 09421396669
''پودا میرے آنگن کا'' (شعری مجموعہ)

امید کیا تھی اور وہ کیا دے گیا مجھے　　کچھ اپنا کچھ مرا ہی دیا دے گیا مجھے
یہ وقت بھی عجیب ہے، جو وقفے وقفے سے　　انداز سوچنے کا نیا دے گیا مجھے
اُس خوش مزاج دوست کے قربان جایئے　　ہر زخم مسکرا کے نیا دے گیا مجھے
جو میرا ہم سفر تھا، بڑا ہی عجیب تھا　　اپنی جگہ سے اُٹھ کے جگہ دے گیا مجھے
شاعر نہیں ہوں پھر بھی میں شاعر نواز ہوں　　اندازِ شاعرانہ خدا دے گیا مجھے
جب تلخیاں حیات کی حد سے بڑھیں نوازؔ　　تب جینا اِک الگ سے مزہ دے گیا مجھے

خیر سے فرض کچھ ادا تو ہو　　جس سے راضی ترا خدا تو ہو
ابرِ رحمت کو جوش آجائے　　لب پہ ایسی کوئی دعا تو ہو
روبرو ہوگی خود بخود منزل　　گامزن کوئی قافلہ تو ہو
چھو تو لوں گا بلندیوں کو مگر　　دل میں پُرجوش ولولہ تو ہو
درد سے آشنا ہوئے تو کیا　　درد سے دل بھی آشنا تو ہو
ہم تو تسلیم کر ہی لیں، لیکن　　حق بجانب وہ فیصلہ تو ہو
ضبطِ غم کے ہی واسطے اے نوازؔ　　کوئی بھرپور قہقہہ تو ہو

آئے گا انقلاب ذرا دیکھتے رہو
ہوگا وہ لاجواب ذرا دیکھتے رہو

دار و رسن کی دیکھ لیں زینت بنے گا کون
ہو کس کا انتخاب ذرا دیکھتے رہو

مخمور آنکھیں اُٹھ گئیں جو آسماں کی سمت
برسے گی اب شراب ذرا دیکھتے رہو

پردہ کئے جو بیٹھے بھری انجمن میں تھے
ہوں گے وہ بے نقاب ذرا دیکھتے رہو

خط لکھ کے حالِ دل اُنھیں بھیجا تو ہے مگر
آئے گا کیا جواب ذرا دیکھتے رہو

یہ حُسن یہ ادا یہ جوانی بھی اے نوازؔ
ہو جائیں گے یہ خواب ذرا دیکھتے رہو

ہر طرف اضطراب ہے یارو
وقت کتنا خراب ہے یارو

ایک اِک پل میں کرب ہے کتنا
لمحہ لمحہ عذاب ہے یارو

ہر طرف توڑ پھوڑ کی سازش
یہ بھی اِک انقلاب ہے یارو

آج اینٹوں کی سرکشی کیلئے
پتھروں کا جواب ہے یارو

رہبرِ وقت ، وقت کے رہزن
کیا عجب انتخاب ہے یارو

جینا دشوار ، زندگی مشکل
اِک طرح کا عتاب ہے یارو

غم کی تحریر کہہ رہی ہے نوازؔ
چہرہ چہرہ کتاب ہے یارو

قاسم عمرانؔ

سیّد قاسم عمرانؔ ابن سیّد غفار، بالاپور — تاریخ پیدائش : ۳ رجولائی ۱۹۶۵ء
بی۔اے۔بی۔ایڈ — تدریس ضلع پریشد اسکول، اکولہ

وطن کی آن بچانے میں پیش دستی رہی
شبہ میں پھر بھی ہماری وطن پرستی رہی

پیامِ امن کے نعروں کا شور تھا برپا
لگی تھی آگ جو بستی میں وہ دہکتی رہی

سمندروں کا بلاوا تھا وہ بھی کیا کرتا
گزرتے ابر کو پیاسی زمین تکتی رہی

ہوا نہ جانے بدن کس کا چھو کے آئی تھی
گلی ہماری کئی روز تک مہکتی رہی

بچا ہے قدروں کی عمرانؔ پاسبانی کیا؟
ضمیر مرتا گیا اور انا پنپتی رہی

میری بستی میں شوالہ بھی نہیں ہے کوئی
خواہ مخواہ پوچھنے والا بھی نہیں ہے کوئی

روئیے دل کو، جگر پیٹیے، کچھ بھی کیجے
حالِ دل پوچھنے والا بھی نہیں ہے کوئی

آپ منزل پہ پہنچ آئے ہیں مجھ سے پہلے
آپ کے پاؤں میں چھالا بھی نہیں ہے کوئی

یوں مسلسل مجھے غدار نہ کہتے جائیں
آپ کے پاس حوالہ بھی نہیں ہے کوئی

ہم نمک خوار تو اردو کے ہیں عمرانؔ مگر
گھر میں اُردو کا رسالہ بھی نہیں ہے کوئی

زندگی ہم تو سمجھتے تھے بسر ہوجائے گی
کیا خبر تھی یوں مسلسل دردِ سر ہوجائے گی

آپ اپنی صورتِ زیبا کو شیشے میں حضور
غور سے اتنا بھی نہ دیکھیں نظر ہوجائے گی

نکتہ چینو! بس ذرا سا دھن کما لینے تو دو
دیکھنا پھر میری ہر خامی ہنر ہوجائے گی

ہاں یہی ہوگا مرا سچ چیختا رہ جائے گا
آپ کی جھوٹی کہانی معتبر ہوجائے گی

آرزو پوری نہیں ہوتی یہاں عمرانؔ تم
نوچ لو کونپل ہی ورنہ یہ شجر ہوجائے گی

مَیں نے ہر درد کو اک بیتی کہانی سمجھا
خون جو آنکھ سے ٹپکا اُسے پانی سمجھا

مجھ کو مغرور نہ سمجھے اے مری خاموشی
جا اُسے گہرے سمندر کی روانی سمجھا

اپنے حالات سنائے تھے اُسے شعروں میں
وہ مرے شعر کو اپنی ہی کہانی سمجھا

اپنے قاتل پہ مجھے رحم بہت آتا ہے
جذبۂ عشق کو معصوم نے فانی سمجھا

وہ ہے عمرانؔ سماجوں کے اصولوں کا غلام
اس کو ناحق نہ محبت کے معانی سمجھا

محمد نسیم نواز

محمد نسیم نواز ابن محمد نصیر، انجن گاؤں سورجی (امراوتی) تاریخ پیدائش : ۳۰ دسمبر ۱۹۶۵ء
بی۔ ایس۔ سی۔ بی۔ ایڈ۔ ڈی فارم
سائنس ٹیچر، نگر پریشد اردو ہائی اسکول انجن گاؤں سورجی

ذرا سی بدگمانی دل میں نفرت ڈال دیتی ہے
وراثت بھائی بھائی میں عداوت ڈال دیتی ہے

محبت کی نظر سے دیکھتا ہوں ماں کی جانب جب
مرے حصے میں وہ قدموں کی جنت ڈال دیتی ہے

کوئی ناز و ادا سے جیت لیتا ہے کسی کا دل
کسی کی سادگی دل میں محبت ڈال دیتی ہے

سنا ہے میں نے، نیند آتی نہیں، گر پیٹ خالی ہو
غریبی ایسا نسخہ ہے یہ عادت ڈال دیتی ہے

صلہ اپنی وفا کا یوں حکومت ہم کو دیتی ہے
کہیں بھی حادثہ ہو ہم پہ تہمت ڈال دیتی ہے

وفا کا درس گر ہو سیکھنا سیکھو نواز اُس سے
فنا ہو کر ہتھیلی میں جو رنگت ڈال دیتی ہے

کہاں میں زر کے سمندر تلاش کرتا ہوں
خلوص و پیار کے پیکر تلاش کرتا ہوں

تلاش کرتا نہیں دوسروں کے عیب کبھی
خود اپنی ذات کے اندر تلاش کرتا ہوں

میں دشمنی بھی کسی سے کروں تو کیسے کروں
حریف قد کے برابر تلاش کرتا ہوں

جلائے پیار کے دیپک، بجھائے نفرت کے
میں اُن ہواؤں کا لشکر تلاش کرتا ہوں

ہتھیلیوں کی لکیروں پہ کیا یقین کروں
میں حوصلوں سے مقدر تلاش کرتا ہوں

نفس نفس میں تو ہی تو نسیمؔ سانسوں میں
میں تجھ کو جسم کے باہر تلاش کرتا ہوں

اے یار اب نہ دینا کوئی مشورہ مجھے
مَیں دیکھتا ہوں آئینہ اور آئینہ مجھے

کیسے کروں بتا میں ترا شکریہ ادا
تیرے فریب نے دیا اپنا پتہ مجھے

ساحل کی بزدلی تو قدم روکتی رہی
طوفاں کا شکریہ کہ دیا حوصلہ مجھے

ہے چار دن کا حسن ترا، اے زمیں کے چاند
کہتا ہے بار بار یہی آئینہ مجھے

وہ آج ایک چوٹ سے بکھرا ہے چار سو
جو ہنس رہا تھا دیکھ کے کل غمزدہ مجھے

خونِ جگر نچوڑ کر لکھتا ہوں میں غزل
ملتا ہے جب بھی کوئی نیا قافیہ مجھے

مَیں حضرتِ نوازؔ کا دشمن غلط غلط
بدنام کر رہا ہے کوئی بے وجہ مجھے

دھڑکنے والا دل بھی تھم گیا ہے
چھڑا کر ہاتھ جب ہمدم گیا ہے

تمھاری یاد کا ہلکا سا جھونکا
مری پلکوں کو کر کے نم گیا ہے

خزاں جیسا لگا ہر ایک موسم
وہ دل کو دے کے ایسا غم گیا ہے

اُدھر ماں نے خطائیں بخش دی پھر
اِدھر بیٹے کا اُس کے دَم گیا ہے

نوازؔ بے نوا تجھ کو مبارک
بلندی پر ترا پرچم گیا ہے

عارفؔ زماںؔ

عارف اللہ خاں زماںؔ ابن عطا اللہ خاں، بالاپور	موبائیل : 8275557031
H.S.S.C.	تاریخ پیدائش : ۱۰ر اکتوبر ۱۹۶۵ء

مہرِ تاباں ہوں ڈھل رہا ہوں مَیں	وقت کے ساتھ چل رہا ہوں مَیں
فضلِ رب سے ہُوا موافق ہے	بُجھنے والا تھا جل رہا ہوں مَیں
میرا محبوب شاخِ گُل جیسا	سوچ کر ہی مچل رہا ہوں مَیں
اُس کو پانا بہت کٹھن تھا مگر	اِس مشن میں سپھل رہا ہوں مَیں
قدر کی جائے میرے شعروں کی	لوگو ! موتی اُگل رہا ہوں مَیں
اک طرف رکھ دیا ہے اپنا مزاج	حسبِ موسم بدل رہا ہوں مَیں
رہ گذر عشق کی ارے توبہ	جیسے شعلوں پہ چل رہا ہوں مَیں
لوگ مرجاتے ہیں زماںؔ اُن میں	جن مسائل میں پل رہا ہوں مَیں

میری کوشش کا ثمر ہے مختلف	پیار کا اُس پر اثر ہے مختلف
ساری دنیا میں نہیں اس کی مثال	سب سے وہ رشکِ قمر ہے مختلف
دل مرا تسکین پاتا ہے یہاں	میرے گھر سے تیرا گھر ہے مختلف
اس کو بھاتی ہیں خطائیں بھی مری	ماں کا اندازِ نظر ہے مختلف
مجھ سے اکثر متفق ہوتا تو ہے	کیا ہُوا مجھ سے اگر ہے مختلف
ہوگئی دشوار راہِ زندگی	مجھ سے میرا ہمسفر ہے مختلف
مطمئن ہے رنج و غم میں بھی زماںؔ	در حقیقت وہ بشر ہے مختلف

راہ منزل کی مسافر کو سُجھاتے ہیں چراغ
روشنی کر کے اندھیروں کو مٹاتے ہیں چراغ

جن کی آنکھیں نہیں ان کے لیے بے فیض مگر
آنکھ والوں کے بہت کام بناتے ہیں چراغ

دن نکلتا ہے تو ہوجاتے ہیں یہ بے وقعت
ظلمتِ شب میں مگر رنگ جماتے ہیں چراغ

یاد کرتا ہوں مَیں اس رشکِ قمر کو ایسے
جس طرح لوگ اندھیرے میں جلاتے ہیں چراغ

ڈر کے تاریکی سے جو ترکِ سفر کرتا ہے
حوصلہ ایسے مسافر کا بڑھاتے ہیں چراغ

چین سے بیٹھنا لوگوں کو کہاں آتا ہے
"خود نہیں رکھتے تو اوروں کے بجھاتے ہیں چراغ"

درس دیتے ہیں محبت کا زماںؔ کو اکثر
لوگ نادان ہیں سورج کو دکھاتے ہیں چراغ

شور اُس کے مکاں سے اُٹھتا ہے
کیا وہ مفلس جہاں سے اُٹھتا ہے

شک، تعلق خراب کرتا ہے
فتنہ وہم و گماں سے اُٹھتا ہے

دَم میں بچھ جاتی ہے صفِ ماتم
تُو اگر درمیاں سے اُٹھتا ہے

دنیا جھوٹوں میں بٹ گئی دیکھیں
نعرۂ حق کہاں سے اُٹھتا ہے

شہر میں کس طرف لگی ہے آگ
"یہ دھواں سا کہاں سے اُٹھتا ہے"

ڈوڈو انسانیت کی خوشبو کا
پیاری اردو زباں سے اُٹھتا ہے

عشق میں آدمی زماںؔ اوپر
فکرِ سود و زیاں سے اُٹھتا ہے

محمد رفیق ندوی شاؔد

محمد رفیق ندوی شاؔد ابن ابوالحسن، اکولہ
عالم و فاضل دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ
تاریخ پیدائش : ۵ دسمبر ۱۹۶۵ء

انسان مال و زر کا پرستار ہوگیا ۔ آسان اب ضمیر کا بیوپار ہوگیا
مجرم دماغ جرم کا بیمار ہوگیا ۔ دنیا سمجھ رہی ہے کہ فنکار ہوگیا
جس نے چلائی ظلم و تعصب کی آندھیاں ۔ قانون کیسے اُس کا مددگار ہوگیا
لے دے کے نوکری پہ چڑھے کہہ رہے ہیں لوگ ۔ بھگوان کی دیا سے چمتکار ہوگیا
احباب میرے چہرے سے پڑھتے ہیں حادثے ۔ گویا کہ حادثوں کا میں اخبار ہوگیا
رکھی ہے تو نے میرے لئے قبر کی زمین ۔ تیرے طفیل میں بھی زمیں دار ہوگیا
پڑھ لکھ کے بیٹا اتنا بڑا ہوگیا کہ آج ۔ ماں باپ سے ہی برسرِ پیکار ہوگیا

نئی دوستی کے فسانے بہت ہیں ۔ مگر دشمنی کو بہانے بہت ہیں
جہاں عورتیں حکمراں ہوگئی ہیں ۔ وہاں عالمی تانے بانے بہت ہیں
سنبھلنے کو اہلِ وطن کے لئے بھی ۔ دکھائے جو جلوے خدا نے بہت ہیں
ہے اِستار ٹی وی کا تحفہ یہ شاید ۔ کہ بچے ہمارے سیانے بہت ہیں
غزل وہ جو مردہ دلوں کو جلا دے ۔ گلوں بلبلوں کے ترانے بہت ہیں
سلامت رہے شاؔد روشن ضمیری ۔ تو محنت کے دو چار آنے بہت ہیں

بلندی منزلوں کی عزم سے بڑھ کر بناتا ہوں
نشانِ راہ خورشید و مہ و اختر بناتا ہوں
یہ اپنا ذوق ہے کہ پتھروں کے شہر میں رہ کر
تمہارے واسطے شیشے کا ہمدم گھر بناتا ہوں
مصائب سے نہ گھبرانا مری فطرت میں شامل ہے
غم و رنج و الم کا روز اِک دفتر بناتا ہوں
مرے شاہیں صفت بچے حدِ پرواز تک پہنچیں
کچھ اِس انداز سے میں اُن کے بال و پر بناتا ہوں
ہوں اپنی قوم کا جراح ، یوں کہتے ہیں اہلِ فن
اِسی خاطر میں فکر و فن کے کچھ نشتر بناتا ہوں
مری غزلوں کا اک اک شعر گویا ایک سپاہی ہے
"میں کاغذ کے سپاہی کاٹ کر لشکر بناتا ہوں"
کہاں ممکن ، وہ اپنے شادؔ سے باتیں کریں دل کی
خیالوں میں وصالِ یار کے منظر بناتا ہوں

کہاں ہیں سب کے سب فنکار اپنے
لئے پھرتے ہیں جو پندار اپنے
رقم تاریخ میں شہکار اپنے
ہمیشہ حوصلے ہتھیار اپنے
پرندے پھڑ پھڑا کر گر رہے ہیں
سنبھالو گنبد و مینار اپنے
نہیں دس بیس پر موقوف ہستی
ہیں لاکھوں سر بکف تیار اپنے
ہمیں تخریب کے طعنے نہ دینا
جہاں بھر کے ہیں سب معمار اپنے
اُنھیں کہتے ہو اپنے گھر کو جائیں
بھلا بیٹھے ہیں جو گھر بار اپنے
تمہاری سختیاں ہیں بے زروں پر
یہ پوچھو تھے کہاں زردار اپنے
ہمیشہ موت کے سوداگروں سے
بھرے ہیں کوچہ و بازار اپنے
اگر ہے امن کی خواہش ، ہٹاؤ
ہمارے گھر سے پہریدار اپنے

عبدالرشید قمرؔ

عبدالرشید قمرؔ ابن عبداللطیف، بیودہ (امراؤتی) موبائیل : 9175368281
درس و تدریس تاریخِ پیدائش : ۱۲؍جون ۱۹۶۷ء

دی مے ناب تو اب ساغرِ جم بھی دے دے
دل دیا ہے تو مجھے تابِ الم بھی دے دے

بارِ سر کب سے لیے ہم سرِ مقتل ہیں کھڑے
باخدا اب تو ہمیں اذنِ قلم بھی دے دے

حُسن پر ناز کا اندازِ تبسم توبہ !
کیوں نہ دیوانہ ترے عشق میں دم بھی دے دے

ایسے فنکار پہ لعنت ہے جو چند سکوں میں
دل بھی دے، ذہن بھی دے اور قلم بھی دے دے

شوخ وہ ، تشنہ لبی سے مری کھیلے ہے قمرؔ
جام بھی پیش کرے اور قسم بھی دے دے

روپ بدلے گا پھر اس کا چھل اور بھی
دیکھ اے دل سنبھل تو سنبھل اور بھی

داغ آئے نظر ان کے دامن پہ کیا
وہ تو لائے ہیں گنگا سے جل اور بھی

خاک ہونا ہی عاشق کی معراج ہے
مثلِ پروانہ پہلے تو' جل اور بھی

ان کا بچنا سمجھ لے تری موت ہے
ہیں سنپولوں کے پھن یہ کچل اور بھی

صرف صحرا نہیں سبزہ و گل بھی ہیں
آرزوئیں جواں ہے تو چل اور بھی

شوقِ دیدار بڑھتا ہی جائے قمرؔ
''لن ترانی'' تو سن کر مچل اور بھی

عجب کیا حوصلے اے دل ہمارے ٹوٹ جاتے ہیں
عتابِ گردشِ دوراں سے تارے ٹوٹ جاتے ہیں
ہوئی ہیں ریزہ ریزہ خود چٹانیں ہم سے ٹکرا کے
مگر ہم دیکھ کر آنسو تمہارے' ٹوٹ جاتے ہیں
میں چاہوں مسکرانا تو چھلک جاتے ہیں اب آنسو
کہ اکثر سیلِ دریا سے کنارے ٹوٹ جاتے ہیں
نصیحت ! اے مری بیٹی ہمیشہ دھیان میں رکھنا
سہاروں پر نہ تکیہ ہو سہارے ٹوٹ جاتے ہیں
قمرؔ اس بزمِ دنیا سے نبھائیں اپنا رشتہ کیا !
جو ٹوٹی سانس تو رشتے ہی سارے ٹوٹ جاتے ہیں

ظلم و ستم کا جبر کا انجام کیا ہُوا
تھا نامور تو خوب مگر نام کیا ہُوا
یہ پوچھتی ہے وقت کی دیمک بتا ذرا
جمشید تو کہاں ہے ترا جام کیا ہُوا
جلتے مچلتے غم میں پگھلتے رہے مگر
آئی جو صبح بھول گئے شام کیا ہُوا
میرا دیا بجھا نہ سکی سرپھری ہَوا
روٹھی ہے تو بھی گردشِ ایّام کیا ہُوا
راون تھا تو اُف کی بھی جرأت کسی میں تھی؟
بن باس مل گیا جو قمرؔ رام کیا ہُوا

ضمیر احمد خاں

ضمیر احمد خاں ابن صفدر علی خاں، ریتھ پور (امراوتی) موبائیل : 8275395996
تاریخ پیدائش : ۷ رجولائی ۱۹۶۷ء
بی۔اے۔ڈی۔ایڈ مدرس نگر پریشد اردو پرائمری اسکول، موری ضلع امراوتی

وصفِ شفا دواؤں میں حکمِ خدا سے ہے
یہ سوچنا غلط ہے کہ سب کچھ دوا سے ہے

پیالہ بھرا جو غم کا وہ میری خطا سے ہے
پت جھڑ سے ہے گلہ نہ شکایت ہوا سے ہے

یہ کس نے کہہ دیا ہے کہ در در کی خاک چھان
جنت کا سیدھا راستہ ماں کی دعا سے ہے

مجبور ہوگیا ہے ضعیفی میں جو شجر
اُس کا یہ حال اپنے پھلوں کی خطا سے ہے

لقمہ نہیں ہے پیٹ میں جس کے کوئی حلال
وہ شخص اپنی ذات کا دشمن سدا سے ہے

مَیں اُس کے پاس پاس سرکتا وہ دور دور
سایہ بھی دیکھو پھول کا روٹھا سدا سے ہے

میں مانتا ہوں اردو کا احسان ہے ضمیرؔ
لفظوں میں چاشنی تو غزل کی وفا سے ہے

یہ ضروری نہیں ہے جہاں دیکھنا
وہ جدھر کو چلے بس وہاں دیکھنا

ان کی قسمت میں تھی ایسی منظر کشی
پنکھڑی سے لبوں پر دھواں دیکھنا

کوئی آتا نہیں، کوئی جاتا نہیں
ایسا سنسان کوئی نشاں دیکھنا

پیڑ نے اپنے پھل کو سکھایا نہیں
دوسروں کے گھروں میں اماں دیکھنا

لے گیا جو بچھڑ کے ملا تھا ابھی
ایسے عالم میں دل کا سماں دیکھنا

عمر کہتی ہے چھوڑو بڑا یہ چلن
چلتے پھرتے نظر سے جواں دیکھنا

میں ترستا رہا تیرے ملنے کو یار
تو کہاں ہے ضمیرؔ، اب کہاں دیکھنا

پہلے دل میں جمال پیدا کر آپ اپنی مثال پیدا کر
چھوڑ تنقید غیر پر کرنا اپنے فن میں کمال پیدا کر
راہ روشن نہ دیکھ اوروں کی اپنے گھر سے اُجال پیدا کر
جس سے سرشار ہو ادب اپنا نغمۂ لازوال پیدا کر
راہِ جنت جو تیرے دل میں ہے سب کے دل میں خیال پیدا کر
تجھ پر آفت نہ کوئی آئے گی روزی اپنی حلال پیدا کر
تجھ کو کرنا ہے لاجواب ضمیرؔ ایسا دل میں سوال پیدا کر

ہندو مسلم کے لئے کوئی سزا کیوں مانگوں ظلم انسان پہ ہو ایسی دعا کیوں مانگوں
لاکھ مجبور سہی پھر بھی کروں گا نہ سوال مانگنا جن سے گنہ ہے تو بھلا کیوں مانگوں
ذکر کرتا ہوں گناہوں کی تلافی کے لئے ہوش رکھتا ہوں بھلا کوئی خطا کیوں مانگوں
میری تقدیر میں پاکیزہ ہوا ہے شامل ہر کسی پیڑ سے لپٹے وہ ہوا کیوں مانگوں
جب کہ طوفان میں چلتی ہے ہماری کشتی ٹوٹے دل کی کوئی ہلکی سی صدا کیوں مانگوں
گھر بلاتا ہے مجھے پھر کوئی مغرور ضمیرؔ مجھ کو جانا ہی نہیں ہے تو پتہ کیوں مانگوں

اقبال سیفی

محمد اقبال سیفی ابن محمد بلال، اکولہ
تاریخ پیدائش : ۲۵؍اگست ۱۹۶۷ء
بی۔اے
ملازمت انکم ٹیکس آفس، اکولہ

کتنا آگے نکل گیا ہوں میں — غم کے سانچے میں ڈھل گیا ہوں میں
جل رہا تھا مکان اُس کا مگر — میں یہ سمجھا کہ جل گیا ہوں میں
آپ اپنے پہ پڑ گئی جو نظر — خود ہی ہنس کر بہل گیا ہوں میں
وہ کہ محلوں میں بیقرار رہا — دشت و صحرا میں پل گیا ہوں میں
چلتے چلتے وفا کی راہوں میں — گرتے گرتے سنبھل گیا ہوں میں
گرمیٔ زیست جب بڑھی سیفیؔ — برف جیسا پگھل گیا ہوں میں
خاکِ پائے رسولؐ اے سیفیؔ — اپنی آنکھوں سے مل گیا ہوں میں

اُن کے رُخ پہ دیکھ کر آنچل ہُوا — اور پاگل ہوگئی پاگل ہُوا
دھجیاں میرے گریباں کی لیے — اُن کے کوچے میں ذرا تو چل ہُوا
نکہتِ گُل لیکے اپنے ساتھ ساتھ — جانبِ صحرا چلی چنچل ہُوا
آسماں پہ چھا گئی کالی گھٹا — لے اُڑی کس آنکھ کا کاجل ہُوا
برگ و گُل سیفیؔ زمیں پہ آگئے — یوں چلی صحنِ چمن میں کل ہُوا

لہو دیکر جلا بخشیں گے اے اردو زباں تجھ کو
کبھی مٹنے نہیں دینگے یہ تیرے پاسباں تجھ کو

جہاں کے گوشے گوشے میں یہ تیرے چاہنے والے
سدا محفوظ رکھیں گے سمجھ کر جسم و جاں تجھ کو

ادب کے دائرے میں رہ کے اکثر پیش کرتے ہیں
کہیں شیریں زباں تجھ کو، کہیں شعلہ بیاں تجھ کو

تری وسعت کا اندازہ لگا سکتا نہیں کوئی
بجا کہتے ہیں جو کہتے ہیں بحرِ بیکراں تجھ کو

ترے اشعار سن کر محوِ حیرت ہیں جہاں والے
اے سیفی راس جب سے آگئی اردو زباں تجھ کو

دل کی یہ آرزو ہے صنم بولتے رہو
تم کو ہمارے سر کی قسم بولتے رہو

مٹتے رہیں گے دوستو ہم، بولتے رہو
آنکھیں کبھی نہ ہوں گی یہ نم، بولتے رہو

خاموشیوں نے جنم دیئے ہیں نئے ستم
کب تک یہ ظلم اور ستم، بولتے رہو

دل زندہ ہے تو دو کوئی اس کا ثبوت بھی
خاموش کیوں ہو اہلِ قلم، بولتے رہو

حق گوئی کی مثال ہے منصور اناالحق
پرواہ نہیں سر ہو قلم، بولتے رہو

سیفی ترے اشعار پہ تنقید ہے لازم
تا کہ ہو ترا تیز قلم، بولتے رہو

کریم درویش

عبدالکریم درویش ابن شیر محمد، باسم
ایچ۔ ایس۔ ایس۔ سی
موبائل : 9921559022
تاریخِ پیدائش : ۵؍نومبر ۱۹۶۷ء

چاہتے ہو جو کوئی کھنڈر دیکھنا
دوستو ! اک نظر میرا گھر دیکھنا

لب ہلائے ہیں میں نے خلافِ ستم
اب بلا آئے گی میرے سر دیکھنا

پہلے گھر کے چراغوں پہ رکھو نظر
بعد میں تم یہ شمس و قمر دیکھنا

ایسا لگتا ہے میرے مقدر میں ہے
دامنِ زندگی خوں سے تر دیکھنا

دے رہے ہو ہوا یاد رکھنا مگر
شعلہ بن جائے گا یہ شرر دیکھنا

ہم نے سب سہہ لئے تیرے ظلم وستم
اب دعا کا ہماری اثر دیکھنا

خیر سے آپ نے خیر دیکھا ہے خیر
رہنما سے کبھی اُس کا شر دیکھنا

تیری چشمِ عنایت کا طالب ہوں میں
اک نگاہِ غلط ہی مگر دیکھنا

کاش درویشؔ ہو میری تقدیر میں
منظرِ خوش نما عمر بھر دیکھنا

لب پہ تبسم روز سجانا پڑتا ہے
غم اپنا اس طرح چھپانا پڑتا ہے

ایسا بھی ہوتا ہے اصولی جنگوں میں
ہار کو بھی سینے سے لگانا پڑتا ہے

کھا کر روکھی سوکھی ننھے بچوں کو
پیٹ کا شعلہ روز بجھانا پڑتا ہے

جوڑ رہے ہیں پیسہ پیسہ سب لیکن
سب دنیا میں چھوڑ کے جانا پڑتا ہے

ہم مزدوروں کی قسمت میں چھاؤں کہاں !
دھوپ میں خود کو روز جلانا پڑتا ہے

جھوٹی تسلی دے دے کر ارمانوں کو
سارا سارا دن بہلانا پڑتا ہے

پیٹ کی آگ بجھانے کو درویشؔ یہاں
قطرہ قطرہ خون جلانا پڑتا ہے

بتائیں کیا تمھیں خونِ تمنا روز ہوتا ہے
میاں چھلنی غریبوں کا کلیجہ روز ہوتا ہے
کبھی کلیوں کی دل سوزی، کبھی ہے قتل پھولوں کا
تمھیں بتلاؤ اس گلشن میں یہ کیا روز ہوتا ہے
یہاں مفلس اُجالے کی کرن کو بھی ترستے ہیں
مگر کہنے کو بستی میں اُجالا روز ہوتا ہے
یہ کہہ دو قائدوں سے اب یہاں زحمت نہ فرمائیں
ہمارے شہر میں بیدار فتنہ روز ہوتا ہے
یہاں نیلام ہوجاتی ہے عزت چند سکوں میں
یہ دنیا ہے یہاں ایسا تماشا روز ہوتا ہے
اگر درویش تم رسوا ہوئے ہو تو تعجب کیا
شریفوں کی حویلی میں تو ایسا روز ہوتا ہے

رنگینیٔ حیات کے منظر سے دور ہے
دل اپنا روشنیٔ مقدر سے دور ہے
یہ سچ ہے کوئی دوست نہیں زندگی کے ساتھ
یہ کیا ہے کم کہ فتنۂ محشر سے دور ہے
الفاظ کا مہکتا ہے گلدان ہر گھڑی
افکار کا اُجالا مگر سر سے دور ہے
گمراہیوں سے اُس کو بچالے خدائے پاک
یہ قوم آج درسِ پیمبر سے دور ہے
میں اپنا ہاتھ سوئے فلک تو بڑھائے ہوں
یہ اور بات ہے مہ و اختر سے دور ہے
مزدور ہوں میں کرتا ہوں محنت تمام دن
خوشحالی پھر بھی میرے مقدر سے دور ہے
درویش اپنی ذات سے تم کیوں ہو مطمئن
کیا گردشِ حیات کے تیور سے دور ہے

محمد تحسین اسرار

محمد تحسین اسرار ابن عبدالرزاق، دریاپور (امراوتی)　تاریخ پیدائش : ۱۰؍جنوری ۱۹۶۸ء
ایچ۔ایس۔سی۔ڈی۔ایڈ
صدر مدرس شہید عبدالحمید اسکول، دریاپور

جذبۂ اخلاص سے وہ آشنا کیوں ہوگیا
وہ اچانک مائلِ لطف و عطا کیوں ہوگیا

سنگ باری میں کوئی مصروف جب تھا ہی نہیں
چور میری زندگی کا آئینہ کیوں ہوگیا

ناخدائی جس سفینے کی تمھیں سونپی گئی
وہ سفینہ غرقِ طوفانِ بلا کیوں ہوگیا

تیرا مقصد تھا سنور جائے نظامِ زندگی
فتنہ سازی تیرا آخر مشغلہ کیوں ہوگیا

ڈس لیا مالی کی چشمِ بد نے کیا اسرارؔ اُسے
سوچئے تو شاخ سے پتہ جدا کیوں ہوگیا

کوئی الم کے لئے ہے کوئی خوشی کے لیے
ہیں آزمائشیں ہر لمحہ آدمی کے لیے

خدا کے واسطے دامن کشاں نہ ہو مجھ سے
میں چھوڑ سکتا ہوں دنیا تری خوشی کے لیے

اسے میں سمجھوں گا معراجِ آرزو اپنی
جو تیرا قرب میسر ہو دو گھڑی کے لیے

سکون ملتا ہے دنیا میں امتحان کے بعد
اسی لیے یہ ضروری ہے ہر کسی کے لیے

اسی نے لوٹ لیا اپنا کاروانِ حیات
چنا تھا ہم نے جسے اپنی رہبری کے لیے

یقیں پہ اپنے پرائے سمجھ میں آتے ہیں
ضروری ہے غمِ دوراں بھی زندگی کے لیے

ضرور کرتا ہے وہ ہم پہ رحمتوں کا نزول
جہاں بھی جاتے ہیں ہم اس کی بندگی کے لیے

ہم نے یوں پرچمِ معیار اُٹھا رکھا ہے
کاغذی پھولوں سے گھر اپنا سجا رکھا ہے

سب پہ چھایا ہُوا ہے رعب ستمگاروں کا
دل میں لوگوں نے کہاں خوفِ خدا رکھا ہے

اپنا حق مانگنا کیا جرم کوئی ہے آخر
تم نے اس بات پہ کیوں حشر اُٹھا رکھا ہے

وہ جو غافل ہے یہاں جذبۂ ہمدردی سے
نام کیوں اُس کا بھلا اہلِ وفا رکھا ہے

میں ترا ظلم نہیں بھولا مگر تیرے لیے
آج بھی ذہن کا دروازہ کھلا رکھا ہے

جانتا ہے وہ مری عزت و توقیر ہے کیا
جس نے نیزے پہ مرے سر کو اُٹھا رکھا ہے

تم کو معلوم ہے کیا اپنی حقیقت اسرارؔ
خود کو آئینے سے کیوں تم نے بچا رکھا ہے

کھلی فضا میں پرندوں پہ وار مت کرنا
یہ ظالمانہ روش اختیار مت کرنا

نگاہِ اہلِ محبت میں دل ہے آئینہ
اس آئینے کو کبھی داغدار مت کرنا

ہمیشہ خون کے آنسو رُلائے گا تم کو
جو خود غرض ہو بہت اس سے پیار مت کرنا

کسی بھی شخص پہ کر لینا تم یقیں لیکن
مسافروں کا کبھی اعتبار مت کرنا

حصولِ زر کی تمنا میں اتنا یاد رہے
کسی کا دامنِ جاں تار تار مت کرنا

پھسل گئے ہیں جو لمحے تمہارے ہاتھوں سے
پلٹ کے آئیں گے یہ انتظار مت کرنا

تمہارے پیار پہ جس کو بہت بھروسہ ہو
اُسے خدا کے لیے اشک بار مت کرنا

تمہارے واسطے جو باعثِ ندامت ہو
کوئی بھی ایسا عمل اختیار مت کرنا

یہ اور بات کہ اسرارؔ جلد آ نہ سکے
تم اپنے دل کو بہت بیقرار مت کرنا

ابرار احمد کاشف

ابرار احمد کاشف ابن انیس احمد، بالاپور (اکولہ) تاریخ پیدائش : ۳۰ ر دسمبر ۱۹۶۸ء
ڈپلومہ ان سول انجینئرنگ

یہ منظر دیکھ کر ساحل کی حیرانی نہیں جاتی مجھے چھو کر بھی کوئی موج طوفانی نہیں جاتی
پریشانی اگر ہے تو پریشانی کا حل بھی ہے پریشاں حال رہنے سے پریشانی نہیں جاتی
یہ کیسے لوگ ہیں جو آئینہ پہچان لیتے ہیں کہ اب ہم سے تو اپنی شکل پہچانی نہیں جاتی
بہت کنجوس ہیں آنکھیں مری آنسو بہانے میں اگرچہ دولتِ غم کی فراوانی نہیں جاتی
غمِ دنیا سے پہلو تو مرا آباد رہتا ہے "مگر دل ہے کہ اس کی خانہ ویرانی نہیں جاتی"

بولنے کا نہیں چپ رہنے کو من چاہتا ہے ایسے حالات میں تو لطف سخن چاہتا ہے
ایک تو روح بھی کافور صفت ہے اپنی اور اب جسم بھی بے داغ کفن چاہتا ہے
مَیں وفاؤں کا پرستار ہوں لیکن مجھ سے میرا محبوب زمانے کا چلن چاہتا ہے
تو ادھر کیسے ارے چاند سی صورت والے یہ وہ دھندا ہے جو آنکھوں میں جلن چاہتا ہے
وصل کے بعد بھی پوری نہیں ہوتی خواہش اور کچھ ہے جو یہ نادیدہ بدن چاہتا ہے
سُونے سُونے سے ہیں لفظوں کے شوالے کاشف ایسا لگتا ہے کہ اظہار بھون چاہتا ہے

تحفۂ عہدِ وفا دیجئے آپ
بے وفا ہوں تو سزا دیجئے آپ

ہم نے رکھا ہے ہواؤں کا بھرم
ہم چراغوں کو دعا دیجئے آپ

آج کل نیند بہت آتی ہے
میری آنکھوں کو سزا دیجئے آپ

ربط کچھ تو ہو مراسم کیلئے
مجھ پہ الزام لگا دیجئے آپ

رسمِ تنقید چل رہی ہے یہاں
رسمِ تائید اٹھا دیجئے آپ

پھر میں اٹھا ہوں نیا عزم لئے
پھر کوئی زخم نیا دیجئے آپ

شدتِ احساسِ تنہائی جگایا مت کرو
مجھ کو اتنے سارے لوگوں سے ملایا مت کرو

تم ہمارے حوصلے کی آخری امید ہو
تم ہمارے زخم پر مرہم لگایا مت کرو

آخری لمحات میں کیا سوچنے لگتے ہو تم
جیت کے نزدیک آ کر ہار جایا مت کرو

ایک آنسو بھی بہت ہے بہر ایصالِ ثواب
ہم غریبوں کیلئے دریا بہایا مت کرو

لوگ افسانہ بناتے ہیں ذرا سی بات کا
تم ہمارے نام پہ نظریں جھکایا مت کرو

ضمیر احمد ضمیرؔ

ضمیر احمد خاں ضمیرؔ ابن اسمٰعیل خاں، اکولہ
تاریخ پیدائش : یکم جولائی ۱۹۴۹ء
تعلیم : بی۔کام۔بی۔ایڈ
موبائیل نمبر : 9850685893

لیجیے اب رازِ دل افشاء ہُوا
ہر طرف باتیں ہوئیں چرچا ہُوا

مجھ پہ بھی طاری تھی جیسے بیخودی
وہ بھی تھا جیسے کہیں کھویا ہُوا

تیرے بن جینا کسے منظور تھا
زندگی سے ایک سمجھوتا ہُوا

خانۂ دل میں چراغِ آرزو
ہے کبھی جلتا کبھی بجھتا ہُوا

اُس کی رنگت پر کھِلے ہر اک لباس
روپ اُس کا ہے عجب نکھرا ہُوا

اِک جوانی کیف میں ڈوبی ہوئی
اک بدن مہکا ہُوا ، ترشا ہُوا

اب تلک تازہ ہے یادوں کی مہک
آپ سے بچھڑے ہوئے عرصہ ہُوا

دل ، جگر ، عقل و خرد ، ہوش و حواس
ایک لشکر تھا کہ جو پسپا ہُوا

دل کے کعبے میں مرے اب بھی ضمیرؔ
ایک بُت مدت سے ہے رکھا ہُوا

جہاں چاہت ہو چلنے کی وہاں رستہ نکلتا ہے
پہاڑوں کے جگر کو چیر کر دریا نکلتا ہے

کوئی طاقت کہاں جوشِ نمو کو روک سکتی ہے
زمیں کی کوکھ پھٹتی ہے نیا پودا نکلتا ہے

بہت نزدیک سے دیکھے ہیں دنیا میں کئی چہرے
گراں قیمت جو لگتا ہے بہت سستا نکلتا ہے

نہیں ڈرتا ہے مردِ حُر کبھی فوجِ ستمگر سے
صداقت کی حمایت میں تنِ تنہا نکلتا ہے

ضمیرؔ سرکش و آشفتہ سر پہ جانے کیا گذری
اصولوں سے وہ کر کے آج سمجھوتا نکلتا ہے

بظاہر انجمن آرائیاں ہیں
وہی غم ہے وہی تنہائیاں ہیں

بلندی پر سنبھل کر پاؤں رکھنا
بہت گہری یہاں پر، کھائیاں ہیں

کہاں گم ہوگیا بچپن ہمارا
وہی جھولے وہی امرائیاں ہیں

تری یادوں کی مدھم روشنی ہے
سکوتِ شام ہے تنہائیاں ہیں

ضمیرؔ اُن سے کہو کہ لوٹ جائیں
یہاں پر جا بجا رُسوائیاں ہیں

کون کرتا سرِ دربار حمایت میری
تختۂ دار پہ کھینچی گئی جرأت میری

گھر پڑوسی کے مرے آج بھی چولھا نہ جلا
مسجدوں میں رہی محدود عبادت میری

میرا قاتل مرا سر لے کے بھی شاداں نہ ہُوا
سر نہیں اس کو تو مقصود تھی بیعت میری

میرے ٹوٹے ہوئے پر دیکھ کے ہنسنے والو
میں اُڑوں گا ابھی ٹوٹی نہیں ہمت میری

ایک سے چہرے یہاں ایک سی آوازیں ہیں
ایسی بستی میں ہے پہچان سلامت میری

میں نے گہرائیاں ناپی ہیں سمندر کی میاں
تم نے بے مول خریدی ہے مہارت میری

وضعداری تو مرے خون میں شامل ہے ضمیرؔ
اب زمینیں ہیں نہ جاگیر نہ دولت میری

ساجد اختر محشر انصاری

ساجد اختر محشر انصاری ابن عبدالستار اختر انصاری، اکولہ

بی۔اے،ڈی۔ایڈ　　تاریخ پیدائش : یکم جولائی ۱۹۶۹ء

درس وتدریس　　موبائیل : 09822733237

مہانگر پالیکا پرائمری اردو اسکول، اکولہ

مجموعۂ کلام : ''ارتعاش'' (غزلیں) ''شافعِ محشر'' (نعت) (زیرِ ترتیب)

اُن کی آنکھوں کے جام کاغذ پر　　میکشی کا پیام کاغذ پر

اس نے بھیجا سلام کاغذ پر　　ہو رہا ہے کلام کاغذ پر

روپ لے گی حسیں عمارت کا　　ہے محبت جو خام کاغذ پر

تتلیاں اس پہ آ کے بیٹھ گئیں　　تیرا لکھا جو نام کاغذ پر

بس لبوں کے نشان پڑھتا ہوں　　خط کا مضموں تمام کاغذ پر

لکھ رہا ہے غزل کو شہزادی　　ایک ادنیٰ غلام کاغذ پر

اس کی زلفوں پہ کچھ کہا جوں ہی　　ہو گئی جیسے شام کاغذ پر

ملی ہے راہِ محبت میں اعتبار کی چھاؤں　　سلگتے صحرا میں ہے ساتھ تیرے پیار کی چھاؤں

وہ تیری زلفِ گرہ گیر کا گھنا سایہ　　خزاں میں آنے لگی یاد وہ بہار کی چھاؤں

تری وفا نے وفا کی نہیں اسی غم میں　　ترے خطوط کو دینی پڑی غبار کی چھاؤں

جو تیری ذات کی حمد و ثناء سے ہے منسوب　　مجھے نصیب ہو مولیٰ اسی دیار کی چھاؤں

ستم گروں پہ چلی اور بن گئی مخلص　　ستم رسیدہ پہ شمشیر آبدار کی چھاؤں

یہ ایسا پیڑ ہے جو آگ ہی اُگلتا ہے　　ہمیں نصیب کہاں حزبِ اقتدار کی چھاؤں

ہوں سوکھا پیڑ تری رہ گذر کا اے محشرؔ　　سودے رہا ہوں تجھے میرے اختیار کی چھاؤں

فرصت اگر ہو پڑھیے ذرا داستانِ وقت
مغرور ہو کے خاک ہوئے حکمرانِ وقت

سجدوں میں سر کٹا کے رہے ہم ہی سر بلند
ہم کامیاب ہو کے بنے کامرانِ وقت

ممکن نہیں تھا دینِ محمدؐ نے کر دیا
"ہر ذرہ ریگزار کا اک کہکشانِ وقت"

جو خواہشاتِ نفس کے مدت سے ہوں غلام
کیا انقلاب لائیں گے وہ نوجوانِ وقت

حسن و جمال چھین لیا گذرے وقت نے
چہرے چھپائے پھرتے ہیں اب گلرخانِ وقت

پینے کی بات دور بہکتے ہیں بن پیے
ساقی سے آنکھ ملتے ہی یہ میکشانِ وقت

محشرؔ کی فکر کیجئے محشرؔ جناب آج
کل یہ نہ ہو کہ ٹوٹ پڑے آسمانِ وقت

ساتھ ان کے مرے ارمان کا جانا ٹھہرا
ان کا آنا تھا مری جان کا جانا ٹھہرا

ساتھ اس کے جو کسی اور کو کرلوں میں شریک
ایک لغزش سے ہی ایمان کا جانا ٹھہرا

خوف اللہ کا جس قلب کی زینت ہو میاں
ایسے دل میں کہاں شیطان کا جانا ٹھہرا

جب ولی نے کیا انکار محل جانے سے
ان کے در پر بھی تو سلطان کا جانا ٹھہرا

جس کی ایماء پہ نکالا گیا جنت سے مجھے
اس کی مرضی سے ہی انسان کا جانا ٹھہرا

سر پہ گٹھری ہے گناہوں کی بھلا کر محشرؔ
کیسے کہدوں کہ بڑی شان کا جانا ٹھہرا

فاروق زمنؔ

محمد فاروق زمنؔ ابن محمد عقیل، باسم　　موبائیل : 08623836238
ایم۔ایس۔سی۔ایم۔اے(اردو، انگریزی) بی،ایڈ　　تاریخ پیدائش : ۶ر نومبر ۱۹۶۹ء
پرم ویر چکر عبدالحمید ہائی اسکول و جونیئر کالج، باسم

درد بھی ہو زیادہ تو کم کم لگے　　تو نمک بھی لگائے تو مرہم لگے
کتنی پیاری محبت کی سرگم لگے　　ننھی بٹیا کے پائل کی چھم چھم لگے
جب بھی پیتا ہوں، مجھ کو خدا کی قسم　　ماں کے ہاتھوں کا پانی بھی زم زم لگے
جب تلک تم مرے ساتھ چلتے رہے　　مجھ کو راہوں کے کانٹے بھی ریشم لگے
تم اگر ساتھ ہوں تو خزاں بھی مجھے　　خوبصورت بہاروں کا موسم لگے
اے زمنؔ کہکشاں، پھول، تارے، قمر　　اُن کے آگے مجھے سارے مدھم لگے

متاعِ ظرف ہوتی تو قدآور ہو گئے ہوتے　　تو پھر تم بھی مرے قد کے برابر ہو گئے ہوتے
ضرورت ہی نہیں تھی آپ کو مرہم لگانے کی　　تسلی ہی اگر دیتے تو گھاؤ بھر گئے ہوتے
تمھیں اُلجھا کے رکھتا ہے تمناؤں کے دلدل نے　　اگر چہ نفس سے لڑتے، قلندر ہو گئے ہوتے
اگر یہ زندگی روشن ضمیروں میں بسر ہوتی　　ستاروں کی طرح ہم بھی منور ہو گئے ہوتے
تمھیں بھی شعر کہنے کا سلیقہ آگیا ہوتا　　"ہمارے ساتھ رہتے تو سخنور ہو گئے ہوتے"
اگر تم حق پہ لڑتے تو خدا امداد کر دیتا　　تمھارے ساتھ ابابیلوں کے لشکر ہو گئے ہوتے
زمانہ رشک سے پھر دیکھنے لگتا زمنؔ مجھ کو　　اگر وہ میری چاہت کا مقدر ہو گئے ہوتے

پھر ایکتا کے سینے پہ اک گھاؤ ہُوا ہے
کل شب ہمارے شہر میں پتھراؤ ہُوا ہے

ہر سمت فسادات کی اک فصل اُگا کر
زہریلے بیانات کا چھڑکاؤ ہُوا ہے

اخلاص و محبت کے دیئے درس ہمیں نے
ہم سے ہی یہاں امن کا پھیلاؤ ہُوا ہے

دیکھا گیا ہمیں کو تعصب کی نظر سے
جب بھی ہُوا زمنؔ یہی برتاؤ ہُوا ہے

چھپا کر عشق کی خوشبو کو تو رکھا نہیں جاتا
نظر اُس کو بھی پڑھ لیتی ہے جو لکھا نہیں جاتا

بہت ہلچل سی ہوتی ہے ہمارے خون میں یارو
کسی پر ظلم ہو تو ہم سے وہ دیکھا نہیں جاتا

کسی کی بد دعا اُس کی ترقّی روک دیتی ہے
تکبّر کا شجر پھلتا ہے پر اونچا نہیں جاتا

بہانے نت نئے ہر دن بنا کرتے ہو تم صاحب
ہمیں یہ صاف ہی کہہ دو کہ اب آیا نہیں جاتا

یہ شفقت اُن کے حق میں نہ کوئی دیوار بن جائے
بگڑ جاتے ہیں یہ بچّے اگر ٹوکا نہیں جاتا

جسے چاہا تھا پوجا تھا زمنؔ گہرائی سے دل کی
ہمارے ذہن کے گوشے سے وہ چہرہ نہیں جاتا

डॉ.गणेश गायकवाड(आग़ाज़) ڈاکٹر گنیش گائیکواڑ آغازؔ

ڈاکٹر گنیش گائیکواڑ ابن جے رام گائیکواڑ، بلڈانہ — تاریخِ پیدائش : ۱۵؍جنوری ۱۹۷۰ء
ایم۔بی۔بی۔ایس، ایم۔ایس — موبائیل : 09850377609
''چاند کا سفر'' ''دھنک رنگ جذبے'' ''کبھی سوچا نہ تھا'' ''نئے سفر کا آغاز'' (شعری مجموعے)
''منظر بدل نہ جائے'' (دیوناگری)

تازہ بہ تازہ صبح کے اخبار کی طرح
بیچا گیا میں آج بھی ہر بار کی طرح

قاتل ہے میری جان کا دشمن ہے وہ مگر
ملتا ہے مجھ سے جو کسی غمخوار کی طرح

اک شے کہ جس کا نام ہے احساس ذہن میں
پیہم کھٹکتا رہتا ہے اک خار کی طرح

میں اپنی بے گناہی پہ خود اپنے آپ میں
رہتا ہوں شرمسار گنہگار کی طرح

کرتے ہیں بات بات میں جذبوں کا مول تول
کرتے ہیں لوگ پیار بھی بیوپار کی طرح

چاہت بھی ان کی ہوتی ہے نفرت لئے ہوئے
اقرار بھی وہ کرتے ہیں انکار کی طرح

آغازؔ ہر زبان پہ ہر ایک بزم میں
ہے اس کا تذکرہ مرے اشعار کی طرح

کوئی رہزن نہ اب راہبر چاہیئے
اس سفر میں ہمیں ہمسفر چاہیئے

دشمنوں کو تو تم جانتے ہو مگر
دوستوں کی بھی تھوڑی خبر چاہیئے

خوبصورت ہے دنیا بہت دوستو!
دیکھنے کے لئے بس نظر چاہیئے

لوگ سن لینگے اور مان بھی جائیں گے
بات میں اپنی لیکن اثر چاہیئے

ہم پڑوسی سے اپنے رہے بے خبر
ساری دنیا کی ہم کو خبر چاہیئے

روشنی آنکھ بھر، چھاؤں بس ہاتھ بھر
اور ہوا بس ہمیں سانس بھر چاہیئے

ہے ٹھکانا ہر اک دل میں آغازؔ کا
ان کے رہنے کو بس ایک گھر چاہیئے

اگر وہ جھوٹ بھی بولے تو ہم سچ مان لیتے ہیں
نقابوں میں چھپے چہروں کو ہم پہچان لیتے ہیں
ضرورت تیر یا تلوار کی ان کو نہیں ہوتی
نظر کی مار سے وہ عاشقوں کی جان لیتے ہیں
وہاں تو جس کو بھی جانا ہے خالی ہاتھ جانا ہے
نہ جانے لوگ پھر کیوں اس قدر سامان لیتے ہیں
عنایت کی، کرم کی اک نظر کرتے ہیں بدلے میں
کبھی وہ جان لیتے ہیں، کبھی ایمان لیتے ہیں
ارادے پر اٹل رہتے ہیں اے آغازؔ ہم اپنے
وہی سب کر گذرتے ہیں جو من میں ٹھان لیتے ہیں

اونچا اُڑنے کا بھی ارمان ابھی باقی ہے ۔۔۔ پر تو کاٹے گئے پر جان ابھی باقی ہے
حادثوں سے ابھی ٹوٹا نہیں رشتہ میرا ۔۔۔ دل میں اُٹھتا ہے جو طوفان ابھی باقی ہے
تم جو کہتے ہو کہ دنیا کو خریدو گے مگر ۔۔۔ بک نہیں سکتا جو انسان ابھی باقی ہے
مٹ سکے کیسے برائی کہ اسی دنیا میں ۔۔۔ شر ابھی زندہ ہے شیطان ابھی باقی ہے
یوں تو پہچان چکا سارے جہاں کو آغازؔ ۔۔۔ خود سے لیکن مری پہچان ابھی باقی ہے

حسنین عاقبؔ

قدم حسنین خاں عاقبؔ ابن قاضی محمد شہباز خاں، اکولہ　تاریخ پیدائش: ۸ر جولائی ۱۹۷۱ء
ایم۔اے (اردو، انگریزی، ہسٹری) ایم۔ایڈ　موبائیل : 9922571426
لکچرر غلام نبی آزاد ڈی۔ایڈ کالج پوسد
"Flight of Wingless Bird" (انگریزی مجموعہ کلام)
Fragrance (نظمیں بچوں کے لئے انگریزی) ''رم آہو'' (شعری مجموعہ)

پاس مذہب کا ہو یا بھرم ذات کا　آدمی ہے غلام اپنی عادات کا
دم نکل جائے گا اب جوابات کا　سلسلہ چل پڑا ہے سوالات کا
گھر کی دیواریں تو ہو چکیں نم مگر　جانے اب کیا ارادہ ہے برسات کا
لاکھ باتیں سناتی ہے دنیا ہمیں　کیا برا ماننا تیری اک بات کا
جس گھڑی مجھ سے روٹھا ہے میرا شعور　سلسلہ منقطع ہے خیالات کا
جب مداری نے چاہا ہنسے، رو دیئے　ہم بھی سمجھے نہیں کھیل جذبات کا
آئے بیٹھے چلے بات کچھ کی نہیں　فائدہ کیا ہے ایسی ملاقات کا
کیسے بدلے گی تقدیر عاقبؔ میاں　شکوہ کرتے رہوگے جو حالات کا

دانائیاں اٹک گئیں لفظوں کے جال میں　اتنے جواب گُم ہیں مرے اک سوال میں
دریا! بس اک قدم کبھی ساحل کی سمت آ　دیکھوں گا زور کتنا ہے تیرے اُبال میں
کی احتیاط لاکھ مگر حال یہ ہُوا　آنا تھا جن کو آ ہی گئے تیری چال میں
جی چاہتا ہے ترکِ محبت کو بار بار　آتا ہے ایک ایسا بھی لمحہ وصال میں
اب کیا اصولِ دشت نوردی کی بات ہو　اُلجھے پڑے ہیں پاؤں شکاری کے جال میں
کیا جام کیا شراب نشہ کیا خمار کیا!　کس کس کو دوں جگہ میں ذرا سے خیال میں
اس سے قریب بھی تھے مگر فاصلہ بھی تھا　گذری جو زندگی تو فقط دیکھ بھال میں
عاقبؔ ہم اپنا قصہ کسی سے کہیں تو کیا؟　ہے بات اپنی لَے میں نہ سُر میں نہ تال میں

گناہوں کی محبت گھٹ رہی ہے
ابھی گردِ کدورت چھٹ رہی ہے

ہماری پیاس کو دریا بھی کم ہیں
مگر پیالوں میں بس تلچھٹ رہی ہے

سمیٹے پھر رہے ہیں نفرتیں ہم
گماں یہ تھا کہ اُلفت بٹ رہی ہے

ضرورت خوب مہنگی ہوگئی ہے
مگر انساں کی قیمت گھٹ رہی ہے

جسے سُن کر دھڑکتا تھا مرا دل
ترے قدموں کی وہ آہٹ رہی ہے

جہاں جا کر ہم اکثر لوٹ آئے
ڈگر تیری ، ترا پنگھٹ رہی ہے

اسی میں گُم ہیں میری آرزوئیں
ترے ماتھے کی جو سلوٹ رہی ہے

سکونِ دل تھا جس کا نام وہ شئے
نہ اِس کروٹ نہ اُس کروٹ رہی ہے

کوئی پوچھے جو تم سے حال عاقبؔ
کہو الحمدللہ ! کٹ رہی ہے

بیٹا جو ہونہار تھا زن کے اثر میں ہے
کس کی نظر کا نور تھا کس کی نظر میں ہے

نظریں تو تھک کے آگئیں اپنے مدار پر
اور اک خیالِ یار کہ اب تک سفر میں ہے

پرواز کا خیال اسے کر دے گا منتشر
برسوں ہوئے جو گرد جمی بال و پر میں ہے

چلتا نہیں ہے مجھ کو پتہ کب میں پک گیا!
خوبی کمال کی یہ مرے راہبر میں ہے

صدہا فریب جس کی عبادت میں ضم ہوئے
اس شخص کا شمار تو اہلِ ہنر میں ہے

عاقبؔ بھی شعر کہتا ہے طرزِ جدید میں
لیکن کہاں وہ بات جو حضرت ظفر[1] میں ہے

[1] ظفر گورکھپوری

صابر شاہ صابرؔ

صابر شاہ صابرؔ ابن شبیر شاہ، ساکھر کھیرڈا (بلڈانہ) موبائیل : 9421396640
ایم۔اے۔ڈی۔ایڈ تاریخِ پیدائش : ۱۴؍دسمبر ۱۹۷۱ء
درس وتدریس
''ریگ زار میں پھول'' (مجموعہ کلام) علم وعروض اور قواعد، ''چناب'' (ماہیے، زیرِ ترتیب)

زمانے نے ارماں نکالے بہت ہیں مری سمت پتھر اچھالے بہت ہیں
انا کا یہ بیوپار مجھ سے نہ ہوگا مجھے اپنے سوکھے نوالے بہت ہیں
ابھی اپنی تقدیر خود لکھ رہا ہوں نہیں غم جو ہاتھوں میں چھالے بہت ہیں
شکایت تو غیروں سے کرنا عبث ہے ہمارے ہی ذہنوں میں جالے بہت ہیں
دِکھاتے ہیں دیکھو مگرمچھ کے آنسو دلوں کے مگر لوگ کالے بہت ہیں
مجھے ہجر کے ان اندھیروں کا غم کیا تری یاد کے یہ اُجالے بہت ہیں
سنبھل کر ہی رہیئے ذرا اُن سے صابرؔ جہاں میں اُلٹ پھیر والے بہت ہیں

ایک چہرے پہ ہیں کئی چہرے پڑھ نہیں پاؤ گے کبھی چہرے
خود کی پہچان ہوگئی مشکل یوں بدلتی ہے زندگی چہرے
تیز تھی غم کی دھوپ ہم پر یوں کھو چکے کب سے تازگی چہرے
زہرِ غم پی کے مسکراتے ہیں اُن کے دیکھے بھی ہیں کبھی چہرے؟
ہر گھڑی کیوں سپاٹ لگتے ہیں تن پہ ہو جیسے کاغذی چہرے
اب کہاں تاب مسکرانے کی خوف سے زرد ہیں ابھی چہرے
ہم نے دیکھا ہے بارہا صابرؔ اپنے لگتے ہیں اجنبی چہرے

بُرا وقت آ کر گزرتا نہیں ہے
مسرت بھرا پل ٹھہرتا نہیں ہے

کرو خود اُجالوں کے اسباب پیدا
چراغوں میں سورج اُترتا نہیں ہے

سنبھالیں سبھی مرتبہ اپنا اپنا
سمندر ندی میں اُترتا نہیں ہے

بزرگوں کی عزت ہے جس گھر کا شیوہ
یہ سچ ہے کہ وہ گھر بکھرتا نہیں ہے

انا پر اگر بات آجائے صابرؔ
ہواؤں سے تنکا بھی ڈرتا نہیں ہے

زخم پر پھونک بھی دوا جیسی
ماں کی ہر بات ہے دعا جیسی

مدتوں سے سفر میں ہوں پھر بھی
انتہا کیوں ہے ابتداء جیسی

چھوٹی دُنیا کی یہ بڑی خبریں
تیز رفتار ہیں ہوا جیسی

میری ہمراہ بن کے چلتی ہیں
مشکلیں تو ہیں دلربا جیسی

جب بھی بھٹکا ، ترا خیال آیا
تیری یادیں ہیں نقشِ پا جیسی

اُن کی یہ مہربانیاں ہم پر
دھوپ کے شہر میں گھٹا جیسی

اجنبی شہر نے دیے صابرؔ
دن کڑا رات کربلا جیسی

سیّد طاہر حسین طاہرؔ

سیّد طاہر حسین طاہرؔ ابن سیّد ضامن حسین، کھام گاؤں بلڈانہ موبائیل : 9028848078
تاریخ پیدائش : ۱؍جولائی ۱۹۷۲ء تعلیم : ایم۔اے۔بی۔ایڈ
"محبت کی امانت" (شعری مجموعہ، زیرِ ترتیب)

تمنّا جو اتنی مچلنے لگی ہے
مرے رنگ میں کیا وہ ڈھلنے لگی ہے

مری رُخصتی اور انگڑائی اُس کی
ارادہ ہرا وہ، بدلنے لگی ہے

ہماری عیادت کو آنا ترا کیا
طبیعت اچانک سنبھلنے لگی ہے

ترے لب پہ رُخسار پہ لکھ رہا ہوں
قلم خود بخود سُرخ چلنے لگی ہے

لپٹ کر ترے چھوڑتے ہی بدن سے
مری روح طاہرؔ نکلنے لگی ہے

دوسروں میں نکالے ہے وہ خامیاں
دیکھ لو کس قدر اُس میں ہیں خوبیاں

ہم نے جس کے بھی غم خوشی سے لیے
دیکھتے ہی رہے وہ تو سوُد و زیاں

خوب سے خوب تر آپ ہونے لگے
ماند پڑنے لگیں ساری رعنائیاں

عارضی پیار اپنوں سے بھی کیوں اگر
غیر سے آپ کو عشق ہے جاوداں

راہبر سے گلہ بے سبب، بے ثمر
جب مقدر میں تھیں اپنے گمراہیاں

چین سے جی رہا ہوگا وہ بھی کہاں
جس نے طاہرؔ کو دیں اتنی بے چینیاں

محبت ایک سے کر کے بتاؤں گا زمانے کو
ہزاروں، لاکھ آئیں گے یہ سن کر دل لگانے کو

اُدھر بے چین تھا وہ بھی یہی ارماں بتانے کو
مرا دل بھی ترستا تھا اُسے اپنا بنانے کو

تمھارے روٹھنے کی بھی ادا پیاری یہاں تک کہ
بڑی مشکل سے میں تیار ہوتا تھا منانے کو

کرے گی کام کیا یہ وقت کی طاقت بھی دیکھیں گے
کہ صدیاں بھی پڑیں گی کم تری یادیں مٹانے کو

خزانے کی محبت دل میں کیا باقی رہے گی اب
لگا رکھا ہے جب دل سے محبت کے خزانے کو

جہاں تک یاد ہے تم تو خوشی دینے ہی آتے تھے
تمھاری یاد پھر طاہرؔ کیوں آتی ہے ستانے کو

خسارے کا سودا کبھی نے کیا ہے
بتاؤ محبت نے کیا دے دیا ہے

سبق لغزشوں سے یہ ہم نے لیا ہے
سنبھلنا ہی سب سے بڑا تجربہ ہے

کسی بے وفا سے نہ شکوہ گلہ ہے
وفا سے ہی اپنی ہمیں کیا ملا ہے

سندیسہ ملا یاد کرنے کا جب سے
تجھے بھولنا پھر سے مشکل ہوا ہے

ثبوت اور کیا دوں میں اپنی وفا کا
دعاؤں میں اب بھی وہی بیوفا ہے

ترے روٹھ جانے سے ممتاز اب تو
سدا کے لیے خود سے طاہرؔ خفا ہے

شمیم فرحتؔ

شمیم فرحتؔ ابن خلیل فرحتؔ، کارنجہ (واشم)
ایم۔اے۔بی۔ایڈ
تدریس، گریجویٹ ٹیچر ضلع پریشد واشم
"لہو ترنگ" (شعری مجموعہ)

موبائیل : 9881336978
تاریخ پیدائش : ۶/جولائی ۱۹۷۲ء

یہ سلگتی شام یہ جلتی سحر دیکھے گا کون
اور وہ بھی روشنی کے نام پر دیکھے گا کون

کچھ نہ کہہ کر بھی بہت کچھ کہہ دیا ہم نے مگر
بولنے کے شوق میں چپ کا ہنر دیکھے گا کون

روشنی کے واسطے خود پھونک ڈالا اپنا گھر
دیدنی ہے یہ تماشا بھی مگر دیکھے گا کون

چھوڑ کر رہبر مجھے اب اپنی اپنی راہ لیں
منزلوں کے نام پر گردِ سفر دیکھے گا کون

سوچتے ہیں لوٹ جائیں پھر سے جنگل کی طرف
بستیوں میں رات دن رقصِ شرر دیکھے گا کون

ڈوب جانا پار ہونے سے بھی ہے بہتر مگر
کون فرحتؔ کی سُنے گا ڈوب کر دیکھے گا کون

کیا خبر تھی عشق میں یہ بھی ستم ہو جائے گا
آنکھ میں آنسو نہ ہوں گے درد کم ہو جائے گا

اپنے عیبوں، دوسروں کی خوبیوں پر رکھ نظر
تو بھی دنیا کی نظر میں محترم ہو جائے گا

میرے آنسو جیسے اُن کی آنکھ سے بہنے لگے
کیا کبھی یہ معجزہ اے چشمِ نم ہو جائے گا

کس کو تھا معلوم ہنستا کھیلتا بچپن مرا
مفلسی کی زد میں آ کے وقفِ غم ہو جائے گا

پستہ قد لوگوں میں فرحتؔ سربلندی جرم ہے
دیکھنا تیرا بھی اک دن سر قلم ہو جائے گا

فکر مجھے گلزاروں کی ہے مولا خیر
بارش تو انگاروں کی ہے مولا خیر

دشمن تو دُکھ دینے میں ناکام ہوئے
باری اب غم خواروں کی ہے مولا خیر

اُلجھ رہے ہیں سارے مسیحا آپس میں
فکر کسے بیماروں کی ہے مولا خیر

دیوانہ گلدستے لے کر پھرتا ہے
مشق جہاں تلواروں کی ہے مولا خیر

لوگوں کے کندھوں پر سر کیوں قائم ہیں؟
فکر یہی سالاروں کی ہے مولا خیر

تیل سے فرحتؔ آگ بجھانے نکلے ہیں
عقل عجب سالاروں کی ہے مولا خیر

ہم جو ان ہاتھوں کو مصروفِ عمل رکھتے ہیں
مسئلے جو بھی ہوں خود سامنے حل رکھتے ہیں

اپنے حصّے میں فقط باغ کی محنت آئی
پھول رکھتے ہیں نہ ہم پاس میں پھل رکھتے ہیں

دن کو مفلس ہیں تو کیا، رات ہے شاہوں جیسی
ہم بھی خوابوں میں کئی تاج محل رکھتے ہیں

ہم اُنہیں دیکھ کے جیتے ہیں ستم تو دیکھو
جو ہمیں دیکھ کے پیشانی پہ بل رکھتے ہیں

ہم وہاں درسِ وفا دیں بھی تو کیا، لوگ جہاں
بغض سینوں میں دماغوں میں خلل رکھتے ہیں

آپ کے شعروں میں فرحتؔ غمِ دوراں کیسا
اہلِ فن آپ سے اُمیدِ غزل رکھتے ہیں

اعجاز پروانہ

محمد اعجاز پروانہ ابن شیخ رمضان ضیار، ناندورہ (ضلع بلڈانہ) موبائیل : 7798508840
تاریخ پیدائش : ۲۷؍ جولائی ۱۹۷۲ء تعلیم : ایم۔اے۔ (اردو، تاریخ) بی۔ایڈ
درس وتدریس عنایتیہ جونیئر کالج، ناندورہ
"انا کی دیوار" "روشن ضمیر" (ناول غیر مطبوعہ)، پروانہ انقلاب (نظمیں زیرِ ترتیب)

مصیبت کے بھنور میں بھی شناور وہ سنبھلتا ہے
یقیں ہو جس کو خود پر وہ تلاطم سے نکلتا ہے

ہتھیلی کی لکیروں سے، نجومی کی ہی باتوں سے
بہکتا اور کاہل تو خوشی سے بس اُچھلتا ہے

وفا کی راہ میں ہمدم غریبی ہوگئی حائل
تجھے پانے کی خواہش میں مرا تو دل مچلتا ہے

ہواؤں سے نہ گھبراؤ، چراغوں کو جلانے دو
شجاعت دیکھ کر اپنی عدو کا دل دہلتا ہے

گئے وہ دن بنی آدم کہا کرتے تھے سچ ہر دم
زباں کو حضرتِ انساں لباسوں سا بدلتا ہے

سرابوں میں نہ پانی ہے، حقیقت یہ پرانی ہے
مگر رہبر ہمارا کیوں نہیں رستہ بدلتا ہے

انا کی تم پرستش کو اصولوں میں گناتے ہو
یہ پروانہ مگر بس انکساری سے پگھلتا ہے

سب منافق ہی نظر آتے ہیں باطل کے سوا
ہیں سبھی شاد مرے قتل پہ قاتل کے سوا

اشک آنکھوں سے گناہوں کی ندامت میں بہے
تب بھنور سے نہ کہیں پہنچا میں ساحل کے سوا

خواب دیکھو ہے ترقی کی ضمانت بیشک
سب کو تعبیر مگر ملتی ہے کاہل کے سوا

مسلکی جھگڑے، فروعی یہ مسائل کو لئے
آگ عالم ہی لگاتے ہیں یہ جاہل کے سوا

ہوش میں مے وہ تصوف کی ہی پیتے سے رہے
ہوش والے بھی غفلت میں تھے غافل کے سوا

ہم پہ الزام جو غدار وطن کا دھرتے
اور ہو سکتے نہیں وہ کوئی بزدل کے سوا

چاپلوسی سے ریاکاری سے بے غیرتی سے
تم بنوگے سبھی کچھ، رہبر کامل کے سوا

بھوک، شہرت کی تجھے دیکھ نہ گمنام کرے
کام کر، نام بھی ہوگا ترا حاصل کے سوا

شکوہ ہر دم ہی تعصب کا نہ پروانہ کرو
تم ہو قابل تو ملے کچھ بھی نہ منزل کے سوا

تری رحمتوں کا طالب ' مجھے آس تیرے در سے
یہ قدم بہک نہ جائے ' مری مفلسی کے ڈر سے
ہے تونگروں کا میلہ ' تو غریب ہے اکیلا
ترا دل نہ ٹوٹ جائے ' تو ابھی نہ جا اُدھر سے
کئی جام خالی کر کے وہ ابھی بھی ہوش میں ہیں
میں نشہ میں ہوں قسم سے ' میں نے پی جو لی نظر سے
اُسے خوف نے کنارے پہ پہنچنے نہ دیا تھا
مجھے مل گیا تھا ساحل ' مرے حوصلوں کے ڈر سے
نہیں برگ و گل ہیں جن پر وہی تن کے سب کھڑے ہیں
وہ شجر تو فیض والا ہے جھکا ہُوا ثمر سے
مرے غمگسار تجھ کو تری رہبری مبارک
"میں خود اپنا رہنما ہوں مجھے کام ہے سفر سے"
ترے دل کے داغ پَل بھر پروانہ ہوں جو روشن
کئے ظلم ظالموں نے جو وہ دیکھ لے نظر سے

ملا قطرہ تو کرتے کیوں شکایت تم مقدر کی
گلہ قسمت کا ہے پھر کیوں نہ کوشش کی سمندر کی
بڑے اخلاق والی ان کی اولادِ نرینہ ہے
شریعت کے تمسخر میں زباں چلتی ہے دختر کی
اگر ہے خاکساری تو بلندی پر قدم ہوں گے
جگہ فرعون حاصل کر نہیں سکتا سکندر کی
خدا پر ہو یقیں کامل ' اگر انساں نہ ہو کامل
تلاطم خیز موجیں بھی مدد کرتیں سمندر کی
قناعت ' صبر ' پروانہ یہ ہیں الفاظ اچھے پر
نصیحت پر عمل خود کر ' نہ کھا ٹھوکر تو در در کی

محمد واثق ندیم

محمد واثق ندیم ابن عبدالرزاق۔ اکوٹ ضلع اکولہ
تاریخ پیدائش : ۱۵؍جون ۱۹۷۳ء
تعلیم : بی۔اے۔ڈی۔ایڈ
موبائیل : 9850098716
درس وتدریس
"مدوجزر" (شعری مجموعہ زیر ترتیب)

اپنی ہر بات کو آخر وہاں رد ہونا ہے
وہ جو بولیں انھیں باتوں کو سند ہونا ہے

اک محل اور بنالو کہ ہواؤں میں اڑو
آخری گھر تو وہ دو گز کی لحد ہونا ہے

اور کچھ روز یونہی صبر کئے جا اے دل
اُن کے اندازِ تغافل کی بھی حد ہونا ہے

سرفرازی کی سعادت ہے مرے حصے میں
اس ترقی پہ حریفوں کو حسد ہونا ہے

اس نئے دور کی لیلیٰ بھی جنوں پیشہ نہیں
لازماً قیس کے جذبوں میں خرد ہونا ہے

سخت حالات جو آئیں تو بھروسہ رکھنا
اُس کے دربار سے آخر کو مدد ہونا ہے

شعر کہنے کا سلیقہ تو ہے لیکن واثقؔ
ہم سے شاعر کو نہ غالبؔ نہ اسدؔ ہونا ہے

گفتگو کرتے رہو رات گذر جائے گی
نور کی کوئی کرن دل میں اُتر جائے گی

نوجواں قوم کا سرمایہ ہُوا کرتے ہیں
تم جو بکھرے تو میاں قوم بکھر جائے گی

آج ہے بس میں تو کچھ نیک عمل ہی کرلو
بیٹھے بیٹھے تو یونہی عمر گذر جائے گی

ظرف والا کسی کم ظرف کا احساں لے کر
زندگی لاکھ جیئے روح تو مر جائے گی

موجِ خوں سر سے گذرتی ہے گذر جانے دے
کم سے کم قوم کو بیدار تو کر جائے گی

اپنی منہ زور تمناؤں پہ قابو کر لو
ورنہ سر سے میاں دستار اُتر جائے گی

اپنی شہرت پہ نہ اترانا کبھی تو واثقؔ
یہ ندی وہ ہے جو اک روز اُتر جائے گی

جب طوائف شاہ کی رانی ہوئی
گھنگروؤں کی نذر سُلطانی ہوئی

تیرے دَم سے گھر تھا جنت کی مثال
تو گیا جنگل سی ویرانی ہوئی

آج تک دنیا نہ دے پائی مثال
قرنِ اوّل میں وہ سُلطانی ہوئی

دیکھئے انسان کی فرعونیت
بادشاہی ظلِ سبحانی ہوئی

برف جیسی تھی ہماری زندگی
لمحہ لمحہ گھُل گئی ، پانی ہوئی

بیٹھے بیٹھے آ گیا اُن کا خیال
فکر کی سادہ قبا ، دھانی ہوئی

چونک اٹھا ، نیند میری اُڑ گئی
جب سُنی آواز پہچانی ہوئی

چھوڑ دی واثق کتابِ آگہی
تب تو جینے میں پریشانی ہوئی

مقتل کا میرے گھر سے بہت فاصلہ نہیں
ہوں مطمئن کہ سچ سے کوئی واسطہ نہیں

اک وقت وہ کہ دیکھے بِنا چین ہی نہ تھا
اک وقت یہ کہ اُس سے کوئی رابطہ نہیں

ہے "ستیہ میو جیتے" کی تختی لگی ہوئی
سچائی یہ کہ سچ کا وہاں داخلہ نہیں

ماضی کی بات چھوڑ دے رکھ حال پر نظر
اب وہ خلیل خاں بھی نہیں ، فاختہ نہیں

اُس نے کہا قبول ہے سودا ضمیر کا
نکلا مری زبان سے بے ساختہ "نہیں"

جتنی سیاسی لوگ کریں بے وفائیاں
اُس درجہ بے وفا تو کوئی داشتہ نہیں

واثق میاں ! مزاج کی شوخی کہاں گئی
کہہ تو رہے تھے غم سے کوئی واسطہ نہیں

عمران تتائی

محمد خورشید العمران تتائی ابن شیخ سبحان، چکھلی (بلڈانہ)　موبائل : 9673352353
تاریخ پیدائش : ۲؍جنوری ۱۹۷۴ء
بی۔اے۔ڈی۔ایڈ　مدرّس ضلع پریشد بلڈانہ

ڈرا نہ پائے گا لشکر ترا ذرا مجھ کو
مرے خدا نے وہ بخشا ہے حوصلہ مجھ کو

بنا ہے جب سے مرا ہمسفر کوئی جگنو
دِکھا رہا ہے اندھیرے میں راستہ مجھ کو

سراغ ملتا نہیں ہے کہیں سے منزل کا
یہ کس مقام پہ لا کر کھڑا کیا مجھ کو

وہ جس کو سمجھا تھا میں نے یہاں حبیب اپنا
وہ شخص دینے لگا اِن دنوں دغا مجھ کو

جو انگلی تھام کے چلتا رہا سدا میری
دِکھا رہا ہے وہی شخص آئینہ مجھ کو

وہ کون اردو کا شیدا ہے شہر میں تتائی
سبق سکھا گیا کل کا مشاعرہ مجھ کو

نیک اعمال کی ترغیب عمل دیتا ہے
علم انسان کی تقدیر بدل دیتا ہے

سب کو محنت کا صلہ اور وہ پھل دیتا ہے
یعنی خوابوں کو حقیقت میں بدل دیتا ہے

پاس ہے عقل تمھارے تو یہ پہلے سوچو
تم شجر ایسا لگانا کہ جو پھل دیتا ہے

فن کے تحریک ملے جس سے زمانے بھر کو
تجربہ مجھ کو مرا ایسی غزل دیتا ہے

اپنا سر اس کی عبادت میں جھکانا کافی
راحتیں دونوں جہاں میں یہ عمل دیتا ہے

حوصلہ جس کا جواں ہوتا ہے ٹیپو کی طرح
ظلم کے سانپ کا سر بڑھ کے کچل دیتا ہے

لکھا قسمت کا بھی وہ ماں کی دعا سے تتائی
سچ ہے یہ بات کہ اللہ بدل دیتا ہے

میزانِ فن پہ رکھ کر سانچے میں ڈھالتے ہیں
چشمِ غزل سے شاعر کا جل نکالتے ہیں

دامن پہ داغ اُن کے ہم نے انھیں کے دیکھے
کیچڑ جو دوسروں پر اکثر اُچھالتے ہیں

اپنوں نے تو گرایا ہر بار ہر ڈگر پر
احساں ہے دشمنوں کا ہم کو سنبھالتے ہیں

بیمار خواہشوں کی تکمیل کے لیے ہی !
انسان اُلجھنوں میں کیوں خود کو ڈالتے ہیں

سنجیدہ ہو کے کب وہ باتیں مری سنیں گے
کیا کہہ رہے ہو کہہ کر اکثر جو ٹالتے ہیں

غالبؔ سا میرؔ جیسا انداز کب ملے گا
الفاظ کے سمندر ہم بھی کھنگالتے ہیں

شیشے کے گھر ہیں جن کے اکثر یہاں وہ تتانی
پتھر ہماری جانب پھر کیوں اچھالتے ہیں

فسادوں کے لیے راہیں یوں بجھو کھول دیتا ہے
اُڑتی بھیڑ سے جانے وہ کیا کچھ بول دیتا ہے

نہ سمجھا آج تک کوئی بھی اُس کی اِس سیاست کو
کسی کی جھولی بھرتا ہے، کسے کشکول دیتا ہے

تم اس کے ظلم کا لوگو! لگاؤ اس سے اندازہ
وہ رسّی کاٹ کر ہاتھوں میں جس دم ڈول دیتا ہے

بناتا ہے سدا ہم کو تشدد کا نشانہ وہ
فضائے امن میں زہرِ ہلاہل گھول دیتا ہے

وہ دولت جس کا دنیا میں نہیں ہے کوئی بھی تتانی
معلّم ساری دنیا کو وہ شئے انمول دیتا ہے

ڈاکٹر محمد یحییٰ جمیل

ڈاکٹر محمد یحییٰ جمیل ابن محمد عبدالجلیل (رٹائرڈ ایف۔ڈی۔او) (امراوتی)
تاریخ پیدائش : ۳۰ رجنوری ۱۹۷۴ء
ایم۔اے (تاریخ، فارسی، اردو) بی۔ایڈ۔پی۔ایچ۔ڈی
اسسٹنٹ پروفیسر وصدر شعبۂ فارسی شریمتی کیسر بائی لاہوٹی مہاودیالیہ، امراوتی
''ہم جاوداں'' ''کلام شکل انکاری'' (مرتب) ''فارسی شاعری کے اسالیب کا مطالعہ'' (معاون مرتب)

ایک تمنا لاکھوں لاشیں　　خواہش پوری باتی باتیں
تیرا چہرہ دیکھنا چاہیں　　تاریکی میں اندھی آنکھیں
اپنی منزل اُجڑی قبریں　　اپنی دولت سوکھی گھٹائیں
چھایا بھی کانپ رہی ہے　　اس کا آنگن، اُس کی شاخیں
وقت کا پہیا اتنا دھیما　　کب تک انگاروں پر راتیں
کیا بولیں قسمت کے مارے　　چھاگل خالی رِستی آنکھیں
تیرے جاتے ہی یحییٰ سے　　دامن کش برکھا کی راتیں

''کاگا بولے من کے سونے آنگن میں''　　کاجل بھیگے تو رنگ اترے جیون میں
جانے کون چرا لیتا ہے درشن میں　　ہر پل جو آکرتی رہتی ہے من میں
تو کس دیس گئی ست رنگی پھول کھلا　　دل اب بھی پھرتا ہے تیرے مدھوبن میں
من کی کومنائیں باندھی جاتی ہیں　　آخر بنجارے لفظوں کے بندھن میں
کیا ہے سچے پریمی کے من مندر میں　　ہو چوکھٹ کی اِچھا پوری ساون میں
سندر سندر مکھڑا دیکھا یحییٰ جی　　صبحیں کھو جائیں نینوں کے درشن میں

حسین جادو نگار چہرے مگر وہ چہرہ
قدم قدم نو بہار چہرے مگر وہ چہرہ

نسیمِ بادِ سحر کے جھونکے ہزار چہرے
ہزار وجہِ قرار چہرے مگر وہ چہرہ

حیا سے مملو یہ باوفا سادگی کے پیکر
یہ نیک الفت شعار چہرے مگر وہ چہرہ

یہ فتنہ ساماں حسیں بدن کے اُبھار توبہ
فراخ دل بے شمار چہرے مگر وہ چہرہ

ہلال ابرو' دراز گیسو' بہشت سیما
حسین کتنے ہیں یار چہرے مگر وہ چہرہ

ہو خاک سرمایۂ سکونِ حیات جن سے
کئی مثالِ شرار چہرے مگر وہ چہرہ

یہ دشمنِ جاں یہ سارے غارت گرِ تحمل
بڑے قیامت گذار چہرے مگر وہ چہرہ

چشمِ پُرآب گھٹا سی اُس کی
دیکھیے رنگ شناسی اُس کی

آج چہرے کو نظر لگنے لگی
یاد آئی تھی ذرا سی اُس کی

یاد کا دریا چڑھا جاتا ہے
پھر نگاہیں ہوگئیں پیاسی اُس کی

گرد آلودہ نہیں بال کوئی
سر پہ رہتی ہے ردا سی اُس کی

چاک جو آخرِ شب ہوگئی ہے
اشکوں سے اب وہ قبا سی اُس کی

آپ حیران ہے دنیا اُس پر
دیو جس شخص کا داسی اُس کی

شیخ سلیم سحرؔ

شیخ سلیم سحرؔ ابن شیخ بنو، اکولہ
ایچ۔ایس۔سی، ڈی۔ایڈ تاریخ پیدائش : یکم جولائی ۱۹۷۵ء
درس وتدریس
مدرس ڈاکٹر علامہ اقبال اردو اسکول، اکولہ

امیروں کے لعل و گہر بولتے ہیں — غریبوں کے علم و ہنر بولتے ہیں
غمِ ہجر کی اِک کہانی ترا خط — لکھاوٹ کے زیر و زبر بولتے ہیں
نمازی بنو گر محبت ہے مجھ سے — حدیثوں میں خیرالبشرؐ بولتے ہیں
جنھیں علم و فن پر تکبر نہیں ہے — وہی آدمی مختصر بولتے ہیں
اذاں ہو رہی ہے مری سمت آؤ — مساجد کے دیوار و دَر بولتے ہیں
سحرؔ نرم لہجے کا انداز چھوڑدو — یہاں صرف تیغ و تبر بولتے ہیں

خلوص و وفا کا چمن چومتے ہیں — نئی صبح کی ہم کرن چومتے ہیں
نہ کر ہم سے منسوب دہشت پسندی — ہم اُلفت میں خاکِ وطن چومتے ہیں
ہے تاریخ شاہد زمانہ بھی شاہد — میاں! حوصلے ہی گگن چومتے ہیں
نظر موت سے وہ چُراتے نہیں ہیں — جو دیوانے ہنس کر کفن چومتے ہیں
یتیموں پہ نظرِ کرم کرنے والے — فرشتے ترا پیرہن چومتے ہیں

وفا کی راہ میں کیا مہرباں مِلا مجھ کو
جو آپ مِل گئے سارا جہاں مِلا مجھ کو

تجھی کو اپنا بنایا تجھی سے پیار کیا
سکونِ قلب ترے بن کہاں مِلا مجھ کو

کسے سناتا مَیں کیفیتِ درونِ دل
نہ ہم سخن نہ کوئی ہم زباں مِلا مجھ کو

نگاہِ قلب کے کھلتے ہی آج میرا خدا
مَیں ڈھونڈتا تھا کہاں اور کہاں مِلا مجھ کو

مَیں جب لگن کے پَروں سے اُڑان بھرنے لگا
نئی زمین نیا آسماں مِلا مجھ کو

چراغوں کی حمایت کررہا ہوں
مَیں سورج سے بغاوت کررہا ہوں

مری آنکھیں منوّر ہو رہی ہیں
تری جب سے زیارت کررہا ہوں

قیامت خیز ہیں حالات لیکن
مَیں جینے کی جسارت کر رہا ہوں

مری عزّت زمانہ کر رہا ہے
بزرگوں کی مَیں عزّت کررہا ہوں

مسلسل اپنا خونِ دل جلا کر
غزل مَیں تیری خدمت کررہا ہوں

اکرام اللہ خان اظہرؔ

اکرام اللہ خاں اظہرؔ ابن کرامت اللہ خاں، عمر کھیڑ (ایوت محل) بی۔اے۔ڈی۔ایڈ
تاریخ پیدائش : ۵ر اکتوبر ۱۹۷۵ء موبائیل : 9175835353
مدرس نگر پریشد اردو اسکول عمر کھیڑ، ایوت محل ''چائے'' (مجموعۂ کلام زیر ترتیب)

طنز کے پتھر مسلسل ہم پہ برساتے رہے
کچھ کرم احباب اپنے یوں بھی فرماتے رہے

عشق کا الزام تنہا کیوں رہے میرے ہی سر
دم بہ دم تم بھی تو میری راہ میں آتے رہے

شور میں آواز ان کی کوئی بھی سنتا نہ تھا
بھیڑ میں کتنے گداگر ہاتھ پھیلاتے رہے

آپ نے شاید ہمارا حوصلہ دیکھا نہیں
''زخم کھا کر دوستوں پر پھول برساتے رہے''

غیر ممکن تھا زمانے میں مرے دل کا علاج
جانے کیا کیا کہہ کے ہم کو لوگ بہلاتے رہے

اس کی یادوں سے سجالی اپنی بزمِ آرزو
دل کو تنہائی میں اظہرؔ یوں بھی بہلاتے رہے

میرے ہونے کا تماشا نہیں ہونے دیتا
ظرف دھیما، میرا لہجہ نہیں ہونے دیتا

جھیل کی طرح مجھے قید کیا ہے اس نے
میرے جذبات کو دریا نہیں ہونے دیتا

استعانت وہ بہر حال کیا کرتا ہے
میرا مالک مجھے رُسوا نہیں ہونے دیتا

میری عادت ہے کہ پوشیدہ مدد کرتا ہوں
''اپنے ہمسائے کو رُسوا نہیں ہونے دیتا''

نت نئے درد دیا کرتا ہے دلبر مجھ کو
غمِ دُنیا کو اکیلا نہیں ہونے دیتا

جس کو پالا کہ بڑھاپے کی بنے گا لاٹھی
خود کا بیٹا یہ سہارا نہیں ہونے دیتا

ڈال دیتا ہے وہ رشتوں میں دراڑیں اظہرؔ
بھائیوں کو کبھی یکجا نہیں ہونے دیتا

کیوں بھلا ڈھونڈنے جاؤں ترے رستے جاناں
تو رگِ جاں سے بھی نزدیک ہے میرے' جاناں
بے وفائی کی بھلا تجھ سے شکایت کیسی
تُو نے خود، خود پہ لگائے ہیں یہ پہرے جاناں
دل پہ سو بار رفو اور رفو کیا معنی
زخم اتنے تو نہ تھے دل کے یہ گہرے جاناں
میں تو کل بھی تھا وہی، آج وہی، کل بھی وہی
لوگ چہرے پہ لگا لیتے ہیں چہرے جاناں
کچھ نئے ہیں تو نہیں میرے مراسم اس سے
تھے ازل ہی سے تعلق مرے گہرے جاناں
بے گناہی کا کسے حال سناتا اظہرؔ
تھے عدالت میں سبھی گونگے و بہرے جاناں

قیامت کی تڑپ غم انتہا کا ۔۔۔ صلہ ہم کو ملا ہے یہ وفا کا
بھرم ٹوٹا نہیں میری انا کا ۔۔۔ ابھی تک فضل ہے اظہرؔ خدا کا
ہمیں پھر خوف کیا روزِ جزا کا ۔۔۔ وسیلہ ہے محمدؐ مصطفیٰؐ کا
سنبھل کر کیجئے گا گفتگو بھی ۔۔۔ مخالف آج کل ہے رُخ ہوا کا
مزہ آنے لگا ہے دردِ دل میں ۔۔۔ اثر شاید ہے یہ میری دعا کا
کوئی خائف نہ اس کو کر سکے گا ۔۔۔ جو دامن تھام لے مشکل کشا کا
جہاں سچ بولنا ہے جرم اظہرؔ ۔۔۔ وہاں کیا کام ہے اہلِ صفا کا

جلیل ارشد خاں راشدؔ

جلیل ارشد خاں ابن راشد اللہ خاں جوہر، کھام گاؤں
ایم۔اے۔بی۔ایڈ — تاریخ پیدائش : ۲۹ نومبر ۱۹۷۶ء
درس وتدریس — موبائیل : 7507023399

بھیگی پلکوں پہ خواب چھوڑ گیا — رتجگوں کے عذاب چھوڑ گیا
خار سارے سمیٹ کر اِک شخص — اپنے پیچھے گلاب چھوڑ گیا
نشۂ وصل اب بھی باقی ہے — جانے کیسی شراب چھوڑ گیا
ڈھونڈتے پھر رہے ہیں ہم اس کو — جب سے عہدِ شباب چھوڑ گیا
عہدِ رنگیں گذر گیا راشدؔ — پیچھے فکرِ حساب چھوڑ گیا

اپنے ہونٹوں پہ نہ شکوے نہ گلے ہیں صاحب — رہ گئے غم سو مقدر سے ملے ہیں صاحب
پسِ زنداں، سرِ مقتل بھی، سرِ دار بھی ہم — کیا یہی اپنی وفاؤں کے صلے ہیں صاحب
میکشی کو نہ سہی وعظ کو آئے ہوں گے — میکدے میں بھی ہمیں شیخ ملے ہیں صاحب
ایک عرصہ ہوا یوں ترکِ تعلق کو مگر — اُن کی یادوں کے کنول اب بھی کھلے ہیں صاحب
تب بھی برداشت کیا اب بھی ستم کر دیکھیں — ہونٹ اپنے تھے سِلے اب بھی سِلے ہیں صاحب
یہ مری عزت و شہرت، یہ ترقی، یہ عروج — یہ مری ماں کی دعاؤں کے صلے ہیں صاحب
راشدِؔ خستہ سے لگتی ہے شناسائی بہت — آپ کیا پہلے کبھی اس سے ملے ہیں صاحب

فکریں، رنج و الم اور میں
ہمراہی اِک غم اور میں

تیری باتیں کرتے ہیں
رات دوات قلم اور میں

تجھ کو ڈھونڈتے رہتے ہیں
میری چشمِ نم اور میں

پاس ہے میرے انٹرنیٹ
ہاتھ میں جامِ جم اور میں

ایک تو تیری کج خلقی
پھر دنیا کے ستم اور میں

کب تک ساتھ چلیں راشدؔ
ہجر کے یہ موسم اور میں

اس درجہ بھاگ دوڑ کے اتنا کمائیں گے
ہم زندگی کی شام تلک گھر بنائیں گے

پہلے تو زندگی کی بہت چاہ تھی ہمیں
کس کو خبر تھی راہ میں یہ موڑ آئیں گے

کہتے ہیں کٹ ہی جاتی ہے عمرِ دراز بھی
سو مطمئن ہیں اپنے بھی دن بیت جائیں گے

محرومیوں کے داغ نا آسودہ خواہشیں
ان سب کے ساتھ ہم تجھے کیا منہ دکھائیں گے

مر کر بھی خواہشوں سے نہ مل پائے گی نجات
ہم خواہشِ بہشت کے چکر میں آئیں گے

اللہ مہربان بھی عادل بھی ہے جلیلؔ
چلیے اسی سے چل کے ذرا لو لگائیں گے

کلیم رہبرؔ

سیّد کلیم رہبرؔ ابن سیّد بشیر، امڑا پور (بلڈانہ)　　موبائل : 9767125832
تاریخ پیدائش : ۱۵ جون ۱۹۷۶ء
ایم۔اے۔بی۔ایڈ　　''امن کا پیغام'' (نظمیں، گیت)
رسورس پرسن سرو شکشا ابھیان ضلع پریشد بلڈانہ

ہر سمت خود نمائی کا منظر ہے آج کل
رہزن بھی اپنے آپ میں رہبر ہے آج کل

جھلسا دیا ہے جیسے زمانے کی دھوپ نے
پیاسا ہے جس کا نام سمندر ہے آج کل

ہر شخص چاہتا ہے ملے مرتبہ مجھے
ہر ایک اندھی سوچ کا خوگر ہے آج کل

عصمت سے کھیلنا یہاں جس کا شعار ہے
سب کی نگاہ میں وہی برتر ہے آج کل

زردار جتنے شہر میں تھے ان کو گھر ملے
گھر اس کو مل نہ پایا جو بے گھر ہے آج کل

جو شخص اپنے دور کا آئینہ دار تھا
افسوس اس کے ہاتھ میں پتھر ہے آج کل

لفظوں میں کس طرح اسے رہبرؔ بیاں کروں
اس دل کے آئینے میں جو منظر ہے آج کل

بکھرے جو خلاؤں میں یہ چاند ستارے ہیں
کچھ خواب تمھارے ہیں، کچھ خواب ہمارے ہیں

کیا خون رُلاتے ہیں تنہائی کے عالم میں
وہ لمحے محبت کے جو ساتھ گزارے ہیں

ممکن ہے زمانے کو پھر ان کی ضرورت ہو
یہ امن و محبت کے انمول نظارے ہیں

یارب مری کشتی کا اب تو ہی محافظ ہے
طوفان مقابل ہے اور دور کنارے ہیں

یہ جھوٹی سیاست اور مطلب کے نمائندے
کہتے ہیں بڑھو آگے ہم ساتھ تمھارے ہیں

بے قدر زمانے کو احساس نہیں آخر
موتی کی طرح رہبرؔ یہ اشک ہمارے ہیں

کسی صورت بھی باطل کی طرفداری نہیں کرنا
منافق کی طرح ہرگز اداکاری نہیں کرنا
وطن کے جاں نثاروں نے دیا ہے درس یہ ہم کو
کبھی اپنے وطن کے ساتھ غداری نہیں کرنا
یہ اندھی شہرتیں اک دن تمہیں بے نام کر دیں گی
کبھی تم بھول کر دھوکہ، ریاکاری نہیں کرنا
میاں وہ مال جس میں بے کسوں کی آہ شامل ہو
تم ایسی چیز سے ہرگز بھی افطاری نہیں کرنا
اگرچہ تم ہو رہبر قوم کے تو دھیان یہ رکھنا
وفاداری پہ قائم رہنا عیاری نہیں کرنا

زمانے سے بچھڑتے جا رہے ہیں
ہم آپس میں جو لڑتے جا رہے ہیں
محبت کی بہاریں کھو گئی ہیں
چمن دل کے اجڑتے جا رہے ہیں
تکبّر سے زمیں پر گر پڑیں گے
بلندی پر جو چڑھتے جا رہے ہیں
تعصب کی اُگی ہے فصل جب سے
مسائل اور بڑھتے جا رہے ہیں
فسادوں کی ہوا تھمنے لگی ہے
کبوتر نے پکڑتے جا رہے ہیں
خزاں کا دور شاید آگیا ہے
یہ برگ و گل جو جھڑتے جا رہے ہیں
پرانے پیڑ رہبر آندھیوں میں
زمینوں سے اُکھڑتے جا رہے ہیں

ڈاکٹر شعیب احمد خان شعیبؔ

ڈاکٹر شعیب احمد خاں ابن مجید خاں بالاپور (اکولہ) موبائل : 9850554163
تاریخ پیدائش : ۱ر جولائی ۱۹۷۶ء
بی۔یو۔ایم۔ایس طبابت

دلِ غریب میں گر احتیاج رکھا ہے
تو بادشاہ کے دل میں خراج رکھا ہے

میں مطمئن بھی بہت کچھ ہوں اپنے پیشے سے
مرے نصیب میں اس نے علاج رکھا ہے

کوئی ملے نہ ملے ، اس کا غم نہیں یارو!
بنا کے ہم نے بھی اپنا مزاج رکھا ہے

کسی کسی کو مقدر کیا ہے جذبِ خلوص
کسی کسی میں بہت احتیاج رکھا ہے

نہ حُبِّ جاہ و حشم ہے نہ مال و زر کی تلاش
درِ فقیر پہ کس نے یہ تاج رکھا ہے

اب ظلمتِ شب، سحر پہ قربان بھی ہوگی
مسجد کی اذاں نور کا فرمان بھی ہوگی

اس کو نظرِ بد سے بچانا مرے مولا
اسلام پہ قربان میری جان بھی ہوگی

پیغامِ الٰہی رہے کیسے پسِ پردہ
تبلیغ جہاں میں علی الاعلان بھی ہوگی

مانا کہ تمھارے لیے کچھ سخت ہیں راہیں
دنیا پہ کسی روز مہربان بھی ہوگی

ملحوظ رکھے نقش کفِ پائے نبیؐ جو
ہستی تو وہی عالی و ذیشان بھی ہوگی

ازل کے دن کی گواہی کو بھول بیٹھا ہے
جہاں میں آ کے الٰہی کو بھول بیٹھا ہے

لہو کا رنگ بھی ہونے لگا سفید اب تو
غضب ہے بھائی جو بھائی کو بھول بیٹھا ہے

وہ جس نے دشت نوردی کو آبرو بخشی
وہ کیسے آبلہ پائی کو بھول بیٹھا ہے

شباب آیا تو رنگینیوں میں ڈوب گیا
قضا کی دستِ رسائی کو بھول بیٹھا ہے

جو بڑھ کے دن میں غریبوں کے کام کرتا ہے
بنا ہے رات وہی قتلِ عام کرتا ہے

فقیرِ شہر میں کیا بات ہے خدا جانے
امیرِ شہر بڑا احترام کرتا ہے

ضعیف باپ سے جو بات تک نہیں کرتا
امیرِ شہر کو جھک کر سلام کرتا ہے

خموشیوں کا یہ سنگِ گراں بھی بولے گا
ابھی تو مال ، ابھی زر کلام کرتا ہے

شعیبؔ نارِ جہنم کا خوف کیا ہو اُسے
جو ذکرِ حضرتِ خیرالانامؐ کرتا ہے

خواجہ سعید الدین نوابؔ

خواجہ سعید الدین نوابؔ ابن خواجہ زین العابدین نایابؔ، اکولہ
تاریخ پیدائش : ۲۹ جولائی ۱۹۷۶ء　موبائیل : 9881649980
ایچ۔ایس۔ایس۔سی۔آئی۔ٹی

پڑھا ہے ہم نے سبق ہر گھڑی صداقت کا
اسی لیے تو یہ ہم پر اثر ہے رحمت کا

میں سچ کو جھوٹ کی بوتل میں بند کرلوں گا
مرے گلے میں بھی تعویذ ہے سیاست کا

مری نگاہ بھلا کیوں نہ ہو مقدس تر
میں روز کرتا ہوں دیدار اپنی جنت کا

میں بچ گیا ہوں مرا نام غازیوں میں لکھو
ارادہ کر کے تو نکلا تھا میں شہادت کا

جبینِ شوق کے سجدوں کا لطف یا اللہ
وہ مرحلہ بھی عجب تھا تری رفاقت کا

ابھی تلک ہے تخیل میں نور کی بارش
خیال آیا تھا اک دن تمہاری مدحت کا

لو آج وقت کی ٹھوکر میں آگئے ہیں نوابؔ
نشہ تھا جن کے دماغوں میں بادشاہت کا

وہ کم شعور ہے پھر بھی کمال کرتا ہے
ہمارے لفظوں میں ہم سے سوال کرتا ہے

کرم کسی کا سنبھالے ہوئے ہے راہوں میں
یہ خارزار وگرنہ نڈھال کرتا ہے

اسی کے سر رہا الزام فتنہ سازی کا
جو امن، رُت میں خلل کی، بحال کرتا ہے

وہ پتھروں میں بھی دیتا ہے رزق کیڑوں کو
کمال والا ہے وہ ہر کمال کرتا ہے

موذنوں کے لبوں سے اذان سنتے ہی
پرندہ حمد و ثنا ڈال ڈال کرتا ہے

نوابؔ کے کوئی طرزِ سخن پر غور کرے
ہر ایک شعر میں خود سے مقال کرتا ہے

کبھی نفرت کے لہجے سے محبت کانپ جاتی ہے
مخالف کوئی اپنا ہو تو ہمت کانپ جاتی ہے
سنا ہے قاتلوں کے خوف سے منصف لرزتے ہیں
سزا ان کو سنانے کو عدالت کانپ جاتی ہے
بہادر باغیوں کے حوصلوں سے کچھ نہیں ہوتا
اگر سردار بزدل ہو بغاوت کانپ جاتی ہے
ہمارے حوصلوں کو تو نظر انداز مت کرنا
یہ وہ بازو ہے جس سے بادشاہت کانپ جاتی ہے
ہوس کا زور ہوتا ہے امیروں کے مکانوں میں
غریبِ وقت کی ہر اک ضرورت کانپ جاتی ہے
نوابِؔ وقت ہوں لیکن مری خستہ حویلی ہے
کبھی دیوار ہلتی ہے، کبھی چھت کانپ جاتی ہے

وہ بات بات میں ایسے نشان چھوڑ گیا
سلگتے دل کو چتا کے سمان چھوڑ گیا
نہ جانے کون سی دھن میں تھا قاتلوں کا ہجوم
تڑپتے جسموں میں تھوڑی سی جان چھوڑ گیا
جسے میں اپنے مسائل کا حل سمجھتا تھا
وہ جب گیا تو بہت امتحان چھوڑ گیا
ہمارا راز تری بزم تک گیا کیسے
ہے کون جو پسِ دیوار کان چھوڑ گیا
وہ آج تک ہے مہاجر کے نام سے بدنام
جو شخص طیش میں ہندوستان چھوڑ گیا
شکایتیں بھی کریں ہم نوابؔ تو کیسے
وہ لفظ چھین کے منہ میں زبان چھوڑ گیا

عرفان انجم

محمد عرفان الرحمٰن انجم ابن محمد وحید الرحمٰن، اکولہ — موبائیل : 9527399180
بی۔اے۔ڈی۔ایڈ — تاریخ پیدائش : یکم رجولائی ۱۹۷۷ء
درس وتدریس ضلع پریشد بلڈانہ

آئینوں کے لیے یہ بات سعادت کی ہے
اُن کو بھی آج تمنا تری صورت کی ہے

ہو مبارک تمھیں ملکوں پہ حکومت یارو
ہم نے اخلاق سے ہر دل پہ حکومت کی ہے

شوق سے اہلِ سیاست نے سنیں ہیں باتیں
کیسے سمجھیں گے مگر بات شرافت کی ہے

منتخب جن کو کیا عرضِ تمنا کے لیے
ان ہی لفظوں نے مرے ساتھ بغاوت کی ہے

مَیں نے بھی دیکھ لی دنیا ہی میں جنت انجم
مَیں نے بھی آج مری ماں کی زیارت کی ہے

اہلِ جنوں سا کام کسی نے نہیں کیا
صحراؤں میں قیام کسی نے نہیں کیا

غالب تھے دشمنوں پہ مگر اہلِ ظرف تھے
اقدامِ انتقام کسی نے نہیں کیا

محفل میں کوئی صاحبِ حسن نظر نہ تھا
پردے کا اہتمام کسی نے نہیں کیا

سب لوگ مقتدی ہیں دماغوں کے آج کل
اس قلب کو امام کسی نے نہیں کیا

دنیا کی لذتوں میں گرفتار ہو گئے
عقبیٰ کا انتظام کسی نے نہیں کیا

دل مرا مائلِ آرزو ہوگیا — جب مرے یار کے روبرو ہوگیا
دامنِ دل مرا چاک تھا یک بیک — ان کی نظرِ کرم سے رفو ہوگیا
وہ جسے مَیں نے دیکھا نہیں تھا کبھی — آج وہ ہی مری جستجو ہوگیا
خوب دل سے سُنیں اس نے باتیں مری — آج مَیں لائقِ گفتگو ہوگیا
جب تصور میں تصویرِ یار آگئی — اِک اُجالا مرے چار سو ہوگیا
بے تکلف ہوئے مجھ سے جب وہ تو مَیں — آپ سے تم ہُوا ، تم سے تُو ہوگیا
ذکرِ انجم ہُوا جب تری بزم میں — تب سے وہ صاحبِ آبرو ہوگیا

جو چوٹ کھانے سے ڈر رہے ہیں — وہی شجر بے ثمر رہے ہیں
وہ چاہتے ہیں مجھے ڈرانا — جو میرے زیرِ اثر رہے ہیں
جنھیں سکھایا تھا ہم نے اُڑنا — وہ پَر ہمارے کتر رہے ہیں
سُنا ہے وہ اب تو گفتگو بھی — ہمارے لہجے میں کر رہے ہیں
پرندے شہرت کے رفتہ رفتہ — بلندیوں سے اُتر رہے ہیں
وہ آرہے ہیں ، خبر چلی ہے — کسی کے چہرے سنور رہے ہیں
وہ تک رہے ہیں مجھے مسلسل — بہت سے چہرے اتر رہے ہیں
وقیع کتنے ! یہ قید خانے — یہاں پہ اہلِ نظر رہے ہیں
یہ موت حیرت زدہ ہے انجم — کہ لوگ جینے پہ مر رہے ہیں

جمیل ارشد خاں ارشدؔ

جمیل ارشدؔ خاں ابن راشد اللہ خاں جوہرؔ، کھام گاؤں
بی۔اے۔بی۔ایڈ　　تاریخ پیدائش : ۲۶ر نومبر ۱۹۷۸ء
درس وتدریس　　موبائیل : 9503600264

گردشِ حالات سے ہوں کیوں پریشاں تتلیاں
ہیں سرور و کیف و مستی میں یہ رقصاں تتلیاں

دیکھ کر رنگیں گلوں کی بے ثباتی تا سحر
کر رہی ہیں بے وفا بھنوروں سے پیماں تتلیاں

مستیوں میں محو ہیں مستوریوں میں کچھ مگر
ہیں کھلے بندوں غریقِ بحرِ عصیاں تتلیاں

مثلِ پروانہ کھنچی آتی ہیں اُس کی دید کو
دیکھنے بے تاب ہیں ماہِ درخشاں تتلیاں

چھیڑتی ہیں شوخیوں سے زرفشاں رُخسار کو
چومتی ہیں یا سیاہ سنبلستاں تتلیاں

سیکھنا ہے شوخیاں ان کو کسی گلناز سے
کر رہی ہیں یوں طوافِ کوئے جاناں تتلیاں

دیکھتا ہوں ان کو جب اٹکھیلیاں کرتے ہوئے
تو دلا دیتی ہیں مجھ کو یادِ خوباں تتلیاں

فکرِ شعری کے لئے ارشدؔ چمن جاتا ہوں جب
ساتھ ہوتی ہیں مرے اکثر غزلخواں تتلیاں

آؤ مل کر سوچیں اس کی تدبیریں
کیسے ٹوٹیں گی قدموں کی زنجیریں

جو قومیں ماضی سے درس نہیں لیتیں
خاک میں مل جاتی ہیں ان کی تقدیریں

وقت نے جانے چہرے پر کیا کیا لکھا
اُلجھی اُلجھی بوسیدہ سی تحریریں

رات گئے جب گھر کو واپس آتا ہوں
خاموشی کرتی ملتی ہے تقریریں

ارشدؔ میرا آج بھی وہ سرمایہ ہیں
دھندلی دھندلی عہدِ کہن کی تصویریں

دے سکتا ہے کیا میری وفاؤں کا صلا اور
ترکش میں اگر تیر ہوں باقی تو چلا اور

میں راہ روِ راہِ تمنا ہوں ستمگر
ہر زخم پہ بڑھ جاتا ہے کچھ میرا نشا اور

دیوانے جلاتے ہیں چراغوں کو لہو سے
اس واسطے بڑھ جاتی ہے کچھ ان کی ضیاء اور

اس ملتِ مظلوم کی غیرت کو جگانے
دو چار تھپیڑے ذرا اے موجِ بلا اور

کیا حوصلہ توڑے گی مرا بادِ مخالف
بجھتا ہے دیا ایک تو جلتا ہے دیا اور

پھیلے گی شفق بن کے مرے خون کی لالی
گردوں کے بھی پھر ہوں گے کچھ انداز و ادا اور

تبدیلیٔ حالات کا شائق ہے زمانہ
درکار مگر ہے ابھی کچھ رنگِ حنا اور

پیرانِ خرابات تو مے نوشی میں خوش ہیں
معلوم ہو کیا ان کو محبت ہے نشا اور

ہے خرقۂ سالوس یہ زاہد' ذرا بچنا
خلوت کی قباء اور ہے جلوت کی قباء اور

ہو سکتا ہے میں تجھ کو میسر نہ رہوں کل
جی بھر کے مجھے جانِ وفا آج ستا اور

یہ کیسے مسیحا سے پڑا ہے مرا پالا
بڑھتا ہے مرض میرا جو دیتا ہے دوا اور

پرخار گذر گاہ کا شیدائی ہوں ارشدؔ
اس راہ پہ چلنے کا ہے اپنا ہی مزا اور

زخمِ تنہائی ملا عشق میں رسوائی بھی
پھر بھی کچھ کم نہ ہوئی عشق کی گہرائی بھی

آج ہنس ہنس کے جو غیروں سے ملا کرتا ہے
تھا وہی شخص کبھی میرا ہی شیدائی بھی

جام آنکھوں کے وہ ہونٹوں کی گلابی کلیاں
اور یاد آتی ہے اس کی مجھے انگڑائی بھی

بدگماں جس سے کیا کرتا ہے اکثر مجھ کو
ہے اسی چاند کا وہ شخص تمنائی بھی

پھر سے دستک دیِ دل پر، یہ بھلا کون آیا
نہیں تصویر تو پہلی ابھی دھندلائی بھی

میری عادت ہے کہ ہر اک سے ملا کرتا ہوں
یوں ضروری تو نہیں سب سے شناسائی بھی

جس سے لگتا تھا بہت ڈر مجھے پہلے ارشدؔ
راس آتی ہے مجھے اب وہی تنہائی بھی

تنویر غازی

تنویر جاوید ابن محمد مظفر، ناندورہ — مقیم : امراوتی
تاریخ پیدائش : ۱۰ ردسمبر ۱۹۷۱ء
تعلیم : ایم۔اے (اردو، فارسی) پی۔ایچ۔ڈی (اسکالر)
"احساس" (شعری مجموعہ) — بالی ووڈ

لاش پڑی ہے اور سناٹا ہے بھائی — کس نے بچے کا سر کاٹا ہے بھائی
نیکی، بدی کا کمپیوٹر ہے اُس کے پاس — کمپیوٹر میں سب کا ڈاٹا ہے بھائی
نفرت نام کی اس نالائق بلّی نے — خون ہمارا صدیوں چاٹا ہے بھائی
دل کے کیا کرتوت بتائیں یوں سمجھو — اس مُلّا نے سوُر کاٹا ہے بھائی

دل ترے حسن کی کرنوں کو گرفتار کرے — روز تعمیر کوئی نور کا مینار کرے
میں اب اس طرح گذرتا ہوں گلی سے اُس کی — جیسے اندھا کوئی ڈر ڈر کے سڑک پار کرے
میں وہ سورج ہوں کہ زنجیر پگھل جاتی ہے — وہ مجھے ریشمی دھاگوں سے گرفتار کرے
خواب کی لاش پڑی ہے نہ جنازہ نہ کفن — دل کسے فون کرے اور کسے تار کرے

اس کی آنکھوں میں محبت کی چمک آج بھی ہے
اس کو حالانکہ مرے پیار پہ شک آج بھی ہے
ناؤ میں بیٹھ کے دھوئے تھے کبھی ہاتھ اُس نے
سارے تالاب میں مہندی کی مہک آج بھی ہے
میری اک شرٹ میں کل اُس نے بٹن ٹانکا تھا
شہر کے شور میں چوڑی کی کھنک آج بھی ہے
اُسے کھوکر بھی نہ کھونے کی خوشی اب نہ رہی
اُسے پاکر بھی نہ پانے کی کسک آج بھی ہے
زخم سب سوکھ گئے ہیں مرے مرہم کے بناء
میرے اک دوست کی مٹھی میں نمک آج بھی ہے

جواں ستاروں کو گردش سکھا رہا تھا میں
کل اس کے ہاتھ کا کنگن گھما رہا تھا میں
اُسی دیئے نے جلایا مری ہتھیلی کو
کہ جس کی لَو کو ہوا سے بچا رہا تھا میں
تمام گوپیاں مصروف تھی نمائش میں
اکیلا کھیت میں بنسی بجا رہا تھا میں
یہ بات دھوپ کو شاید بہت خراب لگی
سلگتی ریت پہ بادل بچھا رہا تھا میں

شہزادانورؔ

شہزادانور خاں ابن عبدالرحمٰن خاں، بارسی ٹاکلی (اکولہ) موبائیل : 9422160220
تاریخِ پیدائش : ۱۹؍دسمبر ۱۹۷۱ء
ایم۔اے۔بی۔ایڈ درس وتدریس

یہ جو انسان ہیں بے شمار ان کے ارمان ہیں بے شمار
زندگی میں تجھے کیا لکھوں تیرے عنوان ہیں بے شمار
اے خدا کر حفاظت مری دشمنِ جان ہیں بے شمار
میری کشتی ہے ٹوٹی ہوئی اور طوفان ہیں بے شمار
باغ میں گل کھلا ایک ہے اور گلدان ہیں بے شمار
درد دل میں بھرا ہے مگر لب پہ مسکان ہیں بے شمار
جس پہ قربان انورؔ ہو تم اُس پہ قربان ہیں بے شمار

تو قلم کی پاکیزہ تحریر ہے خوش نما الفاظ کی زنجیر ہے
میرے دل کش خواب کی تعبیر ہے تو غزل کی جانِ من تقدیر ہے
قتل کردے دیکھ لے تو جس طرف جھلملاتی آنکھ میں شمشیر ہے
چاند، تارے، پھول، گوہر یہ سبھی آپ ہی کے حسن کی جاگیر ہے
لال قلعہ ہے وراثت قوم کی ہاں مرے اجداد کی تعمیر ہے
دل ہُوا روشن مرا پڑھ کر نماز یہ کلامِ پاک کی تاثیر ہے
کونسا مَیں رنگ بھروں انورؔ بتا وہ مکمل قدرتی تصویر ہے

مدّت سے اُس کے شہر سے گذرا نہیں ہوں میں — پر ذہن و دل سے آج بھی نکلا نہیں ہوں میں

تیری ہر ایک سانس کو اپنی بنا لیا — اور تو یہ کہہ رہا ہے کہ تیرا نہیں ہوں میں

بس اک ذرا سی بات پہ بدنام کر دیا — سب کو بتا رہا ہے کہ اچھا نہیں ہوں میں

مَیں دوسروں کو ڈھالتا ہوں اپنے رنگ میں — ہرگز کسی کے رنگ میں ڈھلتا نہیں ہوں میں

دنیا سمجھتی مجھ کو خرد مند اس لئے — کہ گفتگو فضول کی کرتا نہیں ہوں میں

قسمت نے مجھ کو زیرو سے ہیرو بنا دیا — ہوں آج بھی میں ویسا ہی بدلا نہیں ہوں میں

انورؔ شباب اُس کا کہ کوئی گلاب ہے — افسوس یہ ہے مجھ کو کہ بھنورا نہیں ہوں میں

بات دل میں ہو جو بھی کہا کیجئے — دل ہی دل میں نہ یوں ہی جلا کیجئے

غم میں خوشیوں میں شامل رہا کیجئے — حق پڑوسی کا اپنے ادا کیجئے

کوئی شکوہ نہ کوئی گلہ کیجئے — مسکرا کر سبھی سے ملا کیجئے

میرے محبوب سے آئینے نے کہا — دیکھ کر روز مجھ میں سجا کیجئے

میرے کوچے سے درویش کہتا گیا — چاہتے ہو بھلا تو بھلا کیجئے

آفتیں، مشکلیں دور ہو جائیں گی — پنج وقتہ نمازیں ادا کیجئے

گرمیٔ غم سے انورؔ پریشان ہے — ماں کے آنچل سے ٹھنڈی ہوا کیجئے

خُبیب تابشؔ

خُبیب تابشؔ ابن ڈاکٹر غلام کبریا خان شبلی، کھامگاؤں — تاریخ پیدائش : ۳۰ رنومبر ۱۹۷۸ء
ڈپلوما ان میکانیکل انجینئرنگ، درس وتدریس انجمن جونیئر کالج، کھامگاؤں (ضلع بلڈانہ)

غزل کہتی نہیں ہے بس لب و رخسار کی باتیں
بیاں کرتی ہے وہ عشق و وفا اور پیار کی باتیں
تکلم کی نہیں محتاج اور نہ لب کشائی کی
اشاروں میں بیاں کرتی ہے حالِ زار کی باتیں
کہیں کشتی کے ہچکولے، کہیں امید ساحل کی
کبھی موجوں کے نغمے ہیں، کبھی منجدھار کی باتیں
لطافت اس میں پھولوں کی تو کانٹوں کی چبھن بھی ہے
کہیں گھنگرو کی آوازیں، کہیں تلوار کی باتیں
یہ حق کی ترجماں، منصف، رفیق و رازداں سب کچھ
جنوں کی انجمن میں پھر دلِ بیدار کی باتیں
اسی میں جامِ جم، جام و سبو، ساقی و میخانہ
یہ عابد کا عمل اور حسرتِ میخوار کی باتیں
قلم کی نوک پر تابشؔ کئی جذبے مچلتے ہیں
ورق کو رازداں کرلیں، کریں اسرار کی باتیں

اپنی تنقید میں اصلاح کا عنصر رکھ دے
سیپ کے منہ میں کوئی قطرۂ مضطر رکھ دے
تیرے دشمن کو عداوت کا سلیقہ بھی نہیں
آستیں کے تلے تو خود ہی یہ خنجر رکھ دے
سارے اصنام تو اب سجدۂ یزداں میں گرے
لا کے اب ایک نیا بت کوئی آذر رکھ دے
فاصلے کیسے ہوں طے جو کہ ہیں صدیوں پہ محیط
چشمِ بینا سے قریں میل کا پتھر رکھ دے
رات بھر نیند کو آنکھوں سے جدا رکھتا ہوں
کیا عبث خواب میں پھر وہ کوئی محشر رکھ دے
جو ہیں لاعلم تری عظمت و شوکت سے خبیبؔ
سامنے ان کے ذرا قصۂ خیبر رکھ دے
کل جو قاتل تھا وہی آج ہے منصف تابشؔ
کیا عجب وہ کوئی الزام ترے سر رکھ دے

بنائے حضرتِ انساں نے اس دیں کے کئی مدفن
ملی منکر کو آزادی ، لگے معروف پر قدغن
ہوئے ہیں منبر و محراب ہی تفریق کے مرکز
زبانوں نے پہن رکھی ہے خستہ حال سی اُترن
ملوکیت عبارت خون سے، آہوں سے، اشکوں سے
حکومت کے اندھیروں کو خلافت ہی کرے روشن
تجھے تھا فخر کہ شعلوں پہ تیری حکمرانی ہے
مگر یہ دیکھ چنگاری جلاتی ہے ترا خرمن
ان اربابِ حکومت کا کوئی رشتہ ہے قاتل سے
وطن سے جب وہ نکلے کوچۂ قاتل بنا مسکن
خوشی تھی اُن کو یہ افتاد اُن پر تو نہیں گذری
ہٹی چلمن تو پائی ہے وہی آندھی لبِ روزن
یہی ہے منہجِ نبوی ، یہی کارِ نبوت ہے
کہ انساں کی غلامی سے رہے آزاد ہر گردن
اُمیدیں ، جستجو ، خواب و تمنّا کی حقیقت کیا ؟
اگر تو بے عمل ، بے حوصلہ پھر یہ بھی سرافگن
اے تابشؔ ! تو نفاذِ حکمِ ربانی اگر چاہے
تو ہو آغاز حکماء سے طریقہ ہے یہی احسن

کتابِ زندگی کا ہر ورق عنوان رکھتا ہے
ہمارے سامنے جیسے خدا فرمان رکھتا ہے
بچا کر دامنِ ایماں رواں ہو جانبِ منزل
یہ بازارِ جہاں تو حشر کا سامان رکھتا ہے
گھٹاؤں نے مقید کر لیا سورج کی کرنوں کو
یا یہ سورج ردائے مصلحت خود تان رکھتا ہے
جبینِ شوق پہ مردِ قلندر کی شکن کیوں ہو ؟
اُسے کیا غم کہ جس کو دوست خود رحمٰن رکھتا ہے
مسافت چند میلوں کی تھکا دیتی ہے جسموں کو
ملے منزل اُسے جو حوصلہ ہر آن رکھتا ہے
وہی جس کا کہ نشتر بھی یہاں بس مثلِ خنجر ہے
اُسے شکوہ ہے کیوں نشتر اگر ایران رکھتا ہے ؟
یہ گیسو زندگی کی دھوپ میں جلنے لگے تابشؔ
قرآں کو سائباں کر لے کہ تو قرآن رکھتا ہے

ڈاکٹر خالد نیّرؔ

ڈاکٹر خالد احمد خاں نیّرؔ ابن الحاج حمید خاں، امراوتی　　تاریخ پیدائش : ۲۶؍ اکتوبر ۱۹۷۹ء
بی۔ یو۔ ایم۔ ایس
طبابت

آنکھ کو نمناک کر جاتا ہے اکثر ان دنوں
آپ سے مِل کر بچھڑ جانے کا منظر اِن دنوں
ہم اسیرِ زلفِ جاناں ہجر کے مارے سہی
روشنی کرتے ہیں اکثر دل جلا کر اِن دنوں
ساس کے طعنوں سے جل کر مرگئی کوئی بہو
تذکرہ مفلس کی بیٹی کا ہے گھر گھر اِن دنوں
کچھ تمھاری بے وفائی سے بھی دل گھائل ہُوا
کچھ تو اپنا بھی ہے برگشتہ مقدر اِن دنوں
کانچ کے محلوں میں وہ رہتے تو ہیں نیّرؔ مگر
اپنے ہاتھوں میں لئے پھرتے ہیں پتھر اِن دنوں

روشنی کے زخم کھانا کیا یہی ہے زندگی
تیرگی میں دل جلانا کیا یہی ہے زندگی
ہجر کی راتوں میں اکثر اہتمامِ آرزو
خواب پلکوں پہ سجانا کیا یہی ہے زندگی
حسرتوں کی آگ میں جلنا مسلسل عشق میں
پتھروں پر گل کھلانا کیا یہی ہے زندگی
سر ہتھیلی پر لئے گھر سے نکلنا روز و شب
موت سے آنکھیں ملانا کیا یہی ہے زندگی
بے کسی لاچارگی افسردگی نیّرؔ کبھی
پاس آنا روٹھ جانا کیا یہی ہے زندگی

المیہ ایسا بھی ہو جاتا ہے منزل کے قریب
ڈوب جاتا ہے سفینہ آکے ساحل کے قریب
ہم ہی سلجھائیں گے آخر مشکلوں کی گتھیاں
ہاں ہمیں لے جایئے مشکل سے مشکل کے قریب
ہر گھڑی ہر لحہ ہر پل سوچتا رہتا ہوں میں
دل ہے غم کے پاس یا غم ہے مرے دل کے قریب
موت نے بھی رشک سے دیکھا تھا میرے عزم کو
کتنی بیباکی سے میں بیٹھا تھا قاتل کے قریب
آبلہ پائی سے نیّر میں ہراساں تو نہیں
رفتہ رفتہ آ ہی جاؤں گا میں منزل کے قریب

پاس آکر دفعتاً جب دور ہوجائے کوئی
ہائے وہ عالم کہ یوں رنجور ہوجائے کوئی
خودکشی کے واسطے گھر سے نکل پڑتا ہے وہ
جب کبھی حالات سے مجبور ہوجائے کوئی
یہ علامت اس کے اپنے ظرف کی پہچان ہے
بھول کر اوقات جب مغرور ہوجائے کوئی
یہ سراپا گلبدن تو میکدہ جیسا لگے
دیکھ کر آنکھیں تری مخمور ہوجائے کوئی
یہ تو اے نیّر کسی بھی معجزے سے کم نہیں
دیکھتے ہی دیکھتے مشہور ہوجائے کوئی

نعیم فرازؔ

محمد نعیم فرازؔ ابن محمد ہاشم، اکولہ　موبائیل : 09049011590
ایم۔اے۔ڈی۔ایڈ　تاریخ پیدائش : ۲۳؍فروری ۱۹۸۰ء
تدریس نگر پریشد دریاپور امراؤتی

لکیریں کھینچ کر کیا کیا وہ کاغذ پر بناتا ہے　ترا دیوانہ تیرے حُسن کا پیکر بناتا ہے
بدلتے وقت نے اس کا حسیں پیشہ بدل ڈالا　جو کل پھولوں کا تاجر تھا وہ اب خنجر بناتا ہے
بنا گہنوں کے رخصت ہوگئی لختِ جگر اس کی　امیروں کے لئے جو قیمتی زیور بناتا ہے
چلو اس شخص کی ہمت کی ہم بھی داد ہی دے لیں　سمندر کے کنارے ریت کا جو گھر بناتا ہے
جنوں کی کونسی منزل پہ آ پہنچا ہے دیوانہ　جو سورج کے مقابل موم کا لشکر بناتا ہے
فرازؔ اس کے قدم لینے کبھی منزل نہیں آتی　سفر کے صرف منصوبے ہی جو اکثر بناتا ہے

ہم وصل کی دن رات دعا مانگ رہے ہیں　بیمارِ محبت ہے دوا مانگ رہے ہیں
مشکل سے بہلا کرتے ہیں باظرف مخالف　دشمن مرے جینے کی دعا مانگ رہے ہیں
اس درجہ فروزاں ہیں مرے داغِ جگر بھی　خورشید و قمر مجھ سے ضیاء مانگ رہے ہیں
پرنور ہے جن سے مری آنکھوں کا جزیرہ　اوروں سے مرے گھر کا پتہ مانگ رہے ہیں
تم لوگ تمنائی ہو خورشید و قمر کے　ہم لوگ تو چھوٹا سا دیا مانگ رہے ہیں
اتنا ہے فرازؔ دلِ مضطر کا فسانہ　میرے لئے رو کر وہ دعا مانگ رہے ہیں

بیوہ ماں کو خون کے آنسو رُلاتے ہیں چراغ
چھوڑ کر بستہ کتابیں جب کماتے ہیں چراغ

سونے چاندی ، تانبے پیتل سے بنانا فن نہیں
اہلِ فن وہ ہیں جو مٹی سے بناتے ہیں چراغ

آج بھی میرے وطن کے چھوٹے چھوٹے گاؤں میں
شام ہوتے ہی بڑے بوڑھے لگاتے ہیں چراغ

کشتیاں رستے سے ہٹ جائیں نہ طوفاں کے سبب
ہم اندھیروں میں لبِ ساحل جلاتے ہیں چراغ

دیوتا بھی آرتی کا خوب لیتے ہیں مزہ
حُسن والے تھالیوں میں جب سجاتے ہیں چراغ

بے تحاشہ جذبۂ اُلفت میں لگ جاتی ہے آگ
وہ حنائی دستِ نازک سے جلاتے ہیں چراغ

تن کے اُجلے، من کے کالے لوگ یہ کرتے ہیں کام
"خود نہیں رکھتے تو اوروں کے بجھاتے ہیں چراغ"

وقتِ رُخصت اشکِ لرزیدہ سے پلکوں پہ فرازؔ
صبح دم تاروں کے جیسے جھلملاتے ہیں چراغ

اک وہ کہ اپنی ضد پہ برابر اَڑے رہے
اک ہم کہ انتظار میں پہروں کھڑے رہے

دریائے عشق کرلیا ہوتا عبور ہم،
لیکن مرے نصیب میں کچے گھڑے رہے

جتنے تھے کم نگاہ وہ جلوؤں میں کھو گئے
اہلِ نظر کی آنکھ پہ پردے پڑے رہے

اک شور جی حضوری کا رہتا تھا آس پاس
جب تک مرے لباس میں ہیرے جڑے رہے

حیرت کہ جن کو ڈھونڈے ہے دریا اِدھر اُدھر
در پر مرے فرازؔ وہ پیاسے کھڑے رہے

نعیم واقف

نعیم خاں واقف ابن حمید خاں، اچل پور (امراؤتی)
موبائل : 9970790527
تاریخ پیدائش : یکم اگست ۱۹۸۰ء

یہ فکر و فن کے فتنے لوگ اب اکثر اُٹھاتے ہیں
اُجالے میں تو سُبحہ رات میں ساغر اُٹھاتے ہیں

نہیں ہے طاقتِ پرواز لیکن حوصلہ تو ہے
نگاہیں آسماں پہ رکھ کے بال و پَر اُٹھاتے ہیں

یہ مانا ہم نے صبر و ضبط کے عادی ہیں ہم لیکن
ستم حد سے گذر جائے تو پھر خنجر اُٹھاتے ہیں

کبھی ٹھوکر نہیں کھاتے وہ اس دنیائے فانی میں
جو اپنا ہر قدم مولا کی مرضی پر اُٹھاتے ہیں

ہُوا ہے قتل مفلس کے دلِ ارماں کا دنیا میں
تمنائیں تھی پھولوں کی مگر پتھر اُٹھاتے ہیں

زمانے کا چلن ہے اس طرح بدلا ہُوا واقف
جھکا کے سر جو چلتے تھے وہی اب سر اُٹھاتے ہیں

ہَوا جب نامناسب ہو تو پتّے ٹوٹ جاتے ہیں
جہاں مطلب پرستی ہو وہ رشتے ٹوٹ جاتے ہیں

گلوں کی پرورش کے واسطے مالی ضروری ہے
نہ ہو ماں باپ کا سایہ تو بچّے ٹوٹ جاتے ہیں

اگر ہو جائے بیٹا ناخلف تو بوڑھی آنکھوں کے
سجے ہوتے ہیں جتنے بھی وہ سپنے ٹوٹ جاتے ہیں

پرندے ہیں اگر خاموش بزدل مت سمجھ صیاد
اگر یہ ضد پہ آجائیں تو پنجرے ٹوٹ جاتے ہیں

دکھادے جو دلوں کو بات ایسی مت کرو واقف
ذرا سی ٹھیس لگنے سے یہ شیشے ٹوٹ جاتے ہیں

ہم سے یہ قتل کے منظر نہیں دیکھے جاتے
شاہراہوں پہ کٹے سر نہیں دیکھے جاتے
جب کفن باندھ کے نکلے ہو شہادت کے لیے
پھر پلٹ کر تو کبھی گھر نہیں دیکھے جاتے
فکر کا کاش دریچہ ہی کوئی کھل جائے
ذہن انسانوں کے بنجر نہیں دیکھے جاتے
ہم نے ہنستے ہوئے پھولوں میں گذاری ہے حیات
ہم سے بربادی کے منظر نہیں دیکھے جاتے
دیکھ لینے سے بھی ہوتی ہے تسلّی دل کو
"آئینے ہاتھ سے چھو کر نہیں دیکھے جاتے"
غم کی راہوں سے بھی ہنستے ہوئے گذرو واقفؔ
راہ میں خار یا پتھر نہیں دیکھے جاتے

حیوانیت کا زہر دلوں میں اُتر گیا
"بستی سے اپنی کون سا موسم گذر گیا"
اونچے مکان والے جو تھے صاف بچ گئے
الزامِ قتل سارا غریبوں کے سر گیا
دیدار ہو رہا تھا مجھے اُن کا خواب میں
آنکھیں کھلیں تو خوشنما منظر بکھر گیا
حیرت زدہ ہے لوگ مرا عزم دیکھ کر
میں پیچ و خم کی راہ پر چل کر سنور گیا
ذاتیں تمام فرقہ پرستی میں بٹ گئیں
واقفؔ تلاش کرتا ہے انسان، کدھر گیا

میر سید مظفر علی ظفر مظاہری

میر سید مظفر علی ظفر ابن سید تسلیم علی میر صاحب، اکوٹ (اکولہ)

حافظ، قاری، عالم، قاضی — تاریخ پیدائش : ۸ر اگست ۱۹۸۰ء

شعبۂ دینیات قباء اردو ہائی اسکول، اکولہ۔ معین قاضی دار القضاۃ، اکولہ

اقبال کا زباں ہے، جو ہے زماں ہمارا
ہندوستاں ہمارا سارا جہاں ہمارا

تکثیریت کا حامل، جمہوریت کا حامل
عظمت نشاں سراسر ہندوستاں ہمارا

زر کی ہوس نہیں کچھ، شہرت میں رَس نہیں کچھ
سر پر رہے سلامت اِک سائباں ہمارا

رکھتے ہیں ہم نے چمن کے، گرچہ ہیں چار تنکے
ہم کو عزیز جاں سے یہ آشیاں ہمارا

محوِ دعا ہے ہر دم، اردو زباں ہماری
یارب رہے سلامت امن و اماں ہمارا

ہر گُل کا رنگ الگ ہے، ہر گُل کی بو جدا ہے
ہر دم رہے مہکتا، یہ گلستاں ہمارا

ذہن و دل و زباں پر سہ رنگی ہے ترانہ
فتح و ظفر کا پرچم قومی نشاں ہمارا

یہ ننھا سا سپاہی انتہائی شوق سے اذنِ شہادت مانگتا ہے
نہیں ابطالِ باطل کے لئے شمشیر بازی کی اجازت مانگتا ہے
اسے ہے دن کو دن کہنا، اسے ہے شب کو شب کہنا، کسی بھی مرحلے پر
کبھی وہ یارِ غارِ مصطفیٰؐ، صدیقِ اکبرؓ سی صداقت مانگتا ہے
اسے تو حق کو حق باطل کو باطل کر دکھانے کی تڑپ بھی ہے لگن بھی
عمر فاروقِ اعظمؓ کے زمانے کی خلافت کی عدالت مانگتا ہے
کلیدِ علم و حکمت سے کلیدِ زہد و طاعت سے حیاداری کی صورت
کبھی عثمان بن عفانؓ سی فہم و فراست کی سیاست مانگتا ہے
کبھی تو جانفشانی کی، کبھی تو جاں نثاری کی سعادت کی طلب میں
کبھی شیرِ خداؓ سی حیدرِ کرارؓ سی رن میں شجاعت مانگتا ہے
ذرا سی جان ہے اس کی مگر ارمان ہے اس کے شہادت کی صفت کے
کبھی حمزہؓ کبھی خالدؓ سی میدانِ وغا میں استقامت مانگتا ہے

تصویر تری اے جانِ جہاں سینے سے لگائے پھرتا ہوں
ہے عکسِ فروزاں خواب سا کچھ پلکوں پہ سجائے پھرتا ہوں
آتی ہے حلالی لقموں سے جن جن پہ غضب کی تابانی
اُن روشن روشن چہروں کے مَیں سائے سائے پھرتا ہوں
تسبیح کے دانے کی صورت مَیں وِرد کے روشن موتی سا
تدبیر کے زرّیں ہاتھوں میں تقدیر پھرائے ، پھرتا ہوں
وسواس مری طینت ہی نہیں، اور یاس مری فطرت ہی نہیں
اُمید کی ہلکی جیوتی کو آنکھوں میں جلائے پھرتا ہوں
ہے منزلِ حق فردوس ظفرؔ ، باطل کا ٹھکانہ نارِ سَقَر
مَیں در در، گھر گھر دعوت کا پرچم یہ اُٹھائے پھرتا ہوں

تکنیک کے دھارے نئے نئے اوہام کی ندیاں نئی نئی
ڈوبیں گے جزیرے ماضی کے ابھریں گی صدیاں نئی نئی
کچھ رنج نہیں آکاش پہ گر اَب ظلم کی بدلی چھائی ہے
چھائیں گے مسرت کے بادل آئیں گی خوشیاں نئی نئی
یہ بھی سچ ہے کہ صحنِ چمن میں آج رواں ہے بادِ سموم
پھوٹیں گے شگوفے نئے نئے مہکیں گی کلیاں نئی نئی
تسلیم ! ہماری راہوں میں باطل نے رُکاوٹ ڈالی ہے
نکلیں گے رستے نئے نئے نکلیں گی گلیاں نئی نئی
اس دورِ ترقی میں ہے ظفرؔ بادہ بھی نیا ساغر بھی نئے
ہیں قیس نئے گلفام نئے ، ہیں نیلم پریاں نئی نئی

الطاف تنویرؔ

شیخ الطاف تنویرؔ ابن شیخ بشیر، مالےگاؤں (باسم) تاریخ پیدائش : ۱۹۸۱ء
میٹریکیولیشن (مراٹھی میڈیم)

بات ایسی سنا گیا کوئی ہنستے ہنستے رُلا گیا کوئی
جیسے دنیا ہی لٹ گئی اپنی دل کے مسکن سے کیا گیا کوئی
آنکھوں آنکھوں میں کچھ خوشی میں حال دل کا سنا گیا کوئی
کیا ہی سستا کھلونا تھا یہ دل کھیلا ، توڑا چلا گیا کوئی
سارے نظارے ہوگئے اوجھل یوں نظر میں سما گیا کوئی
میرے شعروں کی ترجمانی سی اک حکایت سنا گیا کوئی
سب یہاں سے گئے مگر تنویرؔ ہیں کہاں ؟ یہ بتا گیا کوئی؟

گرتے رہتے ہیں پھر سنبھلتے ہیں پھر اُسی راستے پہ چلتے ہیں
جلتے ہیں آگ میں بدن لیکن دل فقط عشق ہی میں جلتے ہیں
ایک مدت سے دل کے مندر میں کچھ امیدوں کے دیپ جلتے ہیں
رزق دینا اسی کی قدرت ہے پتھروں میں بھی کیڑے پلتے ہیں
موم کی طرح دل بھی پتھر کے وقت کی دھوپ میں پگھلتے ہیں
صرف حالات ہی نہیں پیارے ہاں خیالات بھی بدلتے ہیں
کوئی خاموش بھی رہے کتنا دل میں جذبات تو مچلتے ہیں
مگر تنویرؔ جس کا شیوہ ہے ایسی دنیا سے دور چلتے ہیں

بے بسوں پہ یتیموں پہ ہنستی رہی — فقرے بے کس پہ دنیا یہ کستی رہی
کچھ بھی دنیا میں اس کا تو اپنا نہیں — پھر بھی کیوں جان دنیا میں پھنستی رہی
چاہی جو نعمتیں تم وہ کھاتے رہے — بوڑھی ماں دیکھ کر ہی ترستی رہی
میں بلندی کی پرواز کرتا رہا — جو رہی میری منزل سو پستی رہی
شکر ہر حال میں کیوں نہ کرتا بھلا — آزمائش مری تنگدستی رہی
عمر بھر زندگی کو میں روتا رہا — عمر بھر زندگی مجھ پہ ہنستی رہی
ایک سو بڑھی ، ایک جانب خوشی — دل کے جو پاس تھی دل میں بستی رہی
بعد رخصت کے تنویرؔ یہ چشمِ نم — کیوں اُسے دیکھنے کو ترستی رہی

لکیروں میں کہیں اجداد کا پیسہ نہیں ہوتا — غریبوں کا نصیبہ ہاتھ پہ لکھا نہیں ہوتا
یہ اہلِ زر غریبوں کو کبھی جینے نہیں دیتے — اگرچہ اس نے سب کو ایک سا دیکھا نہیں ہوتا
یہ کشکولِ گدائی ہے فقط معذور کو زیبا — کبھی محنت کشوں کے ہاتھ میں کاسہ نہیں ہوتا
وہ چاہے جیسی بھی ہو ماں کی ممتا کم نہیں ہوتی — بھلے ہی آج کل بیٹا ہر اک ماں کا نہیں ہوتا
وراثت بانٹ لیتے ہیں جو بچے اپنے حصے کی — کمائی سب ہے جن کی ان کا ہی حصہ نہیں ہوتا
بھلے تنویرؔ عمدہ کھانا قسمت میں نہ ہو اس کی — کسی مفلس کا بچہ بھی کبھی بھوکا نہیں ہوتا

محمد جاویدؔ اشاعتی

حافظ محمد جاویدؔ اشاعتی ابن محمد صابر، ناگرکھیڑا شمبھو (امراوتی)

تاریخ پیدائش : ۲۸ اگست ۱۹۸۲ء　　موبائیل : 09766782264

میٹریکیولیشن

ہوں ذاتِ فنا مجھ کو فنا کون کرے گا　　قطرے کو سمندر سے جدا کون کرے گا

تو رحمتِ عالم ہے شہنشاہِ مدینہ　　اُمت پہ کرم تیرے سوا کون کرے گا

لینا ہے تو لے لے ابھی جنت کی دعائیں　　گر ماں نہ رہے گی تو دعا کون کرے گا

اس دَور میں ملتا نہیں شیشہ گرِ پُر فن　　پھر شعر پرکھنے کی خطا کون کرے گا

گھر میرا جلانا ہے تو دامن نہ بچانا　　بھڑکے ہوئے شعلوں پہ ہَوا کون کرے گا

تو دردِ محبت کا مجھے دے تو رہا ہے　　یہ بھی تو بتا اس کی دوا کون کرے گا

جاویدؔ مری جان کے دشمن ہیں مرے دوست　　اب تو ہی بتا میرا بھلا کون کرے گا

دنیا کو ہے یقیں مرا وقتِ زوال ہے　　روزِ ازل کے نور ترا کیا خیال ہے

کیا میں اسیرِ ظلم و ستم روز و شب نہیں　　اے ربِّ ذوالجلال ترا کیا خیال ہے

ساحل پہ لا کے جس نے سفینے جلا دیئے　　اُس ناخدا کے پختہ یقیں کا کمال ہے

تجھ سے مرے چراغ کی لَو بجھ نہ پائے گی　　پاگل ہَوا کے زور تری کیا مجال ہے

موسم کی سختیوں سے بچاتی رہی مجھے　　اے ماں ترا خلوص سمجھنا محال ہے

ملتے نہیں ہیں کیوں ترے بھیجے ہوئے خطوط　　ہوتا نہیں یقیں مرے قاصد کی چال ہے

جاویدؔ بزمِ شعر و سخن میں سنایئے　　وہ اک غزل جو آپ کے فن کا کمال ہے

وہ شخص جس کے پیار میں عالم دِوانہ تھا
رخصت ہوا تو یاد سے غافل زمانہ تھا

کیا تھی خبر کہ تو ہے مری آستیں کا سانپ
تجھ سے تو میری جان مرا دوستانہ تھا

بجلی گری تو مجھ پہ گری کیسے ہم نشیں
اک ساتھ ہی تو تیرا مرا آشیانہ تھا

راون بھی جس کو دیکھ کے شرما رہا ہے آج
اتنا برا تو رام کا بھارت ہُوا نہ تھا

گنگا پہ ہے شباب نہ جمنا ہے دل فریب
اس سے تو خوب تر مرا گذرا زمانہ تھا

لگنے لگا تھا حاکمِ اعلیٰ ہی خود غرض
غیروں کے حق میں اُس کا عمل مشفقانہ تھا

جاویدؔ یاد آتی ہیں رشتوں کی چاہتیں
کتنا حسین دور تھا کیسا زمانہ تھا

یوں وہ میری وفا آزماتا رہا
دور ہوتا رہا پاس آتا رہا

میں نے حالات سے ہار مانی نہیں
برق گرتی رہی گھر بناتا رہا

لے رہا تھا مرے صبر کا امتحاں
وہ خدا تھا مجھے آزماتا رہا

میں نہ جانوں کہاں راستہ ختم ہو
مجھ کو چلنا پڑا وہ چلاتا رہا

خواب بکتی رہی زندگی اور میں
آئینہ زندگی کو دِکھاتا رہا

لوگ کہتے ہیں میں ثانیٔ میرؔ ہوں
جو ہنسا بھی تو سب کو رُلاتا رہا

کون تھا جس نے بخشی غزل کو ضیا
لب پہ جاویدؔ کا نام آتا رہا

وسیم فرحتؔ

وسیم فرحتؔ ابن خلیل فرحتؔ، کارنجہ (باسم)
بی۔اے۔بی۔ایڈ (علیگ)
مدیر اعلیٰ ''اردو'' سہ ماہی، امراوتی
موبائیل : 09370222321
تاریخ پیدائش : ۱۳؍ ستمبر ۱۹۸۵ء
لکچرر، واحد ڈی۔ ایڈ کالج، امراوتی
''مکاتیب یگانہ''، ''خلیل فرحت نمبر''، ''ساحر لدھیانوی نمبر'' (اردو سہ ماہی)
''نگارشاتِ یگانہ'' (زیر ترتیب)

بہار اب کے بہت پیرہن دریدہ سہی
خزاں کا جشن مناؤ، فغاں رسیدہ سہی

رہِ حیات میں ٹھہراؤ موت کے مصداق
قدم بڑھاؤ اگرچہ کہ نارسیدہ سہی

نیازِ عشق کی نیرنگیاں ارے توبہ!
''فریب کھاؤ گے پھر بھی، فریب دیدہ سہی''

اگر چراغ نہ جلتے تو دل جلا ڈالو
کبھی تو معجزۂ چشم آب دیدہ سہی

وفا ہی اپنے مقدر کا بام و در ٹھہری
ہزار بار محبت ستم رسیدہ سہی

خوشا نصیب! مخاطب کو خیریت جانو
یہ التفاتِ مسلسل، کبِ رمیدہ سہی

نیا نیا سا ہی لگتا ہے نقشِ جراحی
ہزار بار ترا زخم، چشم دیدہ سہی

بجز ندامت و رسوائی کچھ نہیں فرحتؔ
ترا کلام شب مہ رُخ دمیدہ سہی

طولانیٔ حیات ذرا دیکھتے چلو
ناکام و بے ثبات ذرا دیکھتے چلو

نکلے ہو کس طرف کہ مقابل میں آرزو
غم اور کائنات ذرا دیکھتے چلو

خنجر بکف کھڑا ہے سرِ راہ عیسیٰ دم
نیرنگیٔ حیات ذرا دیکھتے چلو

ہل من مزید کے سے اضافے تمام شب
اندوہ کی برات ذرا دیکھتے چلو

یہ کیا کہ کج روی ہی بنا شیوۂ عوام
بے چین پلِ صراط ذرا دیکھتے چلو

مرحوم دل کے سارے فسانے ہوئے تمام
شک ہو تو میرے ساتھ ذرا دیکھتے چلو

فرحتؔ! رقیب کب کے تسلی بھی پا چکے
ہاں! دوستوں کے گھات ذرا دیکھتے چلو

داد سے شاد نہیں ، شکوۂ بیداد نہیں
اب تو اپنی بھی طبیعت کا پتہ یاد نہیں
کیا کہا ! ان سے رفاقت کی وجہ ٹوٹ گئی
چلو اچھا ہُوا نغمہ نہیں فریاد نہیں
کس قدر حیف ہے اس بزم کی آرائش پر
جو تری چاہ کے صدقے میں بھی برباد نہیں
ایسے ویرانوں میں دستک بھی کہاں دیں کہ جہاں
شہرِ خاموش تمنّاؤں سے آباد نہیں
آخرش ہو تو گیا دل کا مداوا لیکن
وصل میں ہجر کی وہ لذّتِ ناشاد نہیں
یک بہ یک دھند چھٹی ، نیّرِ تاباں نکلا
"اس سے بڑھ کر ہمیں رازِ غمِ دل یاد نہیں"
عصرِ حاضر کا ادب رو بہ تنزّل فرحتؔ
ہر وہ نقّاد ہے ، ابجد بھی جسے یاد نہیں

شعارِ زیست کو کچھ رنگِ جاودانہ کروں — سناؤں تلخ حقیقت ، غزل بہانہ کروں
کبھی تو آ کہ تری زلف کے تصدّق ، میں — شعور و فکر کو تصویرِ عاشقانہ کروں
حیات بر سرِ تعظیمِ دل اگر ٹھہرے — تو کیوں نہ خونِ جگر صرفِ دوستانہ کروں
بہت ہجوم ہے یادوں کا دل کی بستی میں — جو دیکھ پاؤ تو دل کو نگار خانہ کروں
سرِ خمیدہ مہربانیوں سے ہے موسوم — کلاہ اپنی سنبھالوں تو تنگ دانہ کروں
ہنر نواز تہہ قبر جا چکے فرحتؔ — دقیق لفظوں میں اب رسمِ دل ادا نہ کروں؟

انس نبیلؔ

انس نبیلؔ خاں ابن نبیل احمد خاں، کھام گاؤں (بلڈانہ) موبائیل : 8087282020
تاریخ پیدائش : ۸؍ستمبر ۱۹۸۶ء
ایم۔اے۔بی۔ایڈ۔ڈی۔فارم درس وتدریس انجمن جونیئر کالج کھامگاؤں
''جزیرہ'' (شعری مجموعہ زیرِ ترتیب)

رکھتا ہے اپنے ساتھ گناہوں کا بار دل
اُجلے سے میرے سینے میں ہے داغدار دل

تقویٰ سے گر بھرا ہو تو پھر نیکیوں کی سمت
اس طرح دوڑتا ہے کہ ہو شہسوار دل

ہیں آج سب کے سینوں میں پتھر رکھے ہوئے
برسائے آسمان سے پروردگار دل

کب تک تُو اس کی یاد کو رکھے گا اوڑھ کر
پھٹنے لگی ہے اب تو قبا یہ اُتار دل

کیسی منافقانہ روش ہے کہ جسم کو
دیتا ہے پاک خون بھی پُر غبار دل

کانٹوں سے غم کے اس کو چھڑانے کے واسطے
کھینچا جو میں نے اور ہُوا تارتار دل

ہر بات پر ہے میرا یہ دشمن بنا ہُوا
سینے میں چبھتا رہتا ہے مانندِ خار دل

کہتا ہے شعر داغؔ کے لہجہ میں اب نبیلؔ
ہو نہ ہو اس کا بھی ہے بہت بیقرار دل

جب یاد تری آتی ہے تھمتے نہیں آنسو
پھر رات بھی ہوجائے تو سوتے نہیں آنسو

جب خوفِ خدا سے یہ نکل جائیں تو موتی
جُز آپ کے کچھ اور تو ہوتے نہیں آنسو

رُخسار کے رستہ پہ ہی چلتے ہیں یہ سیدھے
انساں کی طرح رہ سے بھٹکتے نہیں آنسو

تعظیم میں پلکوں سے اُتر جاتے ہیں نیچے
غم آئیں تو بیٹھے ہوئے رہتے نہیں آنسو

جب بھی میں بلاتا ہوں چلے آتے ہیں ملنے
تیری طرح رسوائی سے ڈرتے نہیں آنسو

کاجل کے بکھرنے سے بنا اور حسیں وہ
حالانکہ کسی آنکھ میں جچتے نہیں آنسو

نادان نبیلؔ ان سے تو جل جائے گا کاغذ
کاغذ کے کسی صفحے پہ لکھتے نہیں آنسو

کوئی گر اشک بھی پونچھے تو غم ہلکا نہیں ہوتا
گھڑی آگے بڑھا دینے سے دن چھوٹا نہیں ہوتا
پلاتی ہیں کسے اب دودھ مائیں باوضو ہو کر
تبھی تو ہم میں اب ٹیپو کوئی پیدا نہیں ہوتا
گناہوں کی بھیانک برف باری مجھ کو کھا جاتی
خدا کے رحم کا سورج اگر چمکا نہیں ہوتا
کہیں بھی جا کے بس جائیں وطن کی یاد آتی ہے
کسی سوتیلی ماں سے مطمئن بیٹا نہیں ہوتا
تری یادوں کے دریا میں ہر اک شب یہ نہاتی ہیں
بدن غزلوں کا میری ایسے ہی گورا نہیں ہوتا
نبیل اخلاص بس دیہات کے لوگوں کا شیوہ ہے
کسی بھی شہر کی مٹی میں یہ پودا نہیں ہوتا

جیون کے کئی راز بتاتا ہے جزیرہ
شاعر کو نئی راہ سُجھاتا ہے جزیرہ
کیا دور ہے خود موج لگاتی ہے یہ تہمت
دنیا میں بہت شور مچاتا ہے جزیرہ
اللہ کی تخلیق کا انداز تو دیکھو
وہ آب کی کھیتی میں اُگاتا ہے جزیرہ
جیون کا سفر دُکھ کے سمندر میں ہے اکثر
میلوں میں کبھی خوشیوں کا آتا ہے جزیرہ
ہو نرغۂ باطل میں کھڑا جیسے مجاہد
موجوں میں یونہی سر کو اُٹھاتا ہے جزیرہ
ہر شب تری یادوں کے سمندر میں اُتر کر
اِک پارۂ دل خود کو بناتا ہے جزیرہ
بیٹھا ہے حسیں کوئی سمندر کے کنارے
اُٹھ اُٹھ کے جسے دیکھتا جاتا ہے جزیرہ
محبوب سے جب پوچھتا ہوں عشق کا انجام
انگلی کے اشارے سے دکھاتا ہے جزیرہ
اے میرے نبیل آپ کے جیسا ہی سدا سے
تنہائی کا غم روز اٹھاتا ہے جزیرہ

محمد نوید اطہرؔ

محمد نوید اطہرؔ ابن محمد اشفاق کھام گاؤں، بلڈانہ موبائیل : 8605708254
بی۔اے تاریخ پیدائش : ۲ رفروری ۱۹۸۹ء

کسی کی مہربانی ہو رہی ہے غزل کی ترجمانی ہو رہی ہے
جفا تو موردِ الزام ٹھہری وفا بھی پانی پانی ہو رہی ہے
ترا انگڑائیاں لینا بھی جانم قیامت کی نشانی ہو رہی ہے
چمن ویران ہوتا جا رہا ہے یہ کیسی باغبانی ہو رہی ہے
کوئی روتا ہے میری بے بسی پر کسی کو شادمانی ہو رہی ہے
نوید اطہرؔ کسی پہ جاں فدا کر عبث رُسوا جوانی ہو رہی ہے

یہ کس عالم میں اپنے گھر گئے ہم تری محفل سے چشمِ تر گئے ہم
شرافت ہے کہ غصّہ تھوک ڈالا نہ سمجھو یہ کہ تم سے ڈر گئے ہم
ہُوا ہے باعثِ لُطف و کرم کیا؟ کہا اُس نے کہ تم پہ مر گئے ہم
زمیں باطل کے بھی پیروں سے نکلی ہتھیلی پر جو لے کے سر گئے ہم
بہت پچھتائے نادانی پہ اطہرؔ سرابوں پر بھروسہ کر گئے ہم

بدلے انداز تمھارے نہیں اچھے لگتے
غیر کو چھپ کے اشارے نہیں اچھے لگتے

جو بھی کہنا ہے کھلے دل سے سرِ عام کہو
آنکھوں آنکھوں میں اشارے نہیں اچھے لگتے

کچھ عمل کر کے دکھاؤ تو کوئی بات بنے
آئے دن کھوکھلے نعرے نہیں اچھے لگتے

ہم کو طوفاں سے اُلجھنے میں مزہ آتا ہے
اور خاموش کنارے نہیں اچھے لگتے

حالِ مظلوم پہ افسوس کے اظہار کے بعد
اُن کے ظالم کو اشارے نہیں اچھے لگتے

جو اندھیروں میں پلا اور بڑھا ہو اطہرؔ
اُس کو یہ چاند ستارے نہیں اچھے لگتے

عشق اظہار تک نہیں پہنچا
سلسلہ پیار تک نہیں پہنچا

خط کا اپنے جواب کیا آتا
نامہ بر یار تک نہیں پہنچا

سب کو دعویٰ تھا غم گساری کا
کوئی بیمار تک نہیں پہنچا

رعب ان کا جو دل پہ طاری تھا
ہاتھ رُخسار تک نہیں پہنچا

سرفروشی کا عزم اے اطہرؔ
تختۂ دار تک نہیں پہنچا

Ghazalistan-e-Berar
BERAR'S POET & THEIR GHAZAL'S OF LAST 125 YEARS
Compiled by : Zameer Sajid